U4743 Ddk – 5-1204

Title – MAZAMEEN CHAKBAST

Creator – Pandit Brij Narain Chakbast Lucknavi.

Publisher – Indian Press (Allahabad).

Date – 1955

Pages – 344

Subjects – Urdu Mazameen ; Chakbast – Sawanch-o-Tanqeed.

مضامین چکبست

پنڈت برج نراین چکبست لکھنوی کے

مضامین کا مجموعہ

سنہ ۱۹۳۶ء

انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد

تین روپیہ آٹھ آنہ

۸۹

ج ۳
۴۷۴۳
ESSIONED

باہتمام کالی کے متراپرنٹر و پبلشر
انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد

CHECKED-2013
M.A.LIBRARY, A.M.U.
U4743

حالات مصنف

بزرگون کا وطن لکھنؤ ہے۔ پنڈت برج نرائن چکبست سنہ ۱۸۸۲ء مین بمقام فیض آباد پیدا ہوے۔ مگر چند ہی سال بعد لکھنؤ چلے آئے اور وہین تعلیم پائی سنہ ۱۹۰۵ء مین کیننگ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور سنہ ۱۹۰۸ء مین قانون کا امتحان پاس کرکے وکالت شروع کردی۔ اس پیشے مین آپ کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی اور آپ کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکیلون مین تھا۔ ۱۲ فروری سنہ ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمہ مین آپ راے بریلی تشریف لے گئے، عدالت مین بحث کی اور سہ پہر کو لکھنؤ لوٹنے کے لئے اسٹیشن پر آئے، ریل مین بیٹھے تھے کہ دماغ پر فالج گرا اور زبان بند ہوگئی۔ ہمراہیون نے یہ حالت دیکھ کر ریل سے اُتار کر ویٹنگ روم مین لٹا دیا۔ ڈاکٹر آئے، علاج ہوا، مگر سب بے سود۔ سات بجے شام کو اسٹیشن ہی پر انتقال کیا اور آپ کے بڑے بھائی راے صاحب پنڈت مہراج نرائن چکبست ایگزیکٹو افسر لکھنؤ میونسپلٹی گیارہ بجے رات کو آپ کی لاش موٹر مین رکھ کر لکھنؤ لائے۔

جناب کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی نے آپ ہی کے مصرع سے تاریخ نکالی۔

ان ہی کے مصرع سے تاریخ ہے۔ ہمراہ ۱۰۶

موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا ۱۳۴۴ ہجری

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	پنڈت دیا شنکر کول نسیم	۱
۲	پنڈت تربھون ناتھ سپرو۔ ہجر	۱۹
۳	پنڈت رتن ناتھ در۔ سرشار	۳۲
۴	داغ	۶۵
۵	لچھمی رام۔ سرور	۱۰۹
۶	دیباچہ گلزار نسیم	۱۲۳
۷	گلزار نسیم	۱۵۸
۸	ایک یادگار مشاعرہ	۲۱۷
۹	اودھ پنچ	۲۲۶
۱۰	منشی سیّد محمد سجاد حسین	۲۴۱
۱۱	مرزا مچھو بیگ ستم ظریف	۲۴۴

صفحہ	مضمون	نمبر شمار

پنڈت دیا شنکر کول نسیم

(ماخوذ از "کشمیر درپن"۔ فروری ۱۹۰۳ء)

جبکہ دماغی اشغال سے روز بروز نفرت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ وہ دماغی جوہر جو انسان کو دُنیا کے جنجال سے نجات دیکر ایک روحانی خوشی کا سرمایہ بہم پہنچاتے ہین مفقود ہوتے جاتے ہین۔ زندگی کے معنی صرف کھانا پینا، سونا، دلگی مذاق مین وقت گذارنا، بائسکل پر کوچہ گردی کرنا، یا گھر مین بیٹھ کر فلش کھیلنا رہ گئے ہین۔ نقدِ حیات کسی اور قابل نہین سمجھا جاتا ہے سوائے اسکے کہ جسمانی آسائش اور شکم پروری پر لٹا یا جائے۔ تہذیب کے معنی یہ خیال کئے جاتے ہین کہ آدھے سر پر ٹوپی ہو، مانگ نہایت تکلف کے ساتھ نکلی ہو، شیروانی جسم پر چسپان ہو، اچکن کے بٹن کھلے ہون اور قمیض کا فرنٹ قیامت کر رہا ہو۔ چال مین وہ لوچ ہو کہ معلوم ہو ہوائی تہذیب مین جھونکے کھاتے جا رہے ہین۔ اِس حالت مین ایسے مضمون کا چھیڑنا جس کا مذاق دلون سے بالکل اُٹھ گیا ہے مناسب نہین معلوم ہوتا۔ سوائے اسکے کہ بے درد و بے انصاف کہین کہ پُرانے مُردے اُکھیڑنے سے کیا فائدہ۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے تعصب کی عینک آنکھون سے اُتار کر رکھ دی جائے

اور ذرا نظرِ انصاف سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اِن بزرگون کے حالات جنھون نے ہماری قوم کا نام روشن کیا اور جن کے کمالات نے ہندوستان مین اعزازِ کشمیر کی بنا ڈالی خالی از دلچسپی نہین - بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے بزرگون کی زندگی کے حالات پر ایسا اندھیرا چھایا ہوا ہے کہ ان کے کمالات کا کسی خاص علم و فن کے دائرے مین اندازہ کرنا دُشوار ہے - مثلاً سب جانتے ہین کہ پنڈتانِ کشمیر اپنی ذہانت اور جودتِ طبع کے لئے ہندوستان مین ہمیشہ سے مشہور رہین - مسلمانون کے دورانِ حکومت مین جو ذریعے نام پیدا کرنے کے تھے اِن سب سے ہمارے بزرگون نے ایک حد تک فائدہ اُٹھایا - شعر و سخن کا مذاق جو کہ مسلمانون کے عہدِ حکومت مین برابر جاری تھا ہمارے بزرگون مین بھی پایا جاتا تھا - جب تک اُردو زبان اپنی عہدِ طفولیت مین تھی اور فارسی کا رنگ چوکھا تھا اُس وقت ہماری قوم مین فارسی کے ایسے ایسے شاعر پیدا ہوے کہ جن کی ذات پر ہر شخص کو ناز ہو سکتا ہے - ان کا کلام زمانہ کی ناقدردانی سے تلف ہو گیا لیکن جو اشعار اب تک سینہ بسینہ چلے آتے ہین اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن عالی دماغون نے شاعری کے فن مین کیا کمال حاصل کیا تھا اور شعر و سخن کے مذاق کو کیا معراج دی تھی -

پنڈت سومناتھ صاحب مبتی نے ایک قصیدہ عرفی کے ایک مشہور قصیدہ کے وزن پر کہا تھا - اِس کے دو شعر اب تک یادگار ہین - واقعی لاجواب ہین - عرفی کے قصیدہ کا مطلع ہے

صبحدم چون میدمد این صورِ شیون زائے من آسمان صحنِ قیامت گردد از غوغائے من

پنڈت صاحب نے اِس مطلع کی جوڑ پر کیا خوب مطلع کہا ہے -

بسکہ حسرت میچکد از نالۂ آہ و اے من صحن محشر بزم خاموشان شد از غوغائے من

اور دُوسرا شعر تو اس پایہ کا ہے کہ اس کا جواب عرفی کے قصیدہ مین بھی مشکل سے ملے گا۔

ہمّتِ بالا یم از کون و مکان بگذشتہ است بر فضائے لامکان پر می زند عنقائے من

کیا بلند پروازی اور معنی آفرینی کی داد دی ہے۔ اگر صفائے بندش اور پاکیزگی زبان کو دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایران نژاد کی فارسی ہے۔ اِسی طرح پنڈت صاحب نے حافظ کے ایک مشہور شعر پر مصرعے لگائے ہین۔

ساقیا چون بطِ مے چند در آئی بخروش کہ بیا در چمنِ خلد و مئے کوثر نوش

گرچہ او خود ہمہ نوش است ولیکن من دوش کردہ ام توبہ بدستِ صنمِ بادہ فروش

کہ دگر مے نہ خورم بے کف بزم آرائے

جب تک کہ زبان پر قدرت کاملہ نہ حاصل ہو اُس وقت تک ایسے صاف مصرع زبان سے نہین نکل سکتے، پہلے تین مصرعون کی فارسی اور حافظ کی فارسی مین سر مو فرق نہین۔ یہ نہین معلوم ہوتا کہ کمخواب مین ٹاٹ کا جوڑ لگا یا گیا ہے۔ بلکہ حریر مین حریر کا پیوند ہے۔ اسی طرح دیگر متفرق اشعار لوگون کے ورد زبان ہین جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگون نے فارسی مین کیسی لیاقت پیدا کی تھی اور شاعری مین کیا کمال حاصل کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ ان کی زندگی کے حالات کا پتہ چلنا اور ان کے کلام کا ترتیب پانا امر محال ہے۔

ایک مجموعہ "چمنستانِ کشمیر" کے نام سے چھپا ہے۔ لیکن اس چمنستان مین زیادہ تر خزان رسیدہ پھول نظر آتے ہین۔ اعلیٰ درجہ کا کلام اس مین نہین ملتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وشتیتا

نہ ہو سکا۔ لیکن چند ایسے بزرگوار ہین جن کو مرے ہوے ابھی زیادہ زمانہ نہین گذرا اور جن کا کلام قدردانانِ سخن کی خوش قسمتی سے اُن کی زندگی مین چھپ گیا ہے۔ اُن کی زندگی کے حالات شوق وجستجو کے دائرے سے باہر نہین ہیں، مگر یہ لوگ اُس زمانہ کے ہین جبکہ فارسی کا چراغ جھلملا رہا تھا اور اُردو ترقی کے پروبال نکال رہی تھی۔ لہذا ان لوگون کا کلام جو کچھ دستیاب ہوسکتا ہے وہ اُردو مین ہے۔

اس زمرہ مین پنڈت دیا شنکر صاحب نسیم کا نام سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ اُردو شاعری مین انھون نے جو کمال حاصل کیا وہ سب پر روشن ہے۔ ان کا سکّہ اب تک اقلیم سخن مین جاری ہے۔ اِن کی مثنوی "گلزار نسیم" یادگار زمانہ ہے۔ جب تک اُردو شاعری کا مذاق قائم ہے اُس وقت تک "گلزار نسیم" کی شادابی مین فرق نہین آسکتا۔

پنڈت دیا شنکر نسیم سنہ ۱۸۱۱ء مین پیدا ہوے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام پنڈت گنگا پرشاد کول تھا۔ لکھنؤ آپ کا وطن تھا جیسا کہ اُس زمانہ مین دستور تھا اُردو و فارسی کی تعلیم پائی۔ شعرائے اُردو و فارسی کا کلام نظر سے گذرتا رہا خلقی طبیعت داری اور ذہانت نے شاعری کا شوق دلایا۔ غرضکہ بیس برس کی عمر مین شعر و سخن کا خاصہ اچھا مذاق پیدا کر لیا۔ خواجہ حیدر علی آتش کی گرمی سخن و آتش بیانی نے ایسا فریفتہ کیا کہ ان کی شاگردی اختیار کی۔ شروع مین غزل گوئی کا شوق رہا لیکن جو دل کا ولولہ تھا وہ غزل مین نہ نکل سکا۔ جدتِ طبعی نے کہا۔ ؎

بقدر شوق نہین اپنے تنگنائے غزل کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیان کے لیے

مگر وسعت کہان ملے۔ اُردو شاعری کی کائنات کیا۔ غزل، قصیدہ یا رباعی یا مثنوی۔ میر حسن

کی مثنوی سحر البیان کے اُس زمانہ مین چرچے تھے۔ کچھ یہ طرز ایسا پسند آیا کہ خود بھی مثنوی کے کوچہ مین قدم رکھنے کی کوشش کی۔ مناسبت طبع نے آمین کہا۔ غرضکہ "گل بکاؤلی" کا قصہ جو کہ نثر مین تھا اس کو نظم مین ڈھالا۔ اٹھائیس برس کی عمر مین یہ مثنوی تیار ہوئی۔ چونکہ گلہائے مضامین سے پُر تھی لہذا نام "گلزار نسیم" رکھا۔ واقعی اس گلزار کا کیا کہنا تھا۔ ع

"سینچا تھا جس کو خونِ جگر سے وہ باغ تھا"

اِس کے پھولون کی مہک دُور دُور پہنچی لیکن جس وقت یہ مثنوی تیار ہوئی۔ اس وقت اس کا حجم بہت زیادہ تھا۔ جب آتش کے پاس اصلاح کے لئے لے گئے تو اُنھون نے کہا کہ "ارے بھائی اتنی بڑی مثنوی کون پڑھیگا، یا تم پڑھوگے کہ تم نے تصنیف کی ہے، یا مین اصلاح کے خیال سے ایک مرتبہ دیکھ جاؤنگا۔" اُستادِ کامل کی بات دل پر اثر کر گئی۔ مثنوی کی پھر نظرِ ثانی کی، جتنے بھرتی کے شعر تھے نکال ڈالے۔ بلکہ جو مطلب چار شعرون مین ادا ہوتا اُس کو اختصار کے ساتھ ایک ہی شعر مین ادا کیا۔ اِس صورت سے "گلزار نسیم" کو خار و خس سے پاک کیا۔ اور آتش کے پاس لے گئے۔ اُستاد نے شاگرد کی محنت پر آفرین کی اور اصلاح کا قلم اُٹھایا۔ لیکن اکثر اصلاحین نسیم نے نہ مانین اور اشعار کو اپنی اصلی حالت پر رہنے دیا۔ مثلاً مثنوی کا ایک شعر تھا۔

قلیان پہ مشکبو دھوان دھار بیڑے چکنے پان کے مزے دار

آتش نے دوسرا مصرعہ اس طرح بدلنا چاہا۔ ع "بیڑے چکنے بہت مزے دار" لیکن نسیم کو یہ اصلاح نہ پسند آئی اور مصرعہ کی تبدیلی مناسب نہ سمجھی۔

غرضکہ آتش کی نظرِ ثانی کے بعد مثنوی طبع ہوئی۔ شایع ہوتے ہی ہاتھون ہاتھ بک گئی۔

زمانہ نے پوری طور سے قدر کی - ابھی تک مثنوی کے رنگ مین یکتائی کا سہرہ میر حسن کے سر تھا، اب "گلزار نسیم" کے جابجا چرچے ہونے لگے - جواہر سخن کے پرکھنے والے جان گئے کہ مثنوی کیا کہی ہے موتی پروئے ہین نسیم کو بھی شہرت عام کا خلعت نصیب ہوا اور بقائے دوام کے دربار مین میر حسن کے برابر کرسی ملی -

لیکن سخن شناس جانتے ہین کہ نسیم نے گو کہ میر حسن کی جوڑ پر مثنوی کہی، لیکن بالکل دوسرے رنگ مین کہی - کوئی نسیم کو میر حسن کے خرمن کا خوشہ چین نہین کہہ سکتا - اگر وہ اپنے رنگ مین یکتا ہین، تو یہ اپنے طرز مین فرد ہین - اگر کلام کی سادگی اور بے تکلفی کا لُطف اُٹھانا ہے تو میر حسن کی مثنوی دیکھو - اگر باریک بینی اور معنیٰ آفرینی کا رنگ پسند ہے تو "گلزار نسیم" کی سیر کرو - دیکھو! فراق یار مین صدمہ گذرنے کا مضمون ایک ہی ہے - دونون اُستادون کی طبیعت اس پہ برابر لڑی ہے مگر دونون کے انداز سخن پر خیال کرو - ؎

میر حسن

دِوانی سی ہر سمت پھرنے لگی — درختون مین جا جا کے گرنے لگی
ٹھہرنے لگا جان مین اضطراب — لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب
خفا زندگانی سے ہونے لگی — بہانے سے جا جا کے سونے لگی
جہان بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اُسے — محبت مین دن رات گھُٹنا اُسے
کسی نے اگر بات کی - بات کی — یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے — کہا خیر بہتر ہے منگوائیے
جو پانی پلانا تو پینا اُسے — غرض غیر کے ہاتھ جینا اُسے

نسیم

سُنسان وُہ دَم بخود تھی رہتی
کچھ کہتی تو ضبط سے تھی کہتی

رکھتی تھی جو بھوک پیاس بس مین
آنسو پیتی تھی کھا کے قسمین

جامہ سے جو زندگی کے تھی تنگ
کپڑون کے عوض بدلتی تھی رنگ

یک چند جو گذری بے خور و خواب
زائل ہوئی اس کی طاقت و تاب

صورت مین خیال رہ گئی وُہ
ہیئت مین مثال رہ گئی وہ

آنے لگے بیٹھے بیٹھے چکّر
فانوس خیال بن گیا گھر

دُونون نے اپنے اپنے رنگ مین شاعری کا حق ادا کیا ہے۔ میرحسن کے اشعار کا بیساختہ پن اور سادہ پن دل پر عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے۔ شبِ ہجران کی بیقراری کی تصویر آنکھون کے سامنے پھر جاتی ہے۔ نسیم کے اشعار ایک دوسری ہی حالت پیدا کرتے ہین۔ الفاظ کی شوکت، بندش کی چُستی، استعارون کی ترکیب، تشبیہون کی پختگی مصنّف کی طبیعت کے پُرزور ہونے پر دَلالت کرتی ہے۔ نازک خیالی اور بلند پروازی اس عالم کا اشارہ کرتی ہے جہان پہنچتے ہوے ہمارے طائرِ خیال کے پر جلتے ہین اگر صورتِ حال کا بیان میرحسن پر ختم ہے تو کلام کا معنی خیز ہونا نسیم پر۔ میرحسن کہتے ہین۔ ؎

سب اعضا بدن کے موافق درست
ہر اک کام مین اپنے چالاک و چُست

قد و قامت آفت کا ٹکڑا اتمام
قیامت کرے جسکو جھک کر سلام

نسیم اِس مضمون کو اپنے رنگ مین ادا کرتے ہین۔ ؎

دن، دن اُسے ہوگیا قیامت
بوٹا سی بڑھی وُہ سرو قامت

چلتی تو زمین میں سرو گڑتے　　باتیں کرتی تو پھول جھڑتے

میر حسن کے اشعار، ناخن بر جگر ہیں۔ اُن کا اثر بجلی کی طرح دل میں دَوڑ جاتا ہے۔ نسیم کے اشعار الفاظ کی شستگی اور ترکیبِ الفاظ کی چُستی سے تاثیر کا طلسم بنے ہوئے ہیں۔ ایک کی زینت حُسنِ صُورت سے ہے۔ دُوسرے کی شان لُطفِ معنی سے قائم ہے۔ میر حسن سخن آفرین ہیں، نسیم معنی آفرین ہیں۔ میر حسن محاورہ اور روزمرہ کے بادشاہ ہیں، استعارہ و تشبیہہ نسیم کا حصّہ ہے مگر اتنا کہنا ناانصافی نہیں کہ جو سوز و گداز میر حسن کے کلام میں ہے وہ نسیم کے کلام میں نہیں۔ وہی کلام دَرد خیز ہوتا ہے جو دَرد خیز دل سے نکلتا ہے۔ مگر بااین ہمہ جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے نسیم کا کلام اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ان کے طائرِ شہرت نے پر پرواز نکالے تو کسی خرمن کے خوشہ چین نہ خیال کئے گئے بلکہ خود صاحبِ طرز کہلائے۔ "گلزارِ نسیم" کا ایک خاص جوہر جو کہ نسیم کا خاص حصّہ ہے تناسبِ لفظی ہے۔ تناسبِ لفظی کی صنعت ہمیشہ اُردو شاعروں کے پسندِ خاطر رہی ہے لیکن کسی نے اِس کو اس درجہ کمال پر نہیں پہنچایا جیسا کہ ہم گلزارِ نسیم میں دیکھتے ہیں۔ چند اشعار تمثیلاً ہدیۂ ناظرین ہیں۔ ~

پردہ سے نہ دایہ نے نکالا　　پُتلی سا نگاہ رکھ کے پالا
پالا تو مفارقت ہے انجام　　دَانا ہے تو مجھ سے لے کے دام
مجنوں ہو اگر تو فصد لیجئے　　سایہ ہو تو دَوڑ دھوپ کیجئے
سَودا ہے مری بکاؤلی کو　　ہے چاہ بشر کی باؤلی کو

اِس رنگ کے شعر گلزارِ نسیم میں کثرت سے ملینگے۔ واقعی اِس رنگ کو خوب نباہا ہے۔ اور طُرّہ یہ کہ

نہایت خوبصورتی کے ساتھ تناسُب لفظی کی صنعت کا لُطف یہ ہے کہ یہ کہین پر سے نہ معلوم ہو کہ فلان لفظ خواہ مخواہ شعر مین بھر دیا ہے کہ دُوسرے لفظ سے جوڑ کھا جائے۔ اور یہ جوہر گلزار نسیم مین ہے۔ مثلاً کیا خوب مصرعہ ہے۔ ع

"سایہ ہو تو دَوڑ دُھوپ کیجیے"

اِس مصرعہ مین سایہ دھوپ کے ساتھ عجیب کیفیت دکھا رہا ہے لیکن دونون لفظ اِس خوبی سے آئے ہین کہ بالکل ایک دوسرے سے الگ بھی ہین اور ملے ہوے بھی۔ حالانکہ ایک کی رَونق دوسرے کی وجہ سے دوبالا ہے لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ "سایہ" کا لفظ خواہ مخواہ "دھوپ" کے لئے لایا گیا ہے۔ اِس رنگ پر چلنا آسان نہین ہے۔ یہ راہ بڑی کٹھن ہے۔ قدم قدم پہ ٹھوکرین کھانے کا اندیشہ ہے۔ یہ نسیم کو ہی فخر حاصل ہے کہ کہین اپنے تئین لغزش کی ہوا نہ لگنے دی۔ اکثر شعراے اُردو نے اِس رنگ مین کھو کر اپنے کلام کو بے رنگ کر دیا ہے مثلاً امانت کا دیوان بھر اِس بیان کی تصدیق کرتا ہے، اِس شاعر کے لئے تناسب لفظی کا شوق جنون کے درجے تک پہنچ گیا ہے لیکن چونکہ زبان پر قدرت کاملہ حاصل نہین اور طبیعت مین شستگی کا جوہر نہین۔ لہذا جو شعر اِس رنگ مین کہا ہے اُسے پڑھکر ہنسی آتی ہے۔ ایک شعر بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔ ؎

قبر پر میری لگایا نیم کا جس نے درخت　　بعد مرنے کے مری تو قبر آدھی رہ گئی

سبحان اللہ کیا تناسب الفاظ ہے۔ نیم حکیم اور نیم ملا سُنتے تھے یہ نیم شاعر ہین۔ اِس طرح احمد علی شوق ایک لکھنؤ کے شاعر ہین۔ اُنہون نے بھی ایک مثنوی کہی ہے اور "گلزار نسیم" کا

رنگ اُڑایا ہے لیکن جو تناسب لفظی نسیم کے لئے جوہر ہے ان کے لئے عیب ہو گیا ہے۔ ایک شعر اُن کا یاد آگیا اس کا لکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

پاجی ہیں شریفیے سب اُجڑ جائیں بیری ہیں بیر کیڑے پڑ جائیں

خلیل کا بھی ایک شعر اس رنگ میں ہے

وہ شمع رو پتنگ اُڑاتا ہے شاید آج کچھ پیچ پڑ گیا ہے جو آئینے میں ڈھیل کی

ان اشعار کے تمثیلاً پیش کرنے سے مراد یہ ہے کہ تناسب الفاظ کا نباہنا ایک امر دشوار ہے۔ ہر طفلِ مکتب کا کام نہیں نسیم کو اس رنگ میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ الفاظ کے اُلٹ پھیر سے وہ کام لیا ہے کہ کلام کی رونق دوبالا ہوگئی ہے۔ جس پہلو سے الفاظ کو جما دیا ہے ایسے جمے ہیں کہ ایک حرف کا ردّ و بدل نہیں ہو سکتا۔ آتش کا شعر اُن کی شاعری پر صادق آتا ہے۔

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

اختصار جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے اس مثنوی کا عجیب جوہر ہے۔ واقعی دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔ کل مثنوی میں ایک شعر بھرتی کا مشکل سے ملے گا۔ بعض مقامات پر طول طویل مضامین کو اس صفائی سے دو شعروں میں ادا کر دیا ہے کہ کسی قسم کی کوتاہی کا شبہہ تک بھی نہیں گذرتا۔ مثلاً "صحرائے طلسم" کی داستان میں مندرجۂ ذیل دو شعر کتنے پر معنی ہیں کس قدر اختصار سے پُر ہیں

طوطا ہیں کر شجر پہ جا کر پھل کھا کے بشر کا روپ پا کر

پتی، پھل، گوند، چھال، لکڑی اس پیڑ سے لے کے راہ پکڑی

یا ایک مقام پر گفتگو کا اختصار کس خوبی سے نظم کیا ہے۔

پوچھا کہ سبب، کہا کہ قسمت ۔۔۔ پوچھا کہ طلب، کہا قناعت

میر حسن کی مثنوی میں معاملہ برعکس ہے۔ اس میں ہر مضمون کو ضرورت سے زیادہ طول دیا ہے۔ اور یہی اس مثنوی کا ایک بہت بڑا عیب ہے۔

نسیم نے عموماً مضامین کو تشبیہ و استعارہ کے پیرایہ میں ادا کیا ہے لیکن اکثر مقامات پر طبیعت نے تکلف کا پردہ اٹھا دیا ہے اور سادگی سے کام لیا ہے۔ ایسے اشعار کم پائے جاتے ہیں۔ مگر جو ہیں وہ لاجواب ہیں اور ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ مثلاً ؎

انسان و پری کا سامنا کیا ۔۔۔ مٹھی میں ہوا کا تھامنا کیا

غم راہ نہیں کہ ساتھ دیجیے ۔۔۔ دکھ بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجے

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے ۔۔۔ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

سمجھانے سے تھا ہمیں سروکار ۔۔۔ اب مان نہ مان تو ہے مختار

ہوتا ہے وہی خدا جو چاہے ۔۔۔ مختار ہے جس طرح نباہے

علاوہ بریں کلام میں وہ پختگی اور ترکیب میں وہ متانت ہے کہ اکثر اشعار کی بندش ملا فیضی کا دبدبہ یاد دلاتی ہے۔ واقعی کیا سنجیدہ و پرشوکت کلام ہے۔ ؎

پر بحر سخن سدا ہے باقی ۔۔۔ دریا نہیں کار بند ساقی

مرغان ہوا تھے ہوش راہی ۔۔۔ نقش کف پا تھے ریگ ماہی

جاگی مرغ سحر کے غل سے ۔۔۔ اٹھی نکہت سی فرش گل سے

پانچوں سر پنجۂ وفا تھے ۔۔۔ یا مطلع خمسۂ صفا تھے

اے آئینہ دارِ خود نمائی | وے سُرمۂ چشمِ آشنائی
اک شب کہ تھی خالِ روئے شامت | یا مردمِ دیدۂ قیامت

غرضکہ تناسبِ لفظی، اختصار، پختگیٔ کلام، چستیٔ بندش، شوکتِ الفاظ، پاکیزگیٔ زبان، اِس مثنوی کے خاص جوہر ہین۔ استعارون اور تشبیہون سے جو مینا کاری کی ہے، اُس نے اور حُسن دوبالا کر دیا ہے۔

اکثر متعصب مسلمان کہتے ہین کہ آتش نے نسیم کو یہ مثنوی کہہ کر دے دی تھی۔ میری رائے مین اس دعوی بے دلیل پر چین بہ جبین ہونا بیکار ہے۔ بلکہ ایک معنی مین یہ بیان ہمارے لئے باعث فخر ہے۔ اِس سے بڑھ کر نسیم کی شاعری کی تعریف کیا ہوسکتی ہے کہ ان کا کلام آتش ایسے بڑے اُستاد کی طرف منسوب کیا جائے۔ حالانکہ سخن شناس اچھی طرح جانتے ہین کہ جس رنگ مین گلزار نسیم ہے، اِس رنگ مین آتش نے اپنی زندگی بھر مین ایک شعر نہین کہا۔ اِس موقع پر اُردو زبان کے مستند مؤرخ محمد حسین آزاد مصنّف "آبِ حیات" کی رائے پیش کرنا خالی از دلچسپی نہین۔ گو اِس مؤرخ سے ہم کو اتنی شکایت ضرور ہے کہ جہان اپنی کتاب "آبِ حیات" مین اور شعرا پر صفحے کے صفحے لکھے ہین وہان نسیم کی مثنوی پر رائے زنی کرنے مین دس پندرہ سطرون پر اکتفا کیا ہے۔ مگر جو کچھ لکھا ہے وہ انصاف کی نظر سے لکھا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ منصف مزاج مؤرخ کا دامن تعصّب کے داغ سے پاک ہے۔ کیونکہ اُس کی رائے "گلزارِ نسیم" پر منصفانہ ہے۔ مصنّف آبِ حیات "مین یون لکھا ہے" "پنڈت دیا شنکر نے" گلزارِ نسیم" لکھی اور بہت خوب لکھی۔ ...... اِس کی عام و خاص مین شہرت ہے۔ اِس کے نکتے اور باریکیون کو سمجھین یا نہ سمجھین،

مگر سب لیتے ہین اور پڑھتے ہین جتنی سمجھ مین آتی ہے اُسی پر خوش ہوتے ہین اور لوٹے جاتے ہین"۔
واقعی بہت صحیح لکھا ہے۔ جو اِس بیان مین شک کرے وہ کافر ہے۔

علاوہ مثنوی کے نسیم کا ایک غزلون کا چھوٹا سا دیوان ہے لیکن ناتمام۔ بہت سی غزلین جو تلف ہوگئین ان کا نام و نشان بھی اِس دیوان مین نہین ملتا۔ لیکن جو کچھ ذخیرہ اشعار کا باقی رہ گیا ہے وہ اب تک قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ نسیم کا کلام آتش و ناسخ، ذوق و غالب کے کلام کا ہمپایہ نہین۔ یہ لوگ آسمان سخن کے تارے ہین، ان کے برابر کسی کو عروج نہین ہوا۔ مگر اِس مین شک نہین کہ نسیم، رند، صبا، خواجہ وزیر کے ہم پلہ ضرور تھے۔ اکثر مقامات پر طبیعت کی بلند پروازی اور معنی آفرینی قیامت کرتی ہے۔ مثلاً ؎

بجز گورِ غریبان نقش پا تھے پھر نہین آگے — نہین تک ہر مسافر نے پتہ پایا ہے منزل کا
نسیم اپنے ہی اعمالون سے گردش ہے زمانے کی — روان کشتی پہ آتا ہے نظر ہر نخل ساحل کا

ای مرغِ دل تو شاخِ نشیمن سے گر پڑا — حیف آشیان بلند ہے پرواز پست ہے
تھے محو زلف دیدۂ تر دل بھی آ پھنسا — مچھلی کو کیا خبر تھی کہ پانی مین شست ہے

گر یہی ہے اِس گلستان کی ہوا — شاخ گل اِک روز جھونکا کھائیگی
جان نکل جائے گی جب تن سے نسیم — گُل کو بوئے گل ہوا بتلائیگی

جب ہو چکی شراب تو مین مست مر گیا — شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا

طریق شعر و سخن مین اگر نہین اعجاز — قلم کی طرح سے ہر اک شکستہ پا چلتا

اس موقع پر یہ لکھنا غیر مناسب نہین کہ گو یہ آتش کے شاگرد تھے لیکن آتش کی گرمی سخن ان کے کلام مین نہین پائی جاتی۔ ان کی مشکل پسند طبیعت نے ناسخ کا رنگ پسند کیا۔ مگر باوجود اس تصنّع کے جو کہ اس رنگ کا خاص جوہر ہے نسیم کا کلام بالکل بے نمک نہین ہے طبیعت مین ایک خداداد کیفیّت ہے جو کلام کو مزے دار بنا دیتی ہے۔

سُنا جاتا ہے کہ وہ بڑے ظریف و بذلہ سنج آدمی تھے تیزی ذہن و ذکاوت طبع کا عجیب عالم تھا، حاضر جوابی تیغ زبان کی جوہر تھی۔ انہین صفات خاص نے ان کا وقار معاصر شعرا مین قائم کیا۔ اگر یہ جوہر نہ ہوتے تو کون پوچھتا۔ اس زمانہ مین لکھنؤ کل ہندوستان کی تہذیب و تربیت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ گو کہ اُردو شاعری کے زوال کا زمانہ قریب آچکا تھا لیکن جیسے بجھنے کے پیشتر چراغ کی روشنی تیز ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس زمانہ نے شعر و سخن کا ایسا عروج دیکھا کہ باید و شاید۔ آتش و ناسخ کی جادو کار طبیعتین اپنا زور دکھا رہی تھین۔ انیس و دبیر مرثیہ گوئی کے فن کو عرش پر پہنچا رہے تھے۔ خواجہ وزیر و صبا کی نوجوان و شوخ طبیعتین اک طرفہ قیامت برپا کر رہی تھین۔ اس زمانہ مین ایک ہندو شاعر کے لئے شعرا کے زمرہ مین اپنا وقار قائم کرنا آسان کام نہ تھا لیکن نسیم نے اپنے گلہائے مضامین کی خوشبو سے سب کو مست کر دیا۔ ایسے ایسے معرکے جیتے کہ دھاک بیٹھ گئی خصوصًا ان کی حاضر جوابی و موزونی طبع کے سب قائل تھے۔ ایک

مرتبہ کا ذکر ہے لیکن مشاعرہ کی صحبت تھی نسیم بھی وہان موجود تھے۔ شیخ ناسخ نے ان کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ پنڈت صاحب ایک مصرع کہا ہے دوسرا مصرعہ نہین سوجھتا کہ پورا شعر ہو جائے۔ انھون نے جواب دیا فرمائیے۔ ناسخ نے مصرعہ پڑھا۔ ع

"شیخ نے مسجد بنا مسمار بت خانہ کیا"

اُن کے مُنہ سے مصرعہ نکلنے کی دیر تھی کہ یہان دوسرا مصرعہ تیار تھا۔ ع

"تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا"

اِس مصرعہ کا سُننا تھا کہ حاضرین جلسہ پھڑک اُٹھے اور ہر طرف سے نعرہائے تحسین بلند ہوے۔ شیخ ناسخ نے شاعری کی آڑ مین مذہبی چوٹ کی تھی لیکن نسیم نے خوب ٹھنڈا کر دیا۔ اسی طرح ایک شخص نے مشاعرہ مین ایک شعر پڑھا جس کا دوسرا مصرعہ یہ تھا۔ ع

جانبِ ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہین

پہلا مصرعہ کچھ مہمل سا تھا۔ نسیم کے مُنہ سے بیساختہ نکل گیا کہ دوسرا مصرعہ تو خوب ہے لیکن پہلا مصرعہ ٹھیک نہین۔ وہ صاحب بھی کچھ جلے تن تھے جھنجھلا کے بولے کہ اچھا آپ اس سے اچھا مصرعہ لگا دیجئے۔ یہان تو مضامین ہر وقت ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ اسی وقت مصرعہ موزون کر کے سُنا دیا۔ کہ

تیرۂ دل کی بزم مین جامِ شراب آتا نہین (جانبِ ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہین)

اِن کی مشاعرہ مین دھاک بیٹھ گئی وہ بیچارہ ذلیل ہو گیا۔

ایک روز آتش کے یہان شاگردون کا جمگھٹا تھا۔ رند، صبا، خلیل وغیرہ بیٹھے ہوے تھے

نسیم بھی موجود تھے صبح کا سہانا وقت، برسات کا موسم، مینہہ برستا ہوا، عجیب کیفیت تھی موسم بہار سے کچھ ایسی طبیعتیں مست ہوئین کہ شاگردون نے آتش سے فرمائش کی کہ استاد اِس وقت ایک غزل کہہ ڈالئے۔ گو کہ آتش کا بڑھاپا تھا لیکن طبیعت مین جوانی کا زور بھرا ہوا تھا۔ فی البدیہہ اشعار موزون کرنے شروع کر دیے اور کہا کہ لکھتے جاؤ جس غزل کا مطلع ہے۔ ؎

دہن پر ہین اُن کے گمان کیسے کیسے — کلام آتے ہین درمیان کیسے کیسے

وہ اسی موقع کی کہی ہوئی ہے۔ نسیم کی طبیعت بھی جوش بہار سے لہرائی ہوئی تھی۔ اُنھون نے اِن اشعار کی تخمیس شروع کر دی۔ جتنی دیر مین آتش دوسرا شعر سوچتے تھے یہ اِس عرصہ مین ان کے پہلے شعر پر مصرعے لگا چکتے۔ اور بعض بعض مصرعے تو واقعی اِس انداز سے نکالے ہین کہ اگر کوئی برسون فکر مین سرگریبان رہے تو ان سے اچھے مصرعے نہین لگا سکتا۔ آتش کے دو اشعار کی تخمیس تمثیلاً لکھی جاتی ہے تین مصرعے شروع کے نسیم کے ہین اور دو مصرعے آخر کے آتش کے

نہ خونی کفن ہین نہ گھائل ہوئے ہین — نہ زخمی بدن ہین نہ بسمل ہوئے ہین
لہو مل کے کُشتون مین داخل ہوئے ہین — تمھارے شہیدون مین شامل ہوئے ہین
گل و لالہ و ارغوان کیسے کیسے

وجودِ بشر کیا عدم ہی عدم ہے — کرے ہے آدمی جب ملک کا دم مین قدم ہے
شکم پرورِ حرص ناز و نعم ہے — کرے جس قدر شکرِ نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زبان کیسے کیسے

اسی طرح چودہ پندرہ اشعار پر مصرعے لگائے۔ جب آتش نے غزل ختم کی تو تعجبانہ رند و خلیل کے چہرون کے

رنگ فوق تھے ۔ ابھی تک یہ لوگ اپنے تئیں اہلِ زبان خیال کرتے تھے اور نسیم کو ہندو سمجھ کر زیادہ وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے ۔لیکن اُس روز سبْ لوہا مان گئے کہ موزونیٔ طبع ہو تو ایسی ہو، اور مضمون آفرینی کا مادہ ہو تو ایسا ہو۔

نسیم کی جو وقعت شعرائے لکھنؤ کے زمرہ مین تھی اِس کا اندازہ مندرجۂ ذیل واقعے سے ہوسکتا ہے ۔ایک مرتبہ دہلی سے تین مصرعے امتحاناً لکھنؤ بھیجے گئے ۔کہ شاعرانِ لکھنؤ ان پر مصرعے لگا کر بھیجین ۔تینون مصرعے حسبِ ذیل ہین ۔

(۱) ناتوان ہون کفن بھی ہو ہلکا

(۲) اِس لئے قبر مین رکھا نہین زنجیر سمیت

(۳) من می روم بہ کعبہ و دل می رود بہ دَیر

اَبْ اہلِ لکھنؤ کی یہ کوشش ہوئی کہ ایسے مصرعے لگا کر بھیجے جائین کہ دہلی والون کو بھی یہان کی شاعری کا قائل ہونا پڑے ۔اگر مصرعے سُست لگے تو کر کری ہو جائے گی ۔غرضکہ تین شخصون کو جو کہ ہر طرح سے اِس کام کے لئے موزون خیال کئے گئے ایک ایک مصرعے پر مصرعہ لگانے کا کام سپرد ہوا ۔پہلا مصرعہ ناسخ کو دیا گیا ۔ دوسرا آتش کو اور تیسرا نسیم کو ۔گو کہ اس وقت اور بڑے بڑے شاعر بھی موجود تھے ۔مگر آتش و ناسخ کے ساتھ لکھنؤ کی آبرو قائم رکھنے کا شرف نسیم ہی کو حاصل ہوا ۔تینون اُستادون نے جی توڑ کر مصرعے لگائے ہین ۔ناسخ کا مصرعہ ہے

ڈال دے سایہ اپنے آنچل کا

(ناتوان ہون کفن بھی ہو ہلکا)

آتش نے کہا

حشر میں حشر نہ برپا کریں یہ دیوانے
(اِس لئے قبر میں رکھا اُنہیں زنجیر سمیت)

نسیم کا مصرعہ بھی لاجواب ہے۔

دارم ز دین و کفر بہ ہر یک قدم دو سیر
من می رَوم بہ کعبہ و دل می رَود بہ دَیر

یہ معرکے اَب تک لکھنؤ میں یادگار ہیں۔

مگر افسوس کہ اس حبیب قوم کے ساتھ عمر نے وفا نہ کی۔ "گلزارِ نسیم" کو شایع ہوئے چند ہی سال گذرے تھے کہ باغِ جوانی پر اوس پڑ گئی۔ ہیضہ کی بیماری نے دفعتاً خاتمہ کر دیا۔ اپنے شعر کے آپ ہی مصداق ہوئے۔

روحِ رواں نسیم کی صورت میں کیا کہوں
جھونکا ہوا کا تھا اِدھر آیا اُدھر گیا

سنہ ۱۸۴۳ء میں تینتیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ کسی شاعر نے رباعی کہی۔

مغموم رکھا مُدام دلگیری نے
مارا ہے جوان فلک کی بے پیری نے
واللہ کہ آتش فروغ ناسخ
ٹھنڈی کر دی نسیم کشمیری نے

پنڈت تربھون ناتھ سپرو ہجر

(ماخوذ از "کشمیر درپن"، ستمبر ۱۹۰۳ء)

ذوق مرحوم کی تربت کو خدا عنبرین کرے کیا دردناک دل پایا تھا۔ فرماتے ہین ؎

کھل کے گل کچھ تو بہارِ جان فزا دکھلا گئے

حسرت اُن غنچون پہ ہے جو بِن کھلے مُرجھا گئے

یہ شعر اُن بیکسون کا مرثیہ ہے جن کا چراغ ہستی سرِ شام ہی گُل ہوگیا اور جو دُنیا سے ناشاد ونامراد گئے۔ چنانچہ یہ جوان مرگ جس کا نام زیب عنوان ہے انہین حرمان نصیبون مین ہے جن کی زندگی کی بہار جان فزا پر قبل از وقت اوس پڑ گئی اور جن کے غنچۂ آرزو بِن کھلے مُرجھا گئے لیکن اس روا روی کے عالم مین طبیعت کی رنگینی اور بیان کی شوخی نے اپنا سکّہ قدردانون کے دل پر جما دیا اور وہ کیفیتین دکھائین، جن کی یاد اب تک پس ماندہ احباب کے دل مین دردِ محبّت پیدا کرتی ہے۔ یہ مانا کہ حضرتِ ہجر کو زمانے نے شہرتِ عام کا تمغہ نہین عطا کیا اور مثل صفیقی و ضمیر و نسیم و سرشار کے سخندانانِ کشمیر کی بزم نورانی کے بالانشینون مین ان کا شمار نہین ہوسکتا۔ مگر تاہم اس بزم کے جس گوشے مین یہ بیٹھے ہین اُس گوشے کی ان کی ذات سے رونق ہے۔ لہذا مُناسب

دُم ہوتا ہے کہ ان کا مرقع حیات بھی ہدیۂ ناظرین کیا جائے

حضرتِ ہجر کے والد ماجد کا نام پنڈت شمبھو ناتھ صاحب سپرو تخلص بہ صابر تھا حضرتِ ہجر ۱۸۵۳ء میں تحصیل چنیا میں پیدا ہوئے تھے۔ مگر زیادہ تر سکونت سے فیض آباد فیضیاب رہا۔ علومِ مشرقی کی تعلیم زمانے کے دستور کے مطابق مکتب میں حاصل کی۔ انگریزی میں کیننگ کالج لکھنؤ میں ایف اے تک سلسلۂ تعلیم جاری رہا لیکن امتحان کی ناکامیابی نے دل توڑ دیا۔ اِس سلسلہ کو ترک کرنا مناسب سمجھا۔ بعدازاں فکرِ معاش میں اودھ کے مختلف ضلعوں میں گھومتے رہے۔ آخر کار گونڈہ میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کیا تھا، مگر گردشِ تقدیر نے چین نہ لینے دیا۔ دو سال گذرے تھے کہ درد زانو کی شکایت پیدا ہوئی۔ مرض نے نہایت طول کھینچا مجبور ہو کر فیض آباد علاج کے لئے واپس آنا پڑا۔ یہاں موت کا فرشتہ تاک لگائے بیٹھا تھا۔ غرضکہ چھ مہینے بیمار رہ کر مارچ ۱۹۰۲ء میں حضرتِ ہجر نے احباب کو داغ مفارقت دیا تخمیناً ۴۹ سال کی عمر پائی۔

حضرتِ ہجر کے جوہر کمال کا اندازہ کامل طور پر اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے ہو جبکہ اردو زبان میں انقلاب عظیم درپیش تھا اور اس کی انشا پردازی کا رنگ بدل رہا تھا۔ حضرتِ ہجر ان چند جدت پسند بزرگواروں میں ہیں جن سے کہ اس انقلاب کی بنیاد پڑی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ انگریزی تہذیب و تربیت کا رنگ اردو زبان کے پیراہن پر چڑھ رہا تھا یعنی لوگ جب علی سرور کے تکلفات و تصنع کو خیرباد کہہ کر نثر اردو کو سادگی کے زیور سے آراستہ کر رہے تھے۔ اِس اختراع و ایجاد کا ذریعہ اودھ پنچ تھا۔ اودھ پنچ کی اردو

مین ایک خاص سادگی، بے تکلفی، نازکی اور دلبستگی کا رنگ تھا جو کہ قدما کے طرز عبارت کے برعکس تھا۔ اِس موقع پر اِس امر کا اعلان ضروری ہے کہ گو کہ اودھ پنچ ظرافت کا پرچہ تھا مگر اس کے مضامین محض ظرافت کے لحاظ سے زیادہ قابل قدر نہین ہوتے تھے۔ یون تو ظرافت کے معنی آج کل بہت وسیع ہین سلامتی سے ہر محلّے مین دس بارہ ظریف مل جائینگے۔ ہر طفل مکتب جس کو پیر تجارا کی زبان مین کچھ مداخلت حاصل ہے اپنے تئین نعمت خانِ عالی سمجھتا ہے۔ لیکن اگر ظرافت کا اعلیٰ معیار پیش نظر رکھ کر اودھ پنچ کے مضامین کا اندازہ کرین تو ہم کو مایوس ہونا پڑتا ہے۔ اِس مین شک نہین کہ اس کے مضامین مین طبیعت داری اور بذلہ سنجی کے اعلیٰ نمونے موجود تھے۔ مگر وہ بات کہان جو غالب دہلوی کی روزمرّہ کی باتون مین تھی کہ جو فقرہ زبان سے یا قلم سے نکل گیا وہ آج تک سینہ بسینہ چلا آتا ہے اور جتنے مرتبہ دُہرائیے اُتنا ہی زیادہ لُطف دیتا ہے۔ مگر اس بات سے کسی کو انکار نہین ہو سکتا کہ اُردو زبان اودھ پنچ کے احسان سے کبھی سبکدوش نہین ہو سکتی (اودھ پنچ کے مضمون نگارون نے اُردو نثر کے پیرون سے تصنّع کی بیڑیاں کاٹین اور پُرانی قیدون سے آزاد کیا۔ اِس زمرہ مین ہجر و سرشار و ستم ظریف و احمد علی شوق اور خود لائق ایڈیٹر منشی محمد سجاد حسین صاحب کا پایہ عالی تر ہے۔ اِن حضرات مین سوائے سرشار کے کسی سے ایسی تصنیف یادگار نہین جس سے کہ مصنّف کا نام صفحۂ ہستی پر اُردو زبان کے وجود تک قائم رہے لیکن اگر کبھی اس انقلاب کی تاریخ لکھی گئی جو کہ اودھ پنچ نے اُردو انشا پردازی مین پیدا کر دیا تو یہ لوگ آیندہ نسلون کے شکریہ کے مستحق ضرور مانے جائین گے۔ غرضکہ یہ ثابت ہوا کہ حضرت ہجر اُن چند حضرات مین ہین جنہون نے کہ اُردو زبان کو اپنے احسان سے گرانبار کیا ہے۔ منشی

محمد سجاد حسین صاحب فرماتے تھے کہ اودھ پنچ کے پہلے خریدار حضرت ہجر تھے۔ اور سال بھر تک قریب قریب ہر پرچے میں آپ کے ایک دو مضامین شایع ہوا کئے۔ مگر افسوس کہ وہ جلسہ برہم گیا نہ ہجر ہین نہ سرشار۔ نہ ستم ظریف۔ وہ کیفیت ہی نہین۔ ؎

اے مصحفی مین دون کیا اگلی صحبتون کو ‏ ‏ ‏ بن بن کے کھیل ایسے لاکھون بگڑ گئے ہین

خود منشی سجّاد حسین صاحب کو مکروہات زمانہ نے ایسا ستا رکھا ہے کہ مدّت سے آپ کے صریر قلم کا نغمہ نہین سنائی دیا۔ افسوس۔ ؎

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی ‏ ‏ ‏ اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

اودھ پنچ کا بھی اب وہ رنگ نہین بس اب اپنے گذشتہ عظمت کے مزار پر چراغ روشن کئے ہوے ہے۔

اس تشریح کے بعد ہم حضرت ہجر کی طبّاعی اور جدّت پسندی کا اندازہ کر سکتے ہین۔ اس موقع پر آپ کے مضامین کے اکثر حصے بر سبیل اقتباس لکھے جاتے ہین جن سے کہ آپ کی تحریر کا رنگ ظاہر ہوتا ہے۔ پرتاب گڈھ سے بحیثیت نامہ نگار اودھ پنچ لکھتے ہین۔ "ساون کا مہینہ کیا شروع ہوا کہ پرتاب گڈھ کرۂ زمہریر بن گیا۔ ہفتہ گزشتہ بھر آفتاب کی صورت دیکھنے کو ترس گئے" وہ جھما جھم پانی برسا کہ دمبدم یہی خوف معلوم ہوتا تھا کہ خطۂ یونان کی طرح تمام تختہ کا تختہ دریا برد نہ ہو جائے۔ تمام شب وظیفہ پڑھتے گذری۔ ہر لحظہ و ساعت یہی خیال رہتا تھا کہ کہین کھپریل کی چھت رکوع مین نہ آ جائے

.... ہان آپ نے کچھ اور بھی سنا فرخ سیر کے وقت مین۔ ع

باران بارید ریزہ قند و نبات

واللہ اچھا چاشنی دار ابر تھا۔ مگر افسوس لکھنؤ مین ایسی بارش نہ ہوئی کہ ہر ایک چھینٹے کے بعد

ذرا مُنہ میٹھا ہوتا۔ (اودھ پنچ مطبوعہ ۲ر فروری ۱۸۸۱ء)

ہولی پر ایک مسخرے کا مضمون لکھا ہے جو کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اِس سے بھی اقتباس حسبِ ذیل ہے۔

"واللہ ہولی کی فصل کیا آئی گویا اندھیری رات مین سُرخ مہتاب چھوٹی۔ ایک عالم بیربہوٹی کی طرح سُرخا سُرخ ہو گیا۔ ٹیسو پھولنے سے جنگل مین منگل ہو رہا ہے۔ قطعہ کا قطعہ لال بھبوکا معلوم ہوتا ہے۔ باغ بغیچون (باغیچون) مین گل عباس، گل اورنگ، گل آفتابی، گل شفتالو، گلنا گلِ سُرخ، کھلے ہوئے الگ الگ اپنا جوبن دکھلاتے ہین۔ اور ؎

چھوٹ سے لالۂ احمر کے ہی یہ رنگ بہا   لال ہے مثل شفق رنگِ سپہر گردون

آج کل زمانہ نے کچھ ایسا رنگ بدلا ہے کہ سبزی، کاہی، وغیرہ جتنے رنگ تھے سب اُڑ گئے۔ اب جدھر آنکھ اُٹھا کر دیکھیے گلنار، گلابی، عنابی، بنفشئی، کے سوا دوسرا رنگ نظر نہین آتا۔۔۔۔۔۔ شوقینون نے جانور بھی پالے تو لال ہی پالے ــــــ اِس فصل مین لڑکا بھی پیدا ہوتا ہے تو لال خان یا ہوری لال کے نام سے پکارا جاتا ہے"۔

اِن انتخابات سے حضرتِ ہجر کی طرز تحریر کا انداز کھلتا ہے۔ خیالات کی شوخی اور عبارت کی روانی اور چلبلا پن لکھنے والے کی طبیعت داری کے شاہد ہین۔ یہ وہی رنگ ہے جس کو حضرتِ سرشار نے فسانۂ آزاد مین معراج دی۔ اِس زمانہ مین جبکہ سلیس اور سادہ اُردو لکھنے کا عام رواج ہے۔ ایسا طرز تحریر زیادہ حیرت نہین پیدا کرتا۔ لیکن اگر یہ خیال ملحوظ خاطر رہے کہ یہ مضامین پچیس برس اُدھر کے لکھے ہوئے ہین جبکہ اس طرز تحریر کی بنیاد پڑی، تو ہم کو حضرتِ ہجر کی جدّتِ طبع کا قائل ہونا

پڑتا ہے۔ اودھ پنچ کے علاوہ آپ سنجیدہ مضامین مختلف رسالون اور اخبارون مین لکھا کرتے تھے۔ یہ امتیاز زیادہ تر مراسلۂ کشمیر اور مرۃ الہند، وکیل ہند وغیرہ کو حاصل ہوتا تھا۔ "ماہیت خواب" "نفس امارہ" "ترقی تہذیب" "مسئلہ ویدانت" وغیرہ پر اکثر معرکے کے مضامین لکھے جن کو عبارت کی سلاست اور پاکیزگی اور خیالات کی بلندی کی وجہ سے پسند عام اور قبول خاص کا شرف نصیب ہوا۔ حضرت ہجر کے زباندان ہونے مین شک نہین، اکثر انگریزی خیالات کا عکس اردو مین اس صفائی سے اتارا ہے کہ بارک اللہ۔ کہین پر عجز کا شبہ بھی نہین ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بے تکلف قلم چلا جاتا ہے۔ تمثیلاً ایک لطیفہ لکھا جاتا ہے جو کہ انگریزی لطیفے کا ترجمہ ہے۔

"حضرت شریڈین ایک مہاجن کے مقروض تھے پیسہ کا پتہ نہ تھا۔ ایسے وقت مین تقاضے کو مہاجن صاحب تشریف لائے۔ شریڈن نے چھوٹتے ہی ایسا فقرہ چست کیا کہ مہاجن تمام آٹے دال کا بھاؤ بھول گئے۔ شریڈین نے کہا بھئی فی الحال اگر اصل مانگتے ہو تو بے سود ہے اور اگر سود چاہتے ہو تو اصل نہین۔ یہ سُن کر مہاجن گھبرایا۔ اور پوچھنے لگا کیون جناب میرا روپیہ ملے گا یا نہین۔ شریڈین نے ہنس کر جواب دیا۔ واللہ تم بھی بالکل آدمی ہو۔ گھبرائے جاتے ہو۔ خاطر جمع رکھو، قرض پر تو ہمارا تمام کارخانہ چلتا ہے۔ انشاء اللہ تم ہی سے روپیہ لیکر ادا کیا جائیگا۔"

(اودھ پنچ مطبوعہ مارچ ۱۸۸۶ء)

اس سے کسی شخص کو انکار نہین ہو سکتا کہ ایک زبان سے دوسری زبان مین کسی لطیفے کا ترجمہ کرنا اور اصل مذاق قائم رکھنا کار آسان نہین۔ کیونکہ مذاق کا پہلو بہت کچھ زبان کا پہلو لئے ہوتا ہے۔ مگر حضرت ہجر کے زور قلم کے سامنے اس مشکل کا آسان کرنا دشوار نہ تھا۔ چنانچہ

اصل اور سود کے لفظ سے اس لطیفے کی رونق دوبالا ہوگئی ہے۔ اِس قسم کی پاکیزگی اور سلاست کی قدر زیادہ معلوم ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہین کہ بعض حضرات معمولی باتون کا ترجمہ کرنے مین بانسے کیا کیا گاؤزوریان کرتے ہین۔ مین نے ایک سالہ مین دیکھا کہ مصنف نے Loose Morals کا ترجمہ ڈھیلا اخلاق کیا ہے۔ جن لوگون کے کانون مین سلاست زبان کا نغمہ سمایا ہوا ہے وہ ایسا ترجمہ نہ کرسکینگے۔ مگر ہر کس و ناکس کے کان اس نغمہ سے آشنا نہین۔ یہ جوہر خداداد ہے۔

شاعری کے لئے بھی حضرتِ ہجر کی طبیعت خاص طور سے مَوزون تھی۔ قدر بلگرامی (نور اللہ مرقدہٗ) کے شاگرد تھے۔ اردو سے تو اُن کو خاص اُنس تھا۔ اِس کے علاوہ منشی محمد سجاد حسین صاحب فرماتے تھے کہ فارسی کا کلام ان کا خوب ہوتا تھا۔ اکثر احباب کے جمگھٹے دریا کنارے ہوتے تھے۔ وہان حضرتِ ہجر برجستہ اشعار تصنیف کیا کرتے تھے۔ غزل کم کہتے تھے، مُسدّس کا رنگ زیادہ پسند خاطر تھا۔ اِس قسم کی نظمون مین "لسانُ الغیب کشمیر" "کچّا چٹھا" "نوحہ کشمیر" "فغانِ کشمیر" نے زیادہ شہرت پائی۔ مگر افسوس ہے کہ اُنہون نے اپنے کلام کی قدر نہ کی۔ خدا جانے یہ کیا قدرت کا راز ہے۔ اکثر صاحبِ جوہر اپنے جوہر کی قدر نہین کرتے۔ انیسؔ مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

کس طرح قدر تجھے اپنے سخن کی ہو انیسؔ　　　　مرتبہ مشک کا آہوے ختن کیا جانے

چنانچہ حضرتِ ہجر نے کبھی کسی مضمون یا نظم کا مسودہ اپنے پاس نہین رکھا۔ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ نظم کا کلام ازبر رہتا تھا۔ شاید یہی وجہ اس بے توجہی کی ہو لیکن ان کے مرنے کے بعد بابو گنگا پرشاد صاحب ورما ایڈیٹر اخبار "ایڈوکیٹ" و "ہندوستانی" نے کچھ ان کا کلام جمع کرکے ترتیب دیا تھا اور یہ ارادہ تھا کہ ایک مجموعہ کی صورت پر شایع کیا جائے مگر شومیٔ تقدیر سے وہ بھی تلف ہوگیا

ایک مسدس ان کا موسوم بہ "کچا چٹھا" اکثر بزرگانِ قوم کے پاس موجود ہے۔ یہ وہ لاجواب نظم ہے جو کہ انہوں نے قومی جھگڑے کے موقع پر تصنیف کی تھی۔ اس کے پڑھنے سے ان کی زباندانی اور جوش طبیعت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس نظم میں رنگین بیانی کو دخل ہے نہ زیادہ تر تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا ہے۔ لیکن شکوہ الفاظ اور ترکیب کی چستی کا یہ عالم ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ دریا اُمڈا چلا آتا ہے۔ سیدھی سیدھی باتیں ہیں مگر گرمی تاثیر سے مالا مال۔ ایک ایک حرف اپنے دامن میں ایک شعلہ چھپائے ہوئے ہے۔ واقعی کس جوش و خروش کا مطلع ہے۔ ؎

عداوت کے شعلے کو بھڑکانے والے جہالت کی زنجیر کھڑکانے والے
دلوں کو ضعیفوں کے دھڑکانے والے نیا روز اک جوڑ بھڑکانے والے
یہ کیا نت نئی شعبدہ بازیاں ہیں
یہ کیا قوم میں رخنہ اندازیاں ہیں

یا ایک مقام پر بگڑ کر کہتے ہیں۔ ؎

اگر لکھنؤ میں تمہیں باخدا تھے بڑے نیک طینت بڑے پارسا تھے
اگر قوم میں تم ہی دھرم آتما تھے بڑے پاک باطن بڑے پارسا تھے
تو بہتر تھا گھر بار سب تیاگ دیتے
چلے جاتے کاشی میں سنیاس لیتے

یا قوم کی حالتِ زار کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔ ؎

ہر اک قوم میں صید رنج و محن ہے نہ وہ صحبتیں ہیں نہ وہ انجمن ہے

نہ ہے جوش قومی نہ حُبِ وطن ہے　　بدی پر پھر امسال چرخِ کہن ہے

محبّت ہے باقی نہ الفت ہے باقی

پڑی قوم مین پھر ہے نا اتفاقی

اِن متفرق بندون کے پڑھنے سے وہ سَمان آنکھون کے سامنے نہین بندھ سکتا جس کے لئے کل مسدّس کا پڑھنا شرط ہے - قومی جھگڑے کے متعلق بہت نظمین اہل قوم نے شایع کین لیکن صرف دو نظمین ایسی تصنیف ہوُمین جن کا خیال قدردانانِ سخن اپنے دل سے خوشی سے نہ مٹائین گے ایک "تحفہ سرشار" یعنی پنڈت رتن ناتھ در کی مثنوی - اور دوسرا یہ مسدس جو کہ حضرتِ ہجر کے روز فکر کا نتیجہ ہے - سنا گیا ہے یہ مسدّس جس کا ایک مصرع بھی بیکار نہین اور جس مین ستاون بند مین - ایک شب مین لکھ ڈالا تھا اور وہ بھی تپ کی حالت مین - مولانا حالی کا مسدس بھی اسی رنگ مین ہے - مگر چونکہ مولانا ممدوح کے دل مین شاعری کی آگ نہین روشن ہے لہٰذا ان کے مسدّس مین اس جوش وخروش کا اظہار نہین جو کہ کچے چھٹے کا خاص جوہر ہے -

فیض آباد مین ایک انگریز نے سرجو کی تعریف مین ایک نظم کہی تھی اس کا ترجمہ حضرتِ ہجر نے اُردو مین کیا تھا - وہ نظم تو کُل کلام کے ساتھ تلف ہوگئی صرف ایک شعر یاد ہے جو کہ لاجواب ہے

اک ناز سے بہ رہا ہے سرجو　　کیا لطف ہے شام کو لبِ جو

دو غزلین فارسی کی اودھ پنچ مین نظر سے گذرین چند شعر ان مین سے اقتباس کر کے لکھے جاتے ہین -

کیمیا ئیست کہ من می دانم　　ناصحا نسخہ تالیف قلوب

اتفا ئیست کہ من می دانم　　بہر نظارہ بہ معبد رفتن

ہر کہ در ہند فرنگی زاد است | باد شائیست کہ من می دانم
حیف صد حیف سیہ فامی ہند | لا دوائیست کہ من می دانم
از پے رزق بہم سودن کف | آسیائیست کہ من می دانم
ہجر خاکِ کفِ پائے محبوب | توتیائیست کہ من می دانم

دوسری غزل جس کی سرخی "بیکسی کا چکارہ" ہے حسب ذیل ہے واقعی کیا درد آمیز لہجہ ہے۔

در کنج غم افتادم و دمسازکسے نیست | دردا کہ بہ فریادم و فریادرسے نیست
بربیکسیم بین کہ زلیسنس وتکس آہ | می نالم و جز نالہ کسے ہم نفسے نیست
اقلیم تجارت ز غشم آمد بہ تکلم | چانکاہ تراز من بجہان آہ کسے نیست
آتش زنِ کالائے شکیب است گرانی | می گریم واز گریہ ام آگاہ کسے نیست
در معرضِ بحث آمدہ آزادیِ اخبار | صد حیف چو منکاف کسے ازادسے نیست

یہ غزل اُس وقت کی ہے جب کہ ٹیکس وغیرہ بندھنے کا زمانہ تھا اور غلہ کی گرانی سے اہلِ ہند نالاں تھے

اِس سلسلہ مین اس امر کا ذکر لازم ہے کہ حضرت ہجر کے والد ماجد پنڈت شمبھر ناتھ صاحب ہجر و بھی اُردو فارسی کے ماہر تھے۔ قلم مین بھی زور تھا۔ چنانچہ مختلف کتابین ان سے یادگار ہین۔ جن مین کہ سراب حیات" اور "توزکِ جرمنی" کا مرتبہ بلند ہے۔ میرے دوستو! اگلے وقت کے بزرگون کا علمی شوق قابلِ قدر ہے۔ پنڈت شمبھر ناتھ علاوہ دفتر کے چھ گھنٹے کام کرنے کے چار پانچ گھنٹے روز کتب بینی مین صرف کرتے تھے۔ حضرت ہجر نے اپنے قابل باپ کے دامن تربیت مین پرورش پائی تھی۔ مگر دونون کی طبیعت کا رنگ بالکل جُداگانہ تھا۔ پنڈت شمبھر ناتھ کے طرز عبارت مین

پُرانی چاشنی کا مزہ قائم ہے ۔ وہی مسجّع عبارت، وہی محمد شاہی ترکیبین، وہی تصنّع اور تکلّفات کا رنگ ان کے تصانیف کے ہر صفحے پر مُرجھائے ہوے چمن کی گذشتہ بہار کی یاد دلاتا ہے ۔ گو کہ اُنھون نے یہ زمانہ بھی دیکھا تھا ۔ مگر ان کے دل کو طرزِ قدیم سے محبّت تھی ۔ برخلاف اِس کے حضرتِ ہجر کے انداز تحریر مین ایک قدرتی کیفیّت ہے جس پر ہزار مصنوعی تکلّفات قربان ہین ۔ سنجیدہ مضامین مین بھی طبیعت کی شوخی اپنی جھلک دکھاتی ہے ۔ بس معلوم ہوتا ہے کہ ابر کے پردے مین بجلی چمک رہی ہے ۔

حضرتِ ہجر کے جاننے والے سب ان کی طبیعت داری کا لوہا مانتے تھے ۔ اوائل عمر ہی سے طبیعت اپنا رنگ دکھلانے لگی تھی ۔ طالب علمی کے زمانہ مین مختلف اخبارون اور رسالون مین مضامین لکھا کرتے تھے ۔ عجب خداداد ذہن پایا تھا ۔ ہر رنگ مین اپنا رنگ جما لیتے تھے کشمیری، پنجابی، ہندی، بنگالی زبانون مین اِس لہجہ سے گفتگو کرتے تھے کہ اہلِ زبان مین اور ان مین فرق نہین معلوم ہوتا تھا ۔ انگریزی مین اعلیٰ درجہ کی تعلیم نہین پائی تھی لیکن چونکہ کتب بینی کا شوق ہمیشہ قائم رہا ۔ لہٰذا اِس زبان مین بھی اچھی دستگاہ پیدا کر لی تھی ۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کا یہ عالم تھا کہ جس صحبت مین بیٹھتے تھے اُس کی زینت ہوجاتے تھے ۔ زبان مین جادو تھا ۔ بیٹھے بیٹھے ایک فقرہ ایسا کہہ دیا کہ سُننے والے ہنستے ہنستے لوٹ گئے ۔ مگر ان کی پیشانی پر شکن بھی نہ پڑی ۔ گویا کچھ جانتے ہی نہین ۔ اِن کے دلآویز لطائف و ظرائف ان کے احباب کے اب تک ورد زبان ہین ۔

ایک مرتبہ لاہور جانے کا اتفاق ہوا ۔ وہان ایک بزرگ قوم سے ملاقات ہوئی جو کہ شاعری کا شوق رکھتے تھے ۔ مگر فارسی مین کہتے تھے ۔ اور اکثر غلبۂ ذکاوت سے خبط اور مہمل بھی بک جاتے تھے ۔ چنانچہ حضرتِ ہجر کو بھی اُنھون نے اپنا کلام سُنایا اور دیر تک سمع خراشی کرتے رہے ۔ دوسرے

روز جب ملاقات ہوئی تو اُنھون نے حضرت ہجر سے فرمائش کی کہ آپ اپنا کلام یا کسی اُستاد کا کلام سُنائیے۔ اُنھون نے پیشتر سے ایک غزل فارسی مین تیار کر رکھی تھی جس کی نشست الفاظ نہایت چُست اور بندش نہایت پختہ تھی اور مختلف اشارے اور کنائے ایسے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ بڑے دقیق اور فلسفیانہ مضامین نظم ہین لیکن اصل مین ہر ایک شعر مہمل اور بے معنی تھا۔ حضرت ہجر نے اُن کو یہ غزل سُنائی اور کہا کہ قاآنی کی تصنیفات سے ہے' بس پھر کیا تھا وہ صاحب ان شعرا پر مفتون تھے اور شاعر کی نازک خیالی اور بلند پروازی کی داد دیتے تھے۔ یہان تک کہ آٹھ روز مین نہایت مشقت سے اس غزل کی شرح تیار کی جو کہ آخر مین اودھ پنچ کی نذر کی گئی تھی۔

اِس قسم کے لطیفے اکثر اُن سے یادگار ہین۔ حضرت ہجر کا ادب و انکسار بھی قابل تعریف ہے جس سے کہ وہ ہمیشہ ہر دلعزیز رہے۔ کبھی تنگ ظرفی کو سینہ مین جگہ نہ دی اور ایسی بات نہ کی جو کہ دشمن کو بھی ناگوار ہو۔ باوجود اِس فضیلت و اعزاز کے چشم مروت نشۂ غرور سے نہ جھکی۔ منشی محمد سجاد حسین صاحب فرماتے تھے کہ سوائے تعریف کے کبھی اُن کے مُنہ سے کسی کی بُرائی نہ سنی اگر کسی نے کبھی اُن کی شان مین بے ادبی بھی کی تو چشم پوشی کر گئے۔ بقول انیس۔ ؎

ضبط دیکھو سب کی سُن لی پر نہ کچھ اپنی کہی اِس بلندی پہ گویا یہ زبان پیدا ہے

ایک مرتبہ "طوطی ہند" کے اڈیٹر نے ان کے ایک مضمون کا مضحکہ اُڑایا اور ظرافت کے جوش مین تہذیب شرافت پر خاک ڈالنے سے بھی نہ درگذر کیا۔ حضرت ہجر نے اِس کے جواب مین ایک مختصر سا مراسلہ اودھ پنچ مین شایع کیا۔ جس کا مضمون حسب ذیل ہے۔

" حضرت اڈیٹر طوطی ہند! آپ نے جو کچھ میری نسبت تحریر فرمایا ہے وہ مضمون نگاری

کی شان کے خلاف ہے اگر آپ ظرافت کے پیرایہ مین میرے مضمون کا جواب دیتے تو بہتر ہوتا، آپ نے جو ذاتی حملے مجھ پر کئے ہین ان کا جواب ترکی بہ ترکی دینا پسند نہین کرتا، ہان اتنا ضرور کہون گا کہ مین کس قابل ہون - جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ سب آپ کی تعریف ہے"۔

غرضنکہ عجب شریف و باوضع آدمی تھا - زندہ دلی کا وہ عالم کہ کبھی غم و غصّہ کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دیا - گو کہ زمانے نے بیوفائی کی مگر اُن کا ہمیشہ یہی اصول رہا کہ ع

"دل پر ہجوم غم ہو جبین پر شکن نہ ہو"

یہ زندہ دلی مرتے دم تک اُن کی رفیق رہی -

مگر حیف کہ فلکِ پیر حضرتِ ہجر کی جوانی نہ دیکھ سکا - کیا افسوس کا مقام ہے - ؎

کچھ عمر بھی نہ پائی تھی ایسے سن نہ تھے
کہتا تھا خود شباب کہ مرنے کے دن نہ تھے

پنڈت رتن ناتھ در سرشار

(ماخوذ از "کشمیر درپن" بابت مئی ۱۹۰۵ء)

اینست "رتن ناتھ در" در ہمہ دانی نمر — آنکہ فسانہ گران بلیغ یاد اوست
شعر وے اندر ذہن صد چمن اندر چمن — نطق زبان سخن شیرین ادا اوست
مصرع پیچیدہ اش عقدۂ بالیدہ اش — معنی پیچیدہ اش طرۂ شمشاد اوست
خامہ بجا مہ نہاد زہرۂ عطارد براد — فکر تصور نژاد خسرو نوشاد اوست
بست بہ فکر رسا معنی نایاب را — بستن بال ہما عشوۂ صیاد اوست
مریم او طبع بکر عیسی او تازہ فکر — روح قدس زانکہ کرد ہمت پاساد اوست
مصرع تاریخ باز قدر ز شیرین او ساز — سرو چمن را ز ناز قصۂ آزاد اوست

(قدر بلگرامی)

اہل کشمیر میں دو صاحب ایسے گذرے ہیں جن کی شہرت کا دامن قیامت کے دامن کے ساتھ وابستہ رہیگا۔ ایک پنڈت دیا شنکر نسیم جن کے فیض سے چمنستان نظم کو شادابی حاصل ہی دوسرے حضرت سرشار جنھوں نے حدیقۂ نثر اردو میں نئی روشنیں نکالیں اور جن کی جادو بیانی کا

شہرہ آج ہندوستان بھر میں ہے مگر واہ ری بے ہمتی کہ ایسے باکمال کی زندگی کے حالات کا پتہ چلنا ہمارے لئے دشوار ہے ۔ اور پھر ایسی حالت میں جب کہ اُس کو دنیا سے اُٹھے ہوئے کچھ عرصہ نہیں گذرا دریافت کئے پر سال ولادت نہ معلوم ہو سکا ۔ اندازاً یہ معلوم ہوتا ہے ۔ کہ جب کہ حضرت سرشار لکھنؤ میں پیدا ہوئے تو محمد علی شاہ کا آخری عہد تھا ۔ چار برس کی عمر تھی کہ آپ کے والد پنڈت بیجناتھ صاحب دَرْ قضا کر گئے ۔ اِس صورت میں حضرتِ سرشار دامانِ مادری کے سایہ میں پرورش پاتے رہے ۔ کہتے ہیں کہ بچپن ہی سے شوخی کوٹ کوٹ کر بھری تھی ۔ ایامِ طفولیت میں طبّاعی اور ذہانت زبان کی طرّاری کے پردے میں اپنا رنگ دکھاتی تھی ۔ جس مکان میں رہتے تھے اُس کے پڑوس میں اہلِ اسلام کی مخدرات رہتی تھیں ۔ حضرتِ سرشار نے لڑکپن میں اُردو زبان انہیں شریف خاتونوں سے سیکھی اور انہیں کے فیضانِ صحبت سے اِن کو بیگمات کے طرزِ معاشرت سے بہت کچھ آگاہی کم سنی ہی کے زمانے میں ہو گئی تھی ۔ معمولی آدمی پر یہ تربیت کچھ اثر نہ پیدا کرتی حضرتِ سرشار میں چونکہ ذہانت اور جوّدت کا خلقی مادہ موجود تھا لہٰذا ان کے حق میں ایسی پاکیزہ صحبت کیمیا ہو گئی ۔ جب فسانۂ آزاد لکھا تو لڑکپن کی تحقیقات کا یہ ذخیرہ دماغ میں موجود تھا ۔ عربی اور فارسی کی تعلیم بھی دستورِ قدیمہ کے مطابق پائی ۔ جب زمانہ نے سلطنتِ اودھ کا ورق اُلٹا، اور انگریزی حکومت کی بنیاد پڑی تو انگریزی تعلیم کے لئے "کیننگ کالج" قائم ہوا ۔ پنڈت رتن ناتھ بھی اُس میں داخل ہوئے ۔ مگر کوئی ڈگری نہ حاصل کر سکے ۔

جب سنِ تمیز کو پہنچے تو کھیری ضلع اسکول میں مدرسی کا سلسلہ نکالا ۔ اور حصولِ معاش کا ڈھنگ ڈالا ۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں نئے خیالات کا دریا طغیانی پر تھا ۔ نظامِ معاشرت کے

ہر صیغے مین صلاح کے مسائل درپیش تھے۔ اُردو زبان پر بھی اختراع و ایجاد کا جادو چل رہا تھا۔ ایسے رسالے اور اخبار جاری ہو رہے تھے جن مین پُرانے ایشیائی تکلفات کو خیرباد کہکر واقعات نفس الامری پر بحث ہوتی تھی۔ اِس سلسلہ مین ہماری قوم مین بھی ایک ماہوار رسالہ "مراسلۂ کشمیر" کے نام سے شایع ہوتا تھا، جس مین اصلاح اور رفاہ کے متعلق مضامین لکھے جاتے تھے۔ اسی زمانہ مین اودھ پنچ بھی اپنا رنگ جما رہا تھا۔ حضرت سرشار کے دل مین انشا پردازی کا خداداد مذاق موجود تھا۔ لہذا "مراسلۂ کشمیر" "اودھ پنچ" وغیرہ مین لکھنا شروع کیا۔ گو کہ اُس وقت حضرت سرشار کے کمال کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا اور اُس کی شعاعین دور تک نہ پھیلی تھین۔ مگر اُس وقت کے مضامین پڑھنے سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ طبیعت مین ایک خاص شوخی اور بے تکلفی ہے اور طرزِ تحریر مین عجب تازگی ہے جو دلون کو مزہ دے جاتی ہے۔ ہان اتنا کہنا لازمی ہے کہ حضرت سرشار کی ان مضامین کی نثر فسانۂ عجائب کی نثر کا پہلو مارتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اُس زمانے مین رجب علی سرور مصنف "فسانۂ عجائب" کا سکہ لکھنؤ مین بیٹھا ہوا تھا۔ وہ نثر اُردو کے پیمبر سمجھے جاتے تھے۔ ہر مضمون نگار کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اُن کی تقلید کرے۔ اِس صورت مین اگر سرشار کی ابتدائی نثر مین سرور کی کیفیت پائی جائے تو جائے تعجب نہین۔ فارسی کا اُس زمانے مین ایسا رواج تھا کہ پہلے وہ مضامین جو حضرت سرشار نے "مراسلۂ کشمیر" مین اشاعت کے لیے بھیجے وہ فارسی زبان مین تھے۔ اِسی زمانے مین سررشتۂ تعلیم کی جانب سے ایک اخبار نکلتا تھا۔ اُس مین اکثر علمی اور اخلاقی مضامین کے ترجمے شایع ہوا کرتے تھے۔ اس کام مین بھی حضرت سرشار نے اپنی قابلیت کا ثبوت دیا۔ چنانچہ سررشتۂ تعلیم کے مہتمم اعلی نے اپنی سالانہ رُویداد تعلیم مین اس امر کا اعلان کیا کہ بیاستہ اور بامحاورہ

ترجمہ پنڈت رتن ناتھ کا ہوتا ہے، ایسا کسی دوسرے شخص کا صوبہ میں نہیں ہوتا غرضکہ حضرت سرشار کا مضمون نگاری کا شوق دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔ اودھ پنچ، مراسلۂ کشمیر، مرآۃ الہند، ریاض الاخبار، وغیرہ آپ کے زور قلم سے فیضیاب ہوتے رہنے۔

۱۸۷۰ء میں ایک علم طبیعی کی کتاب کا اردو میں انگریزی سے ترجمہ کیا۔ اس میں آبرو ہوا و برف وغیرہ کی ماہیت کا حال درج ہے چونکہ اس کے ہر صفحے میں تحقیقات علمی کا نور سمایا ہوا تھا لہٰذا نام "شمس الضحیٰ" رکھا۔ ایسے ادق مضامین کا بیان جن کا نقشہ اُتارنے کے لئے اُردو میں پورے الفاظ بھی موجود نہیں نہایت عام فہم اور سلیس عبارت میں لکھا ہے۔

اُسی سال تقدیر نے حضرتِ سرشار کی زندگی کے کارنامے میں ایسا ورق اُلٹا جس سے کہ آپ کا کمال اہل مُلک واہل قوم پر آئینہ ہوگیا اور خود اس صاحبِ کمال کو قبول عام کی سرکار سے نکتہ سنجی اور زباندانی کی سند ملی، یعنی یہ وہ مُبارک سال تھا جبکہ مُنشی نولکشور نے حضرتِ سرشار کو "اُودھ اخبار" کی اڈیٹری کا قلمدان سپرد کیا۔ اس زمانے میں "اودھ اخبار" کو جو عروج حاصل ہوا اس کا زمانہ شاہد ہے۔ حضرتِ سرشار نے وقائع نگاری میں بھی اپنا رنگ جمالیا۔ پولٹیکل اور سوشل مضامین میں بھی وہ نکتے اور باریکیاں پیدا کیں کہ دلوں کو تسخیر کرلیا لیکن ابھی حضرتِ سرشار کی شہرت کے تاج میں سب سے اعلیٰ نگینہ نہیں جڑا گیا تھا یعنی فسانۂ آزاد کی ابھی تک بنیاد نہیں پڑی تھی۔

جس صورت میں ہم آج فسانہ آزاد کو دیکھتے ہیں۔ اِس طرح پر یہ شروع میں شایع نہیں ہوا تھا۔ مصنّف نے اس کے آغاز کے وقت اس کی ابتدا وانتہا کا خیال نہ کیا تھا۔ اصل کیفیت فسانۂ مذکور کی بنیاد پڑنے کی یوں ہے۔ کہ جب حضرتِ سرشار کھیری سے لکھنؤ آئے تو یہاں شب و روز

یارانِ دقیقہ رس وصبح نفس کی صحبت مین گذرتی تھی۔ اس صحبت مین جہان ایک سے ایک حاضر جواب و طرارہ موجود ہوتا تھا۔ وہان منشی سجاد حسین صاحب ایڈیٹر اودھ پنچ، و پنڈت تربھون ناتھ ہجر مرحوم بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ جہان ایسے ایسے زندہ دل موجود ہون وہان کی کیفیت کا کیا کہنا۔

ع۔ غم غلط ہو گیا جب بیٹھ گئے یارون مین

افسوس کہ زمانے نے اس مجموعۂ صحبت کو پریشان کر دیا۔ اب منشی محمد سجاد حسین صاحب کا دم غنیمت ہے اُردو انشا پردازی کا نام لکھنؤ مین انہین کی ذات سے زندہ ہے۔ ؎

یادگارِ زمانہ ہین یہ لوگ　　　　یاد رکھنا فسانہ ہین یہ لوگ

سنہ ۵
اِس صحبت مین ایک روز پنڈت تربھون ناتھ ہجر نے کہا کہ اگر کوئی ناول ایسا ہے کہ جس کا ایک صفحہ پڑھئے اور ممکن نہین کہ بیس مرتبہ نہ ہنسیے تو وہ ''ڈان کوئک زاٹ'' ہے۔ اگر اردو مین اس طرز کا فسانہ لکھا جائے تو خوب ہے۔ حضرتِ سرشار کے دل پر اُس وقت کی بات ایسی کارگر ہوئی کہ اُردو مین ''ڈان کوئک زاٹ'' کے انداز پر مضامین لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ ''اودھ اخبار'' مین ظرافت کے عنوان سے مختلف مضامین شایع ہونے لگے۔ یہ مضامین عموماً لکھنؤ کے رسم و رواج کے متعلق ہوا کرتے تھے۔ مثلاً کبھی محرم پر ایک مضمون نکل گیا کبھی جہلم پر کبھی عیش باغ کے میلے پر۔ اُس وقت تک لوگون کا یہ خیال تھا کہ دس بیس مضامین نکل کر یہ سلسلہ ٹوٹ جائے گا۔ اور حضرتِ سرشار کا بھی شاید یہی منشا رہو۔ مگر لوگون کو یہ سلسلہ مضامین ایسا بھایا کہ اس کے قائم رکھنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ مختلف مضامین کی لڑیون کو گوندھ کر فسانہ کا سلسلہ نکالا۔ ایسے مضامین مین جن کا تعلق ایک دوسرے سے بہت ہی کم تھا، سلسلہ پیدا کرنا آسان کام نہ تھا اور اصل تو یہ ہے کہ

کامل سلسلہ پیدا نہ ہو سکا۔ اگر سلسلہ ہے تو اتنا ہے کہ اس فسانے کے رستم داستان میان آزاد خانہ برباد ہر فن مین طاق اور ہر کمال مین مشاق ہین۔ جتنے علوم عقلی و نقلی ہین ان مین ان کو مداخلت ہے۔ سپہ گری کے فن مین بھی برق ہین۔ شاعر بھی ہین حُسن مین اگر یوسف ثانی کہیئے تو بجا ہو۔ صبح ہوئی اور یہ بوے گُل کی طرح گھر سے نکلے، اور دُنیا بھر کی سیر پر کمر باندھ لی۔ کبھی لکھنؤ کا محرّم دیکھنے چلے آئے، کبھی عیش باغ کے میلے پہنچے، کبھی کسی نوّاب کی دربارداری کی۔ غرضکہ یہ جہانیان جہان گشت آدمی ہین۔ ان کے لیے کسی خاص ارادے یا شغلے کی ضرورت نہین ہے ؎

ہر صبح میزند چو شفق جوش خونِ ما　　موقوف بر بہار نہ باشد جنونِ ما

اس کوچہ گردی مین ایک وزان کی نگاہ ایک ناظورۂ ملائک فریب سے لڑ گئی۔ اِدھر سے پیغام وصال ہوا۔ بعد ہزار ناز و نیاز اس پری پیکر نے جو کہ اعلیٰ درجے کی تعلیم یافتہ اور مہذّب خاتون تھی اِس شرط پر ان سے شادی کرنا منظور کی کہ یہ روم جائین اور سلطان کی فوج مین شریک ہو کر روس کے خلاف لڑین۔ حضرتِ آزاد بھی اپنی دُھن کے پکّے تھے، سیدھے روم پہونچے اور وہان سے سُرخ رُو ہو کر اپنی محبوبہ کے پاس آئے اور خوشی خوشی بیاہ رچایا۔ اصل قصّہ "فسانۂ آزاد" اسی قدر ہے۔ مگر مصنّف کے زورِ قلم کا یہ عالم ہے کہ پچیس سو صفحے اِس مختصر مطلب کے ادا کرنے مین صرف کئے۔ اور داستان کی دلچسپی مین فرق نہ آیا۔ علاوہ "ڈان کوئک زاٹ" کے مختلف انگریزی افسانون کے حالات اِس مین درج ہین۔ لیکن مصنّف کے قلم مین وہ جادو ہے کہ ہر بیان کو اپنا کر لیا ہے۔ جاننے والے جانتے ہین کہ فلان داستان "فسانۂ آزاد" کی فلان انگریزی ناول سے اخذ کی گئی ہے۔ مگر ثابت نہین کر سکتے۔ حضرتِ سرشار کی یہ کیفیت تھی۔ کہ چار آدمیون مین بیٹھے ہین۔ باتین

کرتے جاتے ہین اور وہی باتین فسانے مین لکھتے جاتے ہین۔ مگر اِس انداز سے کہ عبارت کی شوخی اور مضامین کی تازگی مین سرِ مو فرق نہین آتا۔ واللہ کیا زبان پائی تھی۔ جو اِس زبان سے نکل گیا عالم کو بھایا اور تاثیر کا طلسم بن گیا۔ جس زمانے مین فسانہ "اودھ اخبار" مین نکل رہا تھا حضرت سرشار کا ہندوستان بھر مین طوطی بول رہا تھا۔ ملک کے مختلف حصّون سے آپ کے پاس خطوط آتے تھے۔ جن مین آپ کی اعلیٰ دماغی قابلیت اور زباندانی کی داد دہی منظور ہوتی تھی۔ یہ خطوط معمولی لوگون کے نہ ہوتے تھے بلکہ ایسے حضرات کے جن کی قابلیت و لیاقت ضرور قابلِ تحسین ہے۔ تمثیلاً ایک خط مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کا ذیل مین درج کیا جاتا ہے۔

جناب پنڈت جی صاحب زاد فضائلکم۔

حضرت تسلیم۔ آپ نے فسانہ آزاد کیا لکھا ہے زبان اُردو کے حق مین مسیحائی کی ہے۔ باوجودیکہ وہ بیچاری آج کل کے زباندانون سے ایسی ڈرتی ہے جیسے میان خوجی کی قرولی سے زبت خیر خدا خدا کر کے ہماری بیچاری پُرانی عمدہ زبان کے ایک آپ تو معین نکلے۔ للہ الحمد .... او تو ہم سے کیا ہو سکتا ہے صرف .... قطعہ تاریخ آپ کے پاس بھیجتے ہین خود ملاحظہ فرما کر قسطنطنیہ مین میان آزاد کے ملاحظہ مین ضرور بھیج دیجیے گا تاکہ وہ خود تو دیکھین نہین صاحب آپ کاہے کو تکلیف فرمائیے۔ جب چھپیگا وہ خود ہی دیکھ لینگے۔

راقم اثیم واحقر محمد عبدالحلیم شرر لکھنوی

قطعہ تاریخ

تم نے نئی نکالی فسانہ کی راہ واہ | کن کن محاورون کا کیا ہے نباہ واہ

دکھین جو شوخیان ترے خامہ کی غور سے — بولے شفیق واہ، عدو بولے آہ آہ

کرتا شررہے مصرع تاریخ پیشکش

کیا بول چال لکھی رتن ناتھ، واہ واہ

مگر فلکِ پیر کی تفرقہ پردازی دیکھیے کہ اِس اثنا رمین اودھ پنچ جوکہ شروع مین حضرت سرشار کے زورِ قلم سے فیضیاب ہوتا رہا تھا آپ کے خلاف ہو گیا۔ فسانہ آزاد پر جا و بیجا اعتراضات کی بھرمار شروع ہو گئی۔ پھر تو اس ظرافت کے نہنگ بحر آشام نے بھی کروٹ لی اور ایسے ایسے دندان شکن جواب دیئے کہ معترضین کے مُنہ پھر گئے۔ اِس فساد نے یہان تک طول کھینچا کہ منشی سجاد حسین اور حضرتِ سرشار سے صاحب سلامت ترک ہو گئی، مگر چونکہ دونون کا آئینۂ دل زنگ کدورت سے صاف تھا۔ اور دونون پُرانے یار تھے لہٰذا پھر باہم صفائی ہو گئی اور اگلی سی محبت قائم ہو گئی۔ چنانچہ آخری مضمون حضرتِ سرشار کا جو کہ انھون نے مرنے کے دن لکھا تھا اودھ پنچ ہی کے لئے لکھا گیا تھا اور اس مین شایع ہوا۔ اس باہمی تنازع کا حال پڑھ کر عبرت حاصل ہوتی ہے۔ سوائے اس کے کہ انشا پردازی کی آبروریزی ہوئی اور کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ آج فسانۂ آزاد مطبوع خلائق ہے۔ اِس کے اچھوتے فقرے اور لطیفے بچے بچے کی زبان پر ہین۔ اعتراض کسی کو یاد بھی نہین۔ بجز اس کے کہ اودھ پنچ کی پُرانی جلدون مین قلمبند ہین مگر وہ بھی اب کیڑے چاٹے جاتے ہین۔

غرضکہ قدردانون کے نعرہائے تحسین اور معترضین کے شور و غل مین یہ فسانہ شگرف اودھ اخبار کے ضمیمہ کے طور پر من ابتداے دسمبر ۱۸۷۸ع لغایتہ دسمبر ۱۸۷۹ع برابر شایع ہوتا رہا۔ بعد ازین ۱۸۸۰ع مین کتاب کی شکل مین شایع کیا گیا۔ قدردانان سخن شوق کا دامن پھیلائے پہلے ہی سے بیٹھے تھے۔

شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ لفظوں کی نئی تراش، ترکیبوں کی خوبصورتی، کلام کی گرمی، مضامین کی شوخی، طرزِ تحریر کی نزاکت، جواب و سوال کی نوک جھونک، زبان کی پاکیزگی، محاورہ کی صفائی، روزمرّہ کی لطافت، ظرافت کی گلکاری، تراشوں کی نئی پھبن، ایجادوں کی بانکپن نے لوگوں کو حضرتِ سرشار کا والہ و شیدا بنا لیا۔ اردو میں ایسے فسانے کا شائع ہونا بالکل ایک نئی بات تھی۔ اِس موقع پر اس امر کا اعلان بھی لازمی ہے کہ محض قصّہ سمجھ کر فسانہ آزاد کی قیمت کا اندازہ کرنا سراسر نافہمی ہے۔ اِس فسانہ کی دلچسپی کا انحصار اِس کی داستان کے سلسل ہونے پر نہیں ہے حضرتِ سرشار نے اِس میں لکھنؤ کی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ کھینچا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ لکھنؤ کی اِس مٹی ہوئی حالت پر بھی ایک عالم ہے۔ اِس شہر مرحوم کے باشندوں کا طرزِ معاشرت اِس کی گذشتہ عظمت کی یاد دلاتا ہے اور دل میں درد محبت پیدا کرتا ہے۔ ہاں نگاہ عبرت کا ہونا لازمی ہے۔ میرے دوستو! یہاں کی خاک کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہیں کبھی امیروں و شہزادوں کی آنکھوں کا سرمہ تھی۔ یہاں کی عالی شان مگر شکستہ عمارتوں کے ٹوٹے پھوٹے در و دیوار، زمانہ کے نشیب و فراز کی تصویریں ہیں۔ ؎

ہر کجا خشت کہن بینی درایں ویرانہ ہست فرد دفترِ احوالِ صاحب خانہ

گو کہ یہاں کے شرفا فلاکت زدہ ہیں اور زمانے نے ان کے جاہ و جلال کو خاک میں ملا دیا ہے۔ مگر ان میں ابھی بوئے ریاست پائی جاتی ہے۔ وہ ایک خاص وضع کے پابند ہیں۔ جس کو وہ آئین شرافت سمجھتے ہیں اور ایک خاص تہذیب کے یادگار ہیں۔ ؎

اسلاف کے کچھ اثر ہیں باقی اس راکھ میں کچھ شرر ہیں باقی

گو خوار ہوئے ہیں خود وہی ہے — مُرجھا گئے پھول بو وہی ہے

ان کی تقریر و گفتگو شستگی و پاکیزگی کی معیار ہے۔ ان کی نشست و برخاست کا طریقہ سلیقہ و امتیاز کا دستور العمل ہے۔ ان لوگون کو جنھون نے نئی تہذیب مین نشو و نما پائی ہے۔ اور جو تہذیب قدیم کے مذاق سے بالکل ناآشنا ہین۔ پرانی روشون مین سوائے عیوب کے کوئی جوہر نہ نظر آئے مگر اہل نظر جانتے ہین کہ اس زوال کی حالت مین بھی لکھنؤ ایک مٹی ہوئی تہذیب کی عبرتناک تصویر ہے جس کا رنگ ابھی بالکل نہین اُڑ گیا ہے۔ باوجود ہزارون عیوب کے یہان کے باشندون کے طرز معاشرت مین اب بھی ایک لطافت ہے جو کہ بیرونجات کے رہنے والون کو نصیب نہین۔ زبان کی شستگی، طبیعت داری، علو ہمتی، جوہر شناسی، ادب و سلیقہ، حُسن تقریر تو گویا شرفاء لکھنؤ کی گھٹی مین پڑے ہین۔ سرشار نے جو کہ شاعر کا دماغ اور مصوّر کی آنکھ اپنے ساتھ لایا تھا۔ فسانۂ آزاد مین اِس تہذیب کا مرقع کھینچا ہے۔ مگر صرف اس تہذیب کا خوشنما پہلو ہی نہین دکھایا ہے بلکہ اس کے وہ عیوب بھی جو اس کے جوہرون کو چھپائے ہوئے ہین اور جو ہر تہذیب کے زوال مین ظہور پذیر ہوتے ہین ظرافت کے پیرایہ مین بیان کئے ہین خصوصاً محلات کے طرز معاشرت اور بول چال کا وہ رنگ دکھایا ہے کہ بایدو شاید۔ بیگمات کی نستعلیق چال ڈھال اور شستہ و پاکیزہ تقریر کی تصویر آنکھون کے سامنے پھر جاتی ہے۔ نوخیز اور کمسن لڑکیون کی شوخی اور طراری کا عالم دل پر بجلی گراتا ہے ہر ایک بادۂ جوانی سے سرشار ہے۔ رگ رگ مین شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ایک ایک بات سے ہزار رنگینیان پیدا ہین۔ قدم قدم پر ناز و انداز قربان ہوتے ہین مگر ایسی حیا پرور کہ فرشتے ان کے دامن پر نماز پڑھین۔ پرانی جہاندیدہ

بڑھیون کی محبت آمیز بدگمانی اپنے رنگ مین لطف دیجاتی ہے۔ ان کی زبان سے جو نصیحت آمیز کلمے نکلتے ہین وہ ادب اور سلیقے سے معمور ہوتے ہین ۔ ماماُمین مغلانیان ہین کہ ہوا سے لڑتی ہین، ضلع جگت مین طاق ہین۔ زبان تڑاق پڑاق چلتی ہے۔ رستے چلتے لوگون پر پھبتیان کہتی ہین۔ نواب صاحب اپنے رنگ مین مست ہین عجب انداز سے شام کو چوک کی سیر کو نکلتے ہین۔ گلے مین منتّ کے طوق پڑے ہین، بازو مین امام ضامن کا روپیہ بندھا ہے تنزیب کا کرتا ہے جسکا چیت انگرکھا زیب بدن ہے ۔ کمر کا عدم وجود برابر ہے۔ چوڑی دار پاجامہ پنڈلیون سے چپکا ہوا ہے۔ ٹنکے دار ٹوپی آلپین سے سر پر رکھی ہوئی ہے، پانچ چار افیونی مصاحب ساتھ ہین۔ خدمتگار کے ہاتھ مین خاصدان ہے اور بغل مین بٹیرون کی کابک دبی ہوئی ہے۔ غرضکہ اسی عادت پر اس نگارندۂ معانی نے مختلف تصویرین مانی و بہزاد کے قلم سے کھینچی ہین اور بیچ بیچ مین ظرافت نے ایسی گلکاری کی ہے کہ جس طرح اتنی بڑی داستان لکھنے مین مصنف کا قلم نہین تھکا ویسے ہی پڑھنے والا نہین تھکتا۔ جہان خوجی کی قرولی میان سے نکلی کہ پڑھنے والون کی باچھین کھل گئین بہروپیے اور نواز عفران کے معرکے ہنستے ہنستے لٹا دیتے ہین۔

اردو مین حضرت سرشار اِس طرز نو کے موجد ہین اور اُن کا یہ فخر کہ ؎

ہر مرغ کہ پر زد بہ تمنائے اسیری ۔۔۔ اوّل بہ شگون گرد طواف حرم را

نہایت درست ہے۔ پرانے زمانے کے فسانون مین جن مین "فسانہ عجائب" پایہ عالی رکھتا ہے زندگی کے کل مرحلے روحانی قوتون کی مدد سے طے کئے جاتے ہین۔ ان مین انسانی جذبات اور دانش بینش کی وہ تصویرین نہین پائی جاتین جن سے کہ فسانۂ آزاد کی رونق و وقعت ہے۔

پُرانے افسانوں مین قریب قریب ہر داستان اس طرز پر ہوتی ہے۔ کہ طوطا بولا اے شاہزادہ والا تبار فلان ملک مین جو کہ یہان سے اسّی کرور کوس کے فاصلے پر ہے ایک شہزادی ہے جس کا سا حُسن نہ دیکھا نہ سُنا۔ ضیاے رُخ کا یہ عالم ہے کہ اُس شہر مین رات ہوتی ہی نہین۔ یہ سُننا تھا کہ شہزادہ صاحب کو اس سے شادی کرنے کا شوق چرّایا، اب ندھا دُھند نکل کھڑے ہوے۔ کہین صحرائے طلسم مین اسیر ہوئے کہین دیوؤن سے مُڈھ بھیڑ ہوئی۔ کہین رات کو پریان فرش خواب سے اُٹھا لے گئین۔ کہین حضرتِ خضر سے ملاقات ہوگئی۔ غرضکہ اسی انداز پر کل داستان کی داستان پوچ و بیہودہ خیالات کا ذخیرہ ہوا کرتی ہے فسانۂ آزاد کے بعد یہ طرز بالکل متروک ہوگیا۔ اِس کے انداز تحریر نے ایک نیا راستہ پیدا کردیا۔ جس نے کہ پُرانے وضع کی فسانہ نگاری کی وقعت کھودی۔

اِس موقع پر اس امر کا ذکر بھی ضروری ہے کہ "فسانۂ آزاد" مین باوجود اس قدر خوبیون کے اکثر عیوب بھی موجود ہین۔ جو کہ قدردانون کی نگاہون مین کھٹکتے ہین۔ اور جن کی وجہ سے فسانہ مذکور کی اشاعت کے وقت معترضین کو حرف گیری کا موقع ملا۔ اوّلاً جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے۔ فسانۂ آزاد مین وہ سلسلہ و ترتیب یا انتظام نہین ہے جو کہ عموماً ناول کی شان مین داخل سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً ثریا بیگم کی داستان بجاے خود ایک چھوٹا سا فسانہ ہے جس کا تعلّق کل قصّہ سے ایسا کامل نہین ہے، جیسا کہ لازمی ہے۔ اِسی طرح اکثر مقامات پر گلہاے مضامین کے انبار لگے ہوے ہین جن سے کہ اہل تماشہ کا دماغ معطر ہے۔ لیکن ان پھولون مین کوئی ایسا رشتہ نہین جن سے ایک ہار گُندھ جائے۔ علاوہ بریں میان آزاد کا چال چلن مقتضاے

صفات سے معمور ہے۔ شروع مین یہ شخص ایک آوارہ مزاج اور یار باش آدمی تھا۔ تمام عیب
شرعی اِس مین موجود تھے لیکن یکایک ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ تہذیب و شائستگی رگ رگ مین سما گئی۔
ایسے وارستہ مزاج شخص کا بلا وجہ اِس قدر مہذّب ہو جانا خلاف قانون قدرت ہے۔ حُسن آرا کا
بھی یہی حال ہے یعنی مسلمانون مین ابھی دو صدی تک ایسی آزادی پسند عورتین نہین پیدا ہو سکتی
نیز یہ عقدہ نہین کھلتا کہ حُسن آرا کے خیالات کیونکر اس درجہ عالی ہو گئے۔ ظاہر ہے خیالات پر
صحبت کا اثر پڑتا ہے یا تعلیم کا، حُسن آرا کی صحبت ہمیشہ پرانے خیالات کی بیگمات سے رہی۔ اور
تعلیم فارسی پائی۔ اِس صورت مین مغربی تہذیب کا رنگ اس خاتون کے خیالات پر کیونکر چڑھا۔
تو ضائع حُسن آرا کی چال ڈھال کا انداز جیسا کہ اِس فسانہ مین دکھایا گیا ہے خلاف فطرت انسانی
ہے۔ لیکن اِس سلسلہ مین یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے۔ کہ یہ باتین ایسی ضروری نہین ہین کہ جن سے
فسانۂ آزاد ناول کے لقب کا مستحق نہ سمجھا جائے۔ خوجی جو کہ فسانہ کی جان ہے۔ ہر مقام پر اپنے
رنگ مین ڈوبا ہوا ہے۔ جیسا کہ آزاد کو ہر وقت حُسن آرا کا خیال رہتا ہے ویسا ہی اس کو اُدھین
سے عشق ہے۔ روم ہو کہ ہندوستان، قرولی ہر وقت میان سے باہر ہے۔ کتنی مرمّت کیون نہ ہو
مگر اِس کے تیور میلے نہین ہوتے کیسی ہی مصیبت کیون نہ ہو لیکن زندہ دلی اس کا ساتھ نہین
چھوڑتی۔ آزاد کتنا ہی ستائین مگر وہ ان پر جان نثار کرنے کو تیار ہے۔ خوجی کی چال ڈھال شروع
سے آخر تک ایک ہی سانچے مین ڈھلی ہوئی ہے۔ اسی طرح ہمایون فر۔ سپہر آرا۔ بڑی بیگم۔ اللہ رکھی
وغیرہ فطرتِ انسانی کی سچی تصویرین ہین۔ اِس کے علاوہ فسانۂ آزاد مین ناول کے اور قرائن بھی
موجود ہین۔ جذباتِ دلی، کیفیتِ قلبی، شادی وغم، عشق و شجاعت، جلوہ ہائے قدرت

صبح وشام، باغ، سیر دریا وغیرہ جس کیفیت کو بیان کیا ہے تصویر کھینچ دی ہے۔

فسانۂ آزاد مین یہ بھی ایک خفیف سا عیب ہے کہ مصنف سے اکثر مقامات پر تناسب واقعات نہ نبھ سکا۔ مثلاً ایک جگہ ذکر یون لکھا ہے۔ کہ حُسن آرا نے میان آزاد کے علم وفضل کا امتحان کیا۔ اور فرمائش کی کہ ایک بوڑھے کی شادی ہوئی ہے، اِس شادی کی تاریخ کہو۔ میان آزاد نے کہا "پیر نابالغ"۔ پیر نابالغ سے ۱۲۹۶ ہجری تاریخ نکلتی ہے۔ روم کی لڑائی ۱۲۹۶ ہجری کے دو تین برس پہلے ہوئی۔ مگر میان آزاد اس تاریخ نکالنے کے بعد روم کی لڑائی مین شریک ہونے کے لئے گئے۔ لہذا تاریخ غلط ہو گئی اور واقعات مین تناسب نہ قائم رہ سکا۔ اِسی طرح ایک مقام پر حضرتِ سرشار خدا جانے کس ترنگ مین لکھ گئے کہ "بام پر پیش بہا شال کا خیمہ نصب ہوا"۔ اب معترض سوال کرتا ہے کہ "میخ کہان ٹھونکی گئی، چھت تو اس کام کی ہوتی نہین"۔ اِس موقع پر ہم کو بھی لاجواب ہونا پڑتا ہے۔ ایک مقام پر مصر کا اٹاچی خوجی سے کہتا ہے۔ کہ "کرسی کے احمق ہو"۔ یہ خاص لکھنؤ کا محاورہ ہے، مصر کے اٹاچی کو اس کی کیا خبر۔ اس قسم کی لغزشین فسانۂ آزاد مین پائی جاتی ہین۔ گو کہ تعداد مین بہت کم ہین۔ مگر چونکہ یہ فسانہ نہایت عجلت اور لاپروائی کے ساتھ لکھا گیا تھا لہذا ایسی لغزشین قابل معافی ہین۔

اکثر محاورے بھی فسانۂ آزاد مین ایسے ملین گے جن کو لکھنؤ کے اہلِ زبان دار الضرب شاہی کا سکّہ نہ کہین گے۔ اِس قسم کی حرف گیری زیادہ تر "اودھ پنچ" کے معترضین نے کی ہے۔ اِس موقع پر ہم کو افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ عموماً "اودھ پنچ" کے معترضین کی تحریرین انصاف پسندی کے جوہر سے خالی ہین۔ ایک ایک جملہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ دلی تعصب پان قلم

سے رنگ سخن بن کر پھوٹ نکلا ہے۔ مثلاً ایک صاحب تحریر فرماتے ہین کہ "فسانہ کاہے کو دیوانی ہانڈی یا صدقے کا ست نجا ہے۔ مصنف کا دماغ بالکل اس گندی گڑھیا سے مشابہ ہے جو کہ کوڑے کرکٹ اور لونڈون کے ڈھیلون کی بدولت چودھوین رات کو بھی کسی تارے یا چاند کا عکس کسی جگہ نہ دیکھ سکے۔" اودھ پنچ مطبوعہ ۲۴-اکتوبر ۱۸۹۲ء - ایسی تحریر کو نہ کوئی منصفانہ تنقید کہے گا نہ ظرافت ـ اسی طرح اکثر حضرات نے کاتب کی غلطیون کا خاکہ اڑایا ہے - مثلاً "چھوٹی موٹی" کے بدلے موٹی چھوٹی' یا "چوگوشیہ ٹوپی" کے بدلے چوگوشہ ٹوپی چھپ گیا - تو یہ غلطیان بھی مصنف "فسانۂ آزاد" کے سر منڈھی گئی۔ (دیکھو اودھ پنچ مطبوعہ ۱۵-اکتوبر ۱۸۹۰ء)

اس مین شک نہین کہ اودھ پنچ کے اکثر نامہ نگار خود اعلیٰ درجے کے لکھنے والے تھے۔ اور بذلہ سنجی و لطیفہ گوئی مین یدطولیٰ رکھتے تھے۔ وہ بھی اِس نئے طرزِ تحریر کو رواج دے رہے تھے جس کو رتن ناتھ نے فسانۂ آزاد مین عرش پر پہنچا دیا۔ مگر فسانۂ آزاد سے اِن حضرات کو خاص تعصب ہو گیا تھا۔ اُس تعصب کی وجہ بیان کرنا گویا پُرانے زخم کا ہرا کرنا ہے۔ علاوہ دوسری وجہون کے ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوئی کہ جس وقت سرشار اودھ اخبار کے اڈیٹر ہوے تو یہ اخبار اودھ پنچ کے ظریفون کا تختۂ مشق ہو رہا تھا۔ اِس حالت مین فسانۂ آزاد سے مخالفت جائے تعجب نہین کیونکہ اودھ اخبار کی جان یہ فسانہ تھا۔ با این ہمہ جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے اکثر مخاوے فسانہ مین ضرور قابل اعتراض ہین۔ افسوس اس قدر ہے کہ جس پیرایہ مین اودھ پنچ کے معترضین نے ان لغزشون کا خاکہ اڑایا ہے وہ مذاق سلیم کے معیار سے گرا ہوا ہے۔ اگر بے تعصبی اور تہذیب کے ساتھ بھی اعتراض کئے جاتے تو اُن کی وقعت بھی بڑھ جاتی اور کوئی نقصان یا شر بھی واقع

نہ ہوتا۔ اب اعتراض ملاحظہ ہون۔ حضرت سرشار فسانۂ آزاد مین لکھتے ہین "طبیعت بے مزہ ہے ذری جانے کیا سبب" (فسانۂ آزاد ضمیمۂ اودھ اخبار صفحہ ۵ مطبوعہ ۲۳ جولائی ۱۸۸۰ء) اعتراض ہے۔ "جانے کیا ہوا" لکھنؤ کی بول چال نہین۔ اور بے مزہ کھانا ہوتا ہے طبیعت کو بدمزہ کہتے ہین۔ اسی نمبر کے صفحہ ۶ پر "دائین طرف" لکھا ہے۔ اصل محاورہ ہے "داہنے طرف" ایک مقام پر تحریر ہے کہ "کئی بار پاٹی پر سر دے مارا" (فسانۂ آزاد ضمیمۂ اودھ اخبار صفحہ ۲۶ مطبوعہ ۳ اگست ۱۸۸۰ء) "پاٹی" لفظ غلط ہے "پٹی" درست ہے۔ "غم مفارقت مین دل پھٹا جاتا تھا کلیجہ منہ کو آتا تھا" (فسانۂ آزاد ضمیمۂ اودھ اخبار صفحہ ۱ مطبوعہ ستمبر ۱۸۸۰ء) اس جگہ پر محاورہ بالکل غلط ہے "دل پھٹ جانا" قطع امید ہو جانے یا بیزار ہونے کی جگہ آتا ہے نہ کہ عاشق و معشوق سے دل پھٹ جائے۔ "وہ تو عین دوپہر کے وقت جب چیل انڈے پر انڈا چھوڑتی ہے الخ" (فسانۂ آزاد صفحہ ۱ مطبوعہ ستمبر ۱۸۸۰ء) یہ محاورہ بھی غلط ہے۔ اصل محاورہ صرف اتنا ہے کہ "ایسی گرمی پڑتی ہے کہ چیل انڈا چھوڑتی ہے" مراد یہ کہ چیل کسی حالت مین اپنا انڈا نہین چھوڑتی، مگر ایسی گرمی پڑتی کہ وہ بھی اپنے انڈون سے الگ ہو جاتی ہے یعنی سینا ترک کر دیتی ہے۔ اس محاورے سے صرف گرمی کا مبالغہ مدنظر رہتا ہے۔ حضرت سرشار شاید انڈا چھوڑنے سے انڈا دینا مراد سمجھے۔ اس قسم کی لغزشین دیگر مقامات پر بھی پائی جاتی ہین۔ مگر ایسی لغزشون سے یہ نتیجہ نکالنا کہ حضرت سرشار زبان دان نہ تھے سراسر نا انصافی ہے۔ ایسی لغزشون کی ہستی اتنی بڑی کتاب مین ایسی ہے جیسے کہ کسی قلزم زخار مین خس و خاشاک۔ اور کون ایسا مصنف ہے کہ جس کی تصنیفات بالکل عیب سے پاک ہین۔ دیکھو آتش نفور کا مصرع ہے۔ ع

"تماشا فگنگہ کا ہے مطالع میرے دیوان کا"

"مطالع" محض غلط ہے، اصل لفظ ہے مطالعہ۔ ایک غزل کا مصرع ہے۔ ع

"درد و درمان سے المضاف ہوا"

اصل لفظ ہے "المضاعف"۔ آتش نے المضاف غلط نظم کیا ہے۔ ایک اور مصرع یاد آگیا۔

ع "کوئی نہیں چھوڑتا حلوۂ بے دود کو"

حلوۂ بے دود بھی غلط ترکیب ہے۔ "حلوائے بے دود" درست ہے۔ ایک اور مصرع یاد آگیا۔ ع

"دلِ بیتاب کو پہلو میں اک گرگ بغل پایا"

اعتراض ہے کہ "گرگ بغل" غلط ہے۔ "بغلی گھونسا" محاورہ ہے۔ اب ان لغزشوں کو دیکھ کر اگر کوئی شخص آتش کی زباندانی اور استادی پر حرف رکھے تو یہ محض حماقت ہی نہیں، بلکہ بےادبی ہے۔ فسانہ آزاد میں اکثر بھرتی کے مضامین ہیں۔ مثلاً تہیا سفی کے وعظ یا اخلاق پند و نصائح کے متعلق تقریریں خانہ پُری کے لئے درج ہیں۔ خلاقِ عالم نے حضرت سرشار کو کسی سنجیدہ کام انجام دینے کے لئے پیدا ہی نہیں کیا تھا۔ وہ صرف ہنسنے ہنسانے کے لئے دنیا میں آئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں پند و نصائح کا دفتر کھولا ہے فسانہ کا رنگ پھیکا ہو گیا ہے۔

مگر باوجود ان عیوب کے جن کا ذکر سلسلہ وار کیا گیا ہے فسانہ آزاد بحیثیت مجموعی اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ اِس کے جوہر اِس کے عیبوں کو چھپائے ہوئے ہیں۔ میرے دوستو! تحقیقات جدیدہ سے ثابت ہوا ہے کہ آفتاب میں بھی سیاہ داغ موجود ہیں لیکن جس طرح یہ داغ آفتاب کی ضیا نہیں گھٹا سکتے۔ اسی طرح حضرت سرشار کی طبع نورانی باوجود اکثر خفیف عیوب کے

قدر دانانِ سخن کی آنکھون کو ہمیشہ نور بخشتی رہیگی۔ ہان جو لوگ تعصب سے شپرہ چشم ہوے ہین وہ چاہے کچھ سمجھین۔

جہان تک محض انشاپردازی کا تعلق ہے' اس امر سے کسی کو انکار نہین ہوسکتا کہ حضرت سرشار نے طرزِ قدیم کو نسخ کیا۔ یہ صحیح ہے کہ رجب علی سرور کے فسانہ عجائب کی زبان نثر اُردو کا اعلیٰ نمونہ ہے' لیکن سرشار کا طرز زیادہ دلکش ہے۔ اِس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے کہ فسانۂ آزاد کے شایع ہونے پر فسانہ عجائب کتب قدیم کے عجائب خانہ مین رکھنے کے قابل ہوگیا یعنی جس کا وجود اب صرف اِس امر کی شہادت دیتا ہے کہ زمانۂ قدیم مین نثر اُردو کا کیا رنگ تھا۔ دیکھو دونون مصنفون کے طرز تحریر کے نمونے پیش نظر ہین۔ دُونون کے آغاز داستان کا نمونہ دیکھو:۔

سرور۔ گرہ کشایانِ سلسلۂ سخن' تازہ کنندگانِ فسانۂ کہن' یعنی محررانِ رنگین و مورخانِ جادو تقریر نے اشہب جہندہ قلم کو میدانِ وسیع بیان مین باکرشمہ سحر ساز و لطیفہاے حیرت پرداز گرم عنان و رجولان یون کیا ہے' کہ سرزمینِ ختن مین ایک شہر تھا مینو سواد بہشت نژاد پسند خاطر محبوبانِ جہان قابل بود و باش خوبان۔ الخ

سرشار۔ سحر کاذب کے وقت مرغ بے ہنگام نے گربہ مسکین کی آہٹ جو پائی تو گھبرا کر ککڑون کون کی بانگ لگائی۔ ہمارے حبیب لبیب دقیقہ رس صبح نفس جو سرِ شام سے لمبی تانے میٹھی نیند سوے تھے' یہ آواز خوش آیند سنتے ہی کلبلا کر اُٹھ بیٹھے۔ اِدھر آنکھ کھلی' اور باچھین کھل گئین۔

دونون کے انداز تحریر دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ سرور کی نثر تصنع کے بوجھ سے گرانبار ہے

سرشار کا طرزِ شوخی اور بےتکلفی سے معمور ہے۔ قدرتی جوش اور صفائی بیان مل کر عجیب عالم دکھاتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ نور کا فوارہ چھوٹ رہا ہے۔ برخلاف اس کے سرور کی تحریر میں صرف لطافت اور خیالی رنگینی کا دخل زیادہ ہے۔ سرور مضامین خیالیہ کی ہوا میں اڑتے ہیں سرشار نے مضامین حالیہ کی تصویر کھینچی ہے۔ اور ایسا ہونا چاہئے تعجب نہیں۔ رجب علی سرور کے زمانے میں فارسی کا رواج بہت تھا۔ یہان تک کہ خط و کتابت فارسی میں ہوتی تھی۔ لہذا اگر اس کے طرزِ تحریر میں فارسی کا رنگ چڑھا ہے تو حیرت نہیں۔ بہرحال جو کچھ اس نے کیا وہ اس کے لئے باعثِ فخر ہے وہ بھی زبان پر قدرت کاملہ رکھتا تھا اور اپنے رنگ کا آپ موجد تھا۔ مگر حضرتِ سرشار کے سامنے بھی جو مرحلہ درپیش تھا اس کا طے کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہ تھا۔ یہ یاد رہے کہ وہی شخص ایجاد کا بانی ہو سکتا ہے جو کہ دلوں کی نبض پہچانے۔ ایسی اصلاحیں تجویز کرے جن کے اختیار کرنے کیلئے زمانہ طیار ہو۔ حضرتِ سرشار میں وہ دماغی جوہر موجود تھے۔ جن سے ایسی قابلیت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس انشا پردازی کی خدا نے ایک نئی دنیا پیدا کر دی، وہ روش نکالی جو مطبوعِ خلائق ہوئی۔ اس وقت جتنے ناول اردو زبان میں موجود ہیں۔ سب فسانۂ آزاد کے بعد لکھے گئے ہیں اور سب میں حضرت سرشار کی طبع نورانی کا عکس نظر آتا ہے

یک چراغیست درین خانہ کہ از پرتوِ آن   ہر کجا مے نگری انجمنے ساختہ اند

وہ ایک آفتاب عالمتاب ہے یہ ذرات خاکی اس سے کسب نور کرتے ہیں۔ حضرت سرشار کی پوری وقعت کا اندازہ حضرت حالی کی حالت پر غور کرنے سے ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہا تھا جو کہ سرشار نے اردو نثر کے ساتھ کیا۔ مگر چونکہ ان کا دماغ

اِس کارِ عظیم کے انجام دینے کے لئے موزون نہ تھا۔ لہٰذا ناکامیاب رہے۔ حضرت حالی نے اُردو شاعری کے آئینے پر انگریزی خیالات کی تصویر اُتارنی چاہی۔ مگر چونکہ باریک فہمی کا قلم ہاتھ سے چھوٹ گیا لہٰذا تصویر کا ہزار جگہ سے چہرہ بگاڑ دیا۔ برخلاف اِس کے حضرت سرشار نے اُردو کی عروس بیاباں شمائل کو انگریزی زیور پہنایا، مگر کسی مقام پر بے عنوانی کا سایہ نہ پڑنے دیا۔ گلہائے مضامین کے قدردان جانتے ہین کہ نثر اُردو کے باغ نے اس چمن بند کی رنگ آمیزیون سے جو رونق پکڑی اس کی ثنا و صفت حیطۂ تحریر سے باہر ہے۔ ایک جانب تو پُرانے پتّے اور شاخین کاٹ چھانٹ کر چمن کو از سرِ نو آراستہ کیا، نئی روشین نکالین۔ دوسری طرف نثر انگریزی کے گلبن سے چند ایسی قلمین لایا جو کہ ہندوستان کی آب و ہوا مین نشو و نما پاسکتی ہین۔ اور اُن کے پیوند اپنے چمن کے پودھون مین لگائے جن سے ایسے خوشنما پھول پیدا ہوے کہ لوگ رجب علی کے لگائے ہوے باغ کو بھول گئے۔ حضرتِ حالی نے بھی زمینِ شعر مین جو پُرانا چمن لگا تھا اُس کی درستی کرنی چاہی مگر بجائے اِس کے کہ برگ خزان رسیدہ یا مُرجھائے ہوے پھول باغ کی روشون سے ہٹائین، سارا چمن اُجاڑ ڈالا۔ اور بلا لحاظ موافقتِ آب و ہوا چند ٹہنیان نظم انگریزی کے باغ سے کاٹ کر اِس سرزمین مین لگادین۔ اِن ٹہنیون نے جڑ نہ پکڑی اور چند روز مین مُرجھا کر رہ گئین۔ اِس انوکھے باغبان نے اپنی محنت کو بھی ڈبویا، اور پُرانے باغ کی رونق کو بھی کھویا۔ مُراد اِس کہنے سے یہ ہے کہ پُرانی روش کا ترک کرنا اور نئی وضع کا فروغ دینا بڑی طبّاعی اور عالی دماغی کا کام ہے۔ آج کل اکثر اصحاب نئے خیالات کی تلقین کے معنی یہ سمجھتے ہین کہ انگریزی جملون کی ترکیبین اُردو نثر مین الفاظ کو توڑ مروڑ کر کسی صورت سے داخل کی جائین اور ہربرٹ اسپنسر اور آگسٹ کانٹ کے فلسفیانہ تحقیقات

نتائج موقع بے موقع لولی لنگڑی عبارت مین لکھ دیے جاتے ہین - چاہے پڑھنے والا سمجھے یا نہ سمجھے -
یہ حضرت سرشار ہی کو فخر حاصل ہے کہ پُرانے شیشون مین اچھوتی ترکیبون اور نئے خیالات کی
بادۂ فرحت انگیز اِس خوبصورتی سے بھری کہ پُرانے اور نئے رنگ کی طبیعتون کو یکسان کیفیت حاصل ہوئی
حضرتِ سرشار صرف فسانہ نگاری کے موجد ہی نہین بلکہ اردو کے سب فسانہ نگارون
مین ان کا پایہ عالی تر ہے - آج کس کا منہ ہے کہ دو صفحے اِن کے رنگ مین لکھ سکے ہندوستان
مین آج جس قدر ناول نویس موجود ہین شاید بارش کے موسم مین اِس قدر حشرات الارض بھی نہ
پائے جاتے ہونگے لیکن سرشار مین اور اُن مین زمین آسمان کا فرق ہے -

چراغِ مُردہ کجا شمعِ آفتاب کجا

جو باتین یہ لوگ نہایت غور و فکر کے بعد پیدا کرتے ہین - وہ اُس کے لئے پیش پا افتادہ تھین -
اگر اُن کے صفحون کے صفحون مین کہین ایک آدھ فقرہ شوخ بنے تو وہ راکھ کے ڈھیر مین چنگاری
سے زیادہ وقعت نہین رکھتا - اس کو دیکھو کہ ہزارون صفحے لکھ ڈالے مگر پھر بھی کلام کی گرمی مین
فرق نہین آیا - یہ بھی سب جانتے ہین کہ کبھی اِس شخص نے اپنے لکھے ہوئے مسودے کی نظرِ ثانی نہین
کی - جس زمانے مین "فسانہ آزاد" اودھ اخبار مین شائع ہو رہا تھا - یہ لوگون کے چشم دید واقعے ہین
کہ اخبار شائع ہونے کو ہے اور کاتب پنڈت جی کو ڈھونڈھ رہا ہے کہ فسانہ کا مقررہ حصہ لکھ
دین، تاکہ اُس روز نکل جائے - پنڈت جی آئے اور نہایت بے تکلفی سے چار صفحے کھینچ کر
پھینک دیئے اور کہا کہ آج کے پرچے مین بھیج دو - دیکھنے والے سمجھے کہ خرافات مین کیا لکھا ہوگا
مگر نگاہِ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ موتی پروئے ہین -

گو کہ ہم کو حضرتِ سرشار کے ساتھ مولوی عبد الحلیم صاحب شرر کا نام لیتے ہوئے تامل ہوتا ہے، مگر چونکہ اہل اسلام کے ایک خاص فرقے میں آپ کی شہرت بہت ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے طرزِ تحریر کا مقابلہ کیا جائے۔ انشا پردازی کے میدان میں سرشار، شرر سے کوسوں آگے ہیں۔ شرر کی عبارت سلیس و پاکیزہ ضرور ہوتی ہے مگر جدّت سے خالی۔ وہ بات کہاں کہ ہر حرف اپنے دامن میں رنگین ادائی کے پھول لئے ہوئے ہے۔ ان کی نثر ہر مقام پر زبان بے نمک و شیر بے شکر ہے۔ ذیل کے اقتباس تمثیلاً درج ہیں۔

شرر۔ موجودہ زمانے اور مغربی تہذیب نے پنکچوئلٹی (پابندی وقت) کا سبق ایک حد تک سب ہی کو دیدیا۔ مگر اِس سے فائدہ نہ اُٹھایا تو ہمارے مشرقی دلرباؤں اور ایشیائی معشوقوں نے۔ وہ آج بھی ویسے ہی وعدہ فراموش ہیں جیسے سو دو سو برس پہلے تھے۔۔۔۔ عنفوانِ شباب کی خود پرستی انہیں اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتی کہ اسیرِ زلف گرہ گیر کے نالۂ شبگیر پر جھوٹوں بھی ترس کھائیں۔۔۔۔۔ مگر عاقبت اندیش عاشق ایک فلک دوز آہ کے ساتھ کہتا ہے " کیا مضائقہ؟ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" اور پہلے سے زیادہ ذوق و شوق کے ساتھ پہلے سے زیادہ عشق بازی پر آمادہ ہوتا ہے۔ (دلگداز نمبر ۱۔ جلد ۷ مطبوعہ جنوری سنہ ۱۹۰۶ء)

سرشار۔ مجنوں سے کسی ساربان نے کہا۔ کہ میاں تم دشت نوردی کیوں کر تے ہو، لیلےٰ تمہارے ہتھے چڑھے۔

این خیالست و محالست و جنون

مجنون نے ہنس کر کہا، تو اِس پھیر مین نہ پڑ، تجھے معشوقون کے عشوے اور غمزے سے کیا سروکار۔ تو شتر غمزے کا عادی۔ جا اپنے اونٹ چرا۔ ؎

در دلم عشق زلیلے کافیست   خواہش وصل زنا انصافیست

(دبدبۂ آصفی)

مضامین سے راستے مین شرر کا راستہ بالکل الگ ہے۔ شرر تاریخی ناول لکھتے ہین۔ مگر افسوس یہ ہے کہ جب اُنھون نے اِس کوچے مین قدم رکھا تو اپنی قوت تحریر اور طباعی کا کافی طور پر اندازہ نہ کر لیا۔ اوّلاً تاریخی فسانہ وہی شخص لکھ سکتا ہے جو کہ تاریخ سے واقفیت رکھتا ہو۔ ثانیاً یہ کہ شاعر کا دماغ اپنے ساتھ لایا ہو یعنی جس زمانے کا ناول لکھے اُس زمانے کے طرزِ معاشرت کی جیتی جاگتی تصویر آنکھون کے سامنے کھینچ دے۔ انگریزی زبان مین جن فسانہ نگارون نے اِس قسم کے فسانے لکھے اُن کی رگ رگ تاریخ ماضیہ کے عشق سے معمور تھی۔ وہ تاریخ کے لئے پیدا ہوے تھے اور تاریخ اُن کے لئے۔ حضرت شرر ایسے واقعات قدیم کے نسبت ناول لکھتے ہین جن کا تعلق تاریخ یورپ سے ہے لیکن یورپ کی کسی زبان مین دستگاہ عالی نہین رکھتے۔ صرف ترجمون سے اپنا مطلب نکالتے ہین۔ اِس حالت مین ان کا تاریخی علم مکمل نہین ہو سکتا۔ نہ وہ قدیم زمانے کی سوسائٹی کے رمز و کنایہ کافی طور سے سمجھ سکتے ہین۔ علاوہ برین قلم مین بھی وہ جادو نہین جو زمانۂ دیرینہ کے مردہ قالبون مین جان ڈال دے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فسانے روکھے پھیکے ہین۔ ان مین صرف تاریخی واقعات درج ہین۔ مگر جس زمانہ کا وہ اشارہ کرتے ہین اُس زمانے کے طرزِ معاشرت کا رنگ نہین کھلتا۔ شرر کے ناولون کے سپاہی انگریزی فوج کے

سپاہی ہین، جن پر صرف عرب کا لبادہ لاد دیا گیا ہے۔ شرر کے مقابلے مین سرشار کی فسانہ نگاری کا دائرہ ضرور محدود ہے۔ وہ صرف لکھنؤ کی سوسائٹی کا مرقع نگار ہے لیکن وہ اِس سوسائٹی کے رگ و ریشے سے واقف ہے۔ اِس کا ہر نیک و بد پہلو اس کی نظرون مین جنچا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس حالت کو بیان کرتا ہے اُس کا سمان بندھ جاتا ہے، وہی کیفیت آنکھون کے سامنے پھر جاتی ہے، وہی آوازین کانون مین آنے لگتی ہین۔ اس کے فسانون کی مخلوق جیتی جاگتی تصویرین ہین۔ ہم اُس کے فسانہ پڑھتے ہوے اس کو بھول جاتے ہین۔ اور جو کیفیت وہ بیان کرتا ہے اِس مین ہمہ تن محو ہو جاتے ہین اور واقعی فسانہ نگار کے کمال کا معیار بھی یہی ہے۔ برخلاف اِس کے شرر کے فسانون کی مخلوق یہ دلچسپی نہین پیدا کرتی۔ اگر وہ بولتے ہین تو مصنف کی آواز سے، اور دیکھتے ہین تو اس کی آنکھ سے۔ مکالمہ مین یہ تمیز نہین ہوتی کہ آدمی بول رہا ہے کہ فونوگراف سے آواز نکل رہی ہے۔ دیکھو خوجی اور مہراج بلی کا ذکر لوگون مین اِس طرح ہوتا ہے، جیسے اصل آدمیون کا۔ مگر شرر کی طبع فکر نے ایک مخلوق بھی ایسا نہ پیدا کیا۔ غرضکہ فسانہ نگار وہی کیفیت پیدا کر سکتا ہے جس سے اُس کو کما حقہٗ آگاہی حاصل ہو۔ سرشار جب خود اس اصول سے ہٹے ہین تو دھوکا کھایا ہے۔ مثلاً کامنی مین اُنھون نے ہندوون کے طرز معاشرت کا رنگ کھانا چاہا ہے۔ مگر چونکہ وہ خود اس رنگ سے ناآشنا تھے، لہذا جس جگہ اُنھون نے ہندو عورتون کی چال ڈھال اور گفتگو کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے، اُن کا قلم چلتے چلتے رُک گیا ہے۔ مجبور ہو کر اس مرقع مین بھی اسلامی تہذیب کا رنگ بھرنا پڑا ہے۔ ہندو طرز معاشرت کی تشریح مین در پردہ اسلامی سوسائٹی کی

جھلک نظر آتی ہے۔ یا یوں کہو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان خاتونوں کو ہندوانہ لباس پہنا کر تصویر کھینچی ہے۔ یہ نقص جو سرشار کے ایک ناول میں ہے، شرر کے کل ناولوں میں یادتی کے ساتھ موجود ہے۔ آخر میں یہ کہنا نامناسب نہیں کہ اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو شرر، سرشار کا کوئی مقابلہ نہیں۔ گو کہ شرر کی شہرت سرشار سے کسی حالت میں کم نہیں لیکن امر اس حکیمانہ اصول کی تائید کرتا ہے کہ محض شہرت کو اصلی لیاقت کا معیار نہ سمجھنا چاہیئے۔

ہاں اگر کوئی زمانہ موجودہ کا مصنف حضرت سرشار کا ہم پایہ ہے تو وہ محمد حسین آزاد ہے۔ اس کو بھی اردو زبان پر قدرت کاملہ حاصل ہے۔ اس کی مشہور و معروف کتاب "آب حیات" اس کا نام قیامت تک زندہ رکھیگی۔ سرشار کی طرح وہ بھی ایک طرز نو کا موجد ہے۔ دونوں مصنفوں نے اپنے اپنے رنگ میں معجزہ دکھایا ہے۔ دونوں کا دماغ فیضان قدرت سے شاداب ہے لیکن انداز تحریر جداگانہ ہے۔ سرشار کا طرز تحریر شوخ مضامین کے لئے موزوں ہے۔ آزاد کی نثر سنجیدہ مسائل کی بحث کا بار آسانی سے اٹھا سکتی ہے۔ سرشار کا رنگ ظریفانہ ہے اور ایک ایک لفظ پر شوخی اور رنگینی قربان ہے۔ آزاد کی عبارت سلیس و فلسفیانہ ہے اور محاورہ متانت سے دست و گریبان ہے۔ سرشار بے تکلف قہقہے پر قہقہہ لگاتا ہے۔ آزاد بھی ہنستا ہے مگر اس کی ہنسی مسکراہٹ کی حد سے نہیں بڑھنے پاتی۔ آزاد ہر مضمون کو فلسفی کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور غور و فکر کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ سرشار ہر عالم کی سیر مصور کی آنکھ سے کرتا ہے اور جو کیفیت دیکھتا ہے اس کو ظرافت کے پیرایہ میں بیان کرتا ہے۔ دونوں کا انداز تحریر دیکھو

آزاد ۔ کیا یہ تھوڑے افسوس کا موقع ہے کہ ہمارے بزرگ خوبیاں بہم پہونچائیں،

انہیں بقاے دوام کے سامان ہاتھ آئین اور اس پر نام کی زندگی سے بھی محروم ہین۔ بزرگ بھی وہ بزرگ جن کی کوششون نے ہمارے ملکی اور کتابی زبان کا لفظ لفظ اور حرف حرف گرانبار احسان ہو۔ ان کے کامون کا اس گمنامی کے ساتھ صفحۂ ہستی سے مٹنا بڑے حیف کی بات ہے۔ جس مرنے پر ان کے اہل و عیال روئے وہ مرنا نہ تھا۔ مرنا حقیقت مین ان باتون کا مرنا ہے جس سے ان کے کمال مر جائینگے اور یہ حقیقت مین سخت غمناک حادثہ ہے۔ ایسے بزرگان باکمال کے رویّے اور رفتارون کا دیکھنا انہین ہماری آنکھون کے سامنے زندہ کر دکھاتا ہے اور ہمین بھی دُنیا کے پیچیدہ راستون مین چلنا سکھاتا ہے۔" (آب حیات)

سرشار۔ آہ کیسی ہوا چلی کہ پایے ہندوستان کے علم و فضل کا پھلا پھولا چمن اُداس ہو گیا، اولوالعزمی کی ہری بھری شاخیں ایک ہی جھونکے مین پھٹ پڑین عظمت کے تناور اور بارآور درخت اراراکر زمین پر آرہے، خزان کے لشکر نے ایسا زغہ کیا کہ بہار علم کا عمل کھڑے کھڑے اٹھ گیا۔ اب اہل ہند مین وہ جوش نہ وہ خروش ہے جیسے دیکھو بادۂ غفلت کے نشے مین مدہوش ہے۔ خواب خرگوش مین پڑے خراٹے لے رہے ہین، خیر خوب نیند بھر کر سو چکے۔ اب بھی جاگین تو ہم سمجھین کہ بخت خفتہ بیدار ہو گیا۔

شب نیمہ گذشت و صبح سر زد　　　　اے مرد خدا بہ خواب تا کے

(شمس الضحیٰ)

حضرت سرشار نے علاوہ فسانۂ آزاد کے بہت سے ناول لکھے اور اکثر انگریزی ناولون کے ترجمے بھی کئے۔ ان تصنیفات مین "سیر کہسار"، "جام سرشار"، "کامنی" اور "خدائی فوجدار"

زیادہ تر مشہور ہیں۔ "سیر کہسار" میں ادنیٰ درجے کی مسلمان سوسائٹی کا نقشہ کھینچا ہے عبارت شوخ اور رنگین ہے۔ مگر فسانۂ آزاد کے مقابلے میں سست ہے۔ "کامنی" کی کیفیت پیشتر تحریر ہو چکی ہے۔ "جام سرشار" بھی فسانۂ آزاد کی کیفیت سے خالی ہے۔ "خدائی فوجدار" "ڈان کوئک زاٹ" کا ترجمہ ہے۔ اس کا رنگ ان کی تصنیفات میں بہت پھیکا ہے لکھنؤ سے حیدرآباد جانے کے قبل چھوٹے چھوٹے ناولوں کا ایک سلسلہ "خمکدۂ سرشار" کے نام سے جاری کیا گیا تھا۔ ہشّو، کڑم دھم، بچھڑی ہوئی دلہن، طوفان بے تمیزی، وغیرہ اسی سلسلہ میں تصنیف ہوئے مگر ان ناولوں کو دیکھکر انیس سرور کا شعر یاد آتا ہے۔ ؎

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس
عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

واقعی یہ ناول اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ ایک زبردست مصنف کا کمال اس قدر زوال پذیر ہو سکتا ہے۔ بہتر ہوتا کہ حضرت سرشار اس خمکدہ کی طرف رجوع ہی نہ ہوتے مگر وہ تو اپنے قابو ہی میں نہ تھے۔ اس خمکدہ کا سلسلہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سفر کا حال حضرت سرشار نے خود "کشمیر پرکاش" بابت ماہ مارچ ۱۸۹۹ء میں یوں تحریر فرمایا ہے۔

"چار برس کا زمانہ ہوا کہ میں کانگرس کا ممبر ہو کر مدراس گیا تھا۔ وہاں سے بخت رسا حیدرآباد دکن لائے۔ یہاں کے ہندو اور مسلمان امرا اور پبلک نے میری بڑی خاطر کی...... مہاراجہ کشن پرشاد بہادر وزیر فوج آصفی نے جو وزیر اور مدارالمہام بھی رہ چکے ہیں مجھے بلایا اور دو سو کا نوکر رکھ لیا۔ اور شعر و سخن اور نثر کی اصلاح لینے لگے۔ اور کسی کام پر خوش ہوئے تو

فوراً ایک اشرفی انعام خلعت اور جوڑے سال میں تین چار بار عطا ہوتے ہیں ...... حضور نظام مجھے پہلے سے جانتے تھے جس روز اول بار میں نے نذر پیش کی اور کتابیں بھی بطریق نذر پیش کیں تو حضور نے یہ شرف بخشا کہ ایک گھنٹہ کامل تک ناول "سیر کہسار" کی عین دربار دُربار میں سیر کی۔ "جام سرشار" کا ایک سین ملاحظہ کر کے اپنے سیکتیر اڈیکانگ نواب محبوب جنگ یار بہادر سے فرمایا کہ یہ دلچسپ ناول میں پڑھ چکا ہوں۔ میری لائبریری میں موجود ہے۔ میں نے ولادت شہزادۂ والا تبار کی تاریخ اسی وقت بذریعۂ نواب سردار جنگ پیش کی۔ مادۂ تاریخ حضور پُرنور نے بہت پسند فرمایا۔ میرا نام معزز درباریوں میں لکھ لیا گیا۔ اب میرے منصب کی کوشش ہو رہی ہے۔ نسلاً بعد نسلاً اور بطناً بعد بطناً انشا اللہ تعالیٰ ...... خدا نے چاہا تو پندرہ دن کے اندر میرا نو تصنیف ناول "گور غریباں" شایع ہوگا۔"

حیدرآباد سے حضرتِ سرشار نے ایک سالہ موسوم بہ "دبدبۂ آصفی" نکالا تھا۔ ابتدا میں اس میں اچھے اچھے مضامین شایع ہوتے رہے۔ خود بھی اکثر لکھتے تھے۔ مگر طرزِ تحریر میں اگلی سی آب و تاب نہیں رہی تھی۔ "گور غریباں" ناول خدا جانے شائع ہوا کہ نہیں۔ دبدبۂ آصفی میں ایک ناول موسوم بہ "چنچل نار" سلسلہ وار شائع ہوتا تھا وہ بھی ناتمام رہا۔ اور اچھا ہوا کہ ناتمام رہا۔

حضرتِ سرشار شاعری میں مظفر علی صاحب اسیر کے شاگرد تھے۔ اپنے اُستاد کو نہایت محبت کے ساتھ یاد کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ منشی آسیر خالی اُستاد ہی نہیں تھے، بلکہ اُستاد گر تھے، شاگردوں کو اُستاد بنا گئے۔ حضرت سرشار کا کلام عاشقانہ اور رندانہ طرز کا ہوتا تھا۔ مگر طبیعت کی شوخی اور زبان کی پاکیزگی عجب عالم دکھاتی تھی۔ اکثر مضمون آفرینی کی طرف

بھی جُھک پڑتے تھے۔ لکھنؤ مین ایک مرتبہ مشاعرے مین ایسا شعر پڑھا کہ مشاعرہ اُلٹ گیا۔

حال سب میری سخت جانی کا | باڑھ کہتی ہے مُڑکے خنجر سے

واقعی کیا نازک خیالی اور باریک بینی کی داد دی ہے۔ ایک اور شعر ان کا انہین کے حسب حال یاد آگیا۔

پینے پہ جب آتے ہین تو پھر بس نہین کرتے | میخانے مین سُنتے نہین تکرار کسی کی

ایک غزل کا مطلع ہے۔

سیاہ بخت و تبہ روزگار ہم بھی ہین | جو اب لٹ پریشان یار ہم بھی ہین

جب پنڈت بشن نراین صاحب در کے ولایت سے واپس آنے پر قوم مین طوفان بے تمیزی برپا ہوا۔ تو اُس کے فرو کرنے کے لئے ایک مثنوی تحفۂ سرشار کے نام سے لکھی دیکھو تمہید کس مزے کی ہے۔

لندن کی پلا دو آتشہ سے | آ پیر مغان کدھر چھپا ہے
مُن برسیگا میکدہ پر اے یار | رندون کو جو تو کریگا سرشار
دا تا پلوا شراب اچھوتی | خوشبو خوش رنگ تیز جو کچھی
کوثر کی کھنچی نہین ہے منظور | پیتی ہی وہ اُن جیسے پیپے حور
سرجوش شراب ناب لا دے | بوتل مُنہ سے مرے لگا دے
بدمست ہون پی کے ایک چلّو | زاہد کو بنا مین خوب اُ لّو
گھنگھور گھٹا ہے آج یا دل | میخانے کو کردے تو بھی جل تھل

برسا دے شراب ناب ساقی — دکھلا دے آفتاب ساقی
فتوی کا شی کا کون مانے — لاکھوں میں یوں کھلے خزانے

رم جھم یہ برس رہا ہے پانی — بے مے ہے حرام زندگانی

ایک مقام پر صبح کا عالم یوں دکھایا ہے ۔ ؎

جھلکا جھلکا سپیدۂ صبح — ہلکا ہلکا سپیدۂ صبح
تارے چھپتے ہیں جھلملا کر — ہے نور سا جلوہ گر فلک پر
بھینی بھینی مہک گلوں کی — اور نغمہ زنی وہ بلبلوں کی

اے ساقی مہ لقا یدہ مے — اے مرد خدا بخواب تا کے

وقت سحر اور خنک ہوا ہے — بے مے سب کرکرا مزا ہے
اک چلو کے دینے میں یہ تکرار — اُٹھو، جاگو، سحر ہوئی یار
دریا کی طرف چلے نہانے — غوطے پریوں کے زنان خانے
مرغان چمن یہ نکتہ رانی — چوں برہمنان بہ بید خوانی
نوبت رنگت جما رہی ہے — شہنائے مزہ دکھا رہی ہے

ہاں اتنا ضرور خیال رہے کہ اس مثنوی میں متعدد مقامات پر "گلزار نسیم" سے رنگ و بو لیکر اپنے مضامین کو تازہ کیا ہے۔ ۱۹۲۴ء میں جو کشمیری سوشل کانفرنس ہوئی تھی اس میں ایک قصیدہ پڑھا تھا جس کا یہ مطلع ہے ۔ ؎

پھلینگے پھولینگے گلزار قوم کے اشجار — اُٹھا ہمالیہ پربت سے ابر گوہر بار

فارسی بھی کہتے تھے - مگر بہت کم -

عجیب بذلہ سنج، حاضر جواب، ظریف اور خندہ جبین شخص تھا - بات بات مین نکتہ اور ہر نکتے مین ہزارون رنگینیان پیدا کرتا تھا - ہمیشہ ہنستا بولتا رہتا تھا - چہرے پر مسکراہٹ نور برساتی تھی جس صحبت مین بیٹھ گیا معلوم ہوتا تھا کہ بلبل ہزار داستان چہک رہا ہے - زندگی بھر کبھی غم و غصہ اور رنج پاس نہ آنے پائے - تمام عمر بنیا کانہ اور آزادانہ حالت مین کاٹ دی طبیعت کبھی غور و فکر کی طرف مائل ہی نہین ہوئی، وہ اپنی طبیعت کو خوب پہچانتا تھا - چنانچہ کشمیری سوشل کانفرنس مین جو قصیدہ پڑھا اس مین تعلّی کے اشعار کے زمرہ مین ایک شعر یہ بھی تھا - ؎

طبیعت ایسی ملی شوخ جیسے چنچل نار   زبان وہ پائی کہ بے نطق سیکڑون توڑے

واقعی سرشار کی طبیعت ایک چنچل نار ہے، جس کی ہر ادا مین شوخی اور ہر انداز مین بانکپن ہے - جب یہ شوخی اور بانکپن درجۂ اعتدال سے بڑھ جاتے ہین تو دیکھنے والے شرما جاتے ہین مگر وہ خود نہین شرماتی - اِس آزادی اور بیباکی کی وجہ سے کبھی شہرت یا جاہ و ثروت کی آرزو دل میں نہ آنے پائی - گو کہ زمانے سے کمال کی سند مل گئی تھی، مگر بے نیاز طبیعت نے کسی امیر یا رئیس کے در کی طرف رُخ نہ کرنے دیا - ؎

تمنا دولتِ دنیا کی اے آتش نہین رہتی   قناعت سے غنی اللہ کر دیتا ہے مسکین کو

آخر عمر مین حیدرآباد مین ایک رئیس کے دربار مین رسائی ہو گئی تھی - مگر وہ بھی اپنی کوشش سے نہین -

عجب ذہن خداداد پایا تھا، فارسی اور عربی مین فاضلانہ لیاقت نہ تھی - مگر طبیعت داری کا

یہ عالم تھا کہ علما اور فضلا کی صحبت میں اپنا رنگ جما لیتا تھا۔ حافظہ کی یہ کیفیت تھی کہ ہزاروں شعر فارسی اور اردو کے ازبر تھے۔ یہی اشعار مختلف موقعوں پر اپنے مضامین میں عجب انداز سے چسپاں کئے ہیں۔ بس معلوم ہوتا ہے کہ فلاں شعر فلاں موقع ہی کے لئے کہا گیا ہے۔

مگر کیا افسوس کی بات ہے کہ اس باکمال نے اپنی قدر آپ نہ کی۔ بے اعتدالیوں نے بے طرح دل میں جگہ کر لی تھی۔ سرشار اسم بامسمیٰ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زبردست مصنف کا کمال روز بروز زوال پذیر ہوتا گیا۔ اور زندگی فارغ البالی کے ساتھ نہ بسر ہو سکی۔ سنتے ہیں کہ آخر زمانہ میں حیدرآباد میں بھی مہاراجہ کشن پرشاد نے انہیں بے اعتدالیوں سے ناراض ہو کر اپنا دست شفقت کھینچ لیا تھا۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی صاحبِ کمال بڈھا ہوتا ہے تو اُس کا کمال جوان ہوتا جاتا ہے لیکن سرشار کی عمر کے ساتھ اس کے کمال میں بھی ضعف آتا گیا۔ اس عالی فہم مصنف کو خود اس امر کا حس تھا۔ چنانچہ کشمیری کانفرنس والے قصیدے میں اپنے تئیں یوں خطاب کیا ہے۔ ؎

ہوا اس کمال لیکن ہزار بار افسوس — کہ تو نے قدر نہ کچھ جانی اپنی خود زنہار
کمال کے لئے لازم جو ہو زوال خسرو — اب ایک قطرہ ہے پہلے تھا قلزم زخار
نہ آب و تاب وہ اگلی سی ہے نہ رنگ نہ روپ — نہ ہیں وہ شاہد مضموں کے پھول سے رخسار
نہ حافظہ سی رہا وہ نہ قوتِ ادراک — ہے کہاں سچ ہر اک شے کی حد ہے آخر کار
اسی زمانے میں تو بھی امیر ہو جاتا — قبول زر میں نہ ہوتا اگر تجھے انکار

یہ زوال لازمی تھا۔ سرشاری ہو یا شاعری، یہ سب دماغ کا کھیل ہے۔ آپ آتشین نے جب

دماغ ہی مین آگ لگا دی تو گلہائے مضامین بھی آتشبازی کے پھول ہو کر رہ گئے طبیعت بجھ گئی۔ کلام مین گرمی نہ باقی رہی۔ یہ ممکن نہین کہ ایسا ذہین اور ذکی شخص اس بلائے بد کے انجام کے اثر سے واقف نہ ہو۔ چنانچہ اپنے مختلف فسانون مین اس کی ہجو و مذمت مین کوئی دقیقہ نہین اُٹھا رکھا ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اپنے اوپر بس نہین چلا۔ اُستاد سچ کہہ گیا ہے

چھٹتی نہین ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اِس لکھنے سے ہماری مراد نکتہ چینی نہین اگر کسی قسم کی گستاخی کا شبہہ بھی ہو تو ہم مرحوم کی روح سے نہایت ادب کے ساتھ مُعافی مانگتے ہین۔ ہان بیشک یہ باتین ہمارے دلون کو عبرت کا سبق دیتی ہین۔ ہائے اِس باکمال کا دماغ اگر اپنی اصلی حالت پر رہتا تو خدا جانے وہ کن کن بلند پروازیون کی ہوا مین اُڑتا اور کیسے کیسے تارے انشا پردازی کے عرش سے توڑ کر لاتا۔ بہر حال جن لوگون کو ابھی کچھ دن اور اِس خرابہ مین عمر کاٹنی ہے اُن کو اِس دردناک مثال سے سبق لینا چاہیئے۔ کہتے ہین آخر عمر مین تپ درون نے بالکل گھلا دیا تھا۔ کھانا پینا چھوٹ گیا تھا۔ جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ آخر کار ۲۱ جنوری ۱۹۰۳ء کو اِس دار فانی سے رحلت کی۔ تقریباً پچپن یا چھپن برس کی عمر پائی۔ ؎

سرشار فصیح و نکتہ پرور نہ رہا ۔۔۔ سرمایۂ نازِ اہلِ جوہر نہ رہا
اعجاز قلم کے جس کے سب قائل تھے ۔۔۔ وہ نثر کا اُردو کی پیمبر نہ رہا

داغ

(ماخوذ از "زمانہ" جولائی ۱۹۰۵ء)

آج راہی جہان سے داغ ہوا خانۂ عشق بے چراغ ہوا

کیا افسوس کا مقام ہے کہ اردو شاعری کے آخری دور کا آخری شاعر قدردانان سخن کو ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گیا۔ مدت ہوئی کہ نظم اردو کے شباب کی تاروں بھری رات خاتمے پر آ چکی تھی۔ یہ پچھلے پہر کا ایک تارا باقی رہ گیا تھا جس کی روشنی دمبدم گھٹتی جاتی تھی۔ آخرکار یہ تارا بھی ہماری نظروں سے پنہاں ہو گیا۔ اور اسی کے ساتھ قدیم مذاق سخن کا چراغ سحری بھی گل ہو گیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ دکن ہی کی خاک پر چمنستان نظم اردو کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ اور اس چمن کا آخری پھول دکن ہی کی خاک کا پیوند ہوا۔ یہ آخری پھول دہلی مرحوم کا رنگین مزاج اور شوخ طبع شاعر داغ تھا جس کی روح آج فردوس میں کسی حور کے گیسوؤں میں بو کی طرح سمائی ہوگی۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اگر دنیا کے مصنوعی اعزاز و وقار کی نگاہ سے دیکھو۔ تو جہان استاد مقرب سلطان ناظم

یار جنگ دبیر الدولہ فصیح الملک بلبلِ ہندوستان نواب مرزا خان داغ دہلوی کا ایسا خوش قسمت شاعر ہندوستان مین کم پیدا ہوا ہوگا۔ ذوق مرحوم شاہنشاہ دہلی کے استاد تھے مگر تیس روپیہ ماہوار کا وظیفہ اُن کے لئے معراج ترقی ہوکر رہ گیا۔ غالب کی رگ رگ مین آبائی ریاست کا ناز خون کے ساتھ شامل تھا۔ مگر اِس عالی حوصلہ اور زندہ دل شاعر کی جس شکستہ حالی مین بسر ہوئی سب پر ظاہر ہے۔ آتش کے کمال پر غور کرو اور پھر یہ دیکھو کہ خاک کے بچھونے کے سوا بوریا بھی میسر نہ ہوا۔ اور اکثر اس شہنشاہ سخن کو تین تین دن فاقے سے گذر گئے۔ ناسخ کی ضرور کسی قدر فارغ البالی مین گذری، لیکن وہ شان و شوکت اُن کو بھی نہ نصیب ہوئی جو قسام ازل نے داغ دہلوی کے لئے مخصوص کر رکھی تھی۔ اِس مال و دولت کے علاوہ اگر شہرت پر نظر ڈالو تو جو نام آج داغ کا ہے اِس پر ہر فرد بشر کو ناز ہو سکتا ہے۔ ہندوستان مین آج کون شہر ایسا ہے جہان کے کوچہ و بازار مین داغ کی غزلین ارباب نشاط کے دلون کو نہ گرماتی ہون۔ اور رنگین طبع سامعین کو وجد مین نہ لاتی ہون۔ اِس جاہ و ثروت اور اس عالمگیر شہرت کے اسباب کچھ ہی کیون نہ ہون لیکن اس امر واقعی سے کوئی انکار نہین کر سکتا کہ داغ کو یہ قابل رشک نعمتین حاصل تھین۔

تخلص بھی اس خوش نصیب شاعر نے ایسا نفیس پایا کہ سوائے دو چار شعرا کے کسی کے حصے مین کم آیا ہوگا۔ اتنا ضرور ہے کہ یہ تخلص نیا نہین ہے۔ میر سوز کے بیٹے کا تخلص بھی داغ تھا، مگر وہ بیچارے اُبھرے نہین۔ اور آج اُن کا نام بھی کوئی نہین جانتا اور نہ اُن کا کوئی شعر کسی کو یاد ہے۔

اِس مصنوعی شان و شوکت کے علاوہ اگر داغ کے شاعرانہ کمال پر نظر ڈالی جائے تو او

ہی عالم نظر آتا ہے۔ داغ کی شاعری عجب معرکہ آرا شاعری ہے۔ ایک فرقہ اس نامی شاعر کے معتقدین کا ہے جو اس پیر سخن کی شاعری کو معراج دینا اپنا ایمان سمجھتا ہے۔ اور ان حضرات کو یہ کہنے مین تکلف نہین ہوتا کہ آتش و ناسخ و ذوق و غالب وغیرہ بھی جو چراغ شاہراہ سخن پر روشن کر گئے ہین وہ داغ کے کمال شاعری کے آفتاب کی روشنی مین ماند نظر آتے ہین۔ یا داغ کا کمال میر و مرزا کے کمال کا مجموعہ ہے۔ دوسرا گروہ اُن باوضع حضرات کا ہے جو داغ کے کمال سخن مین دھبہ لگانا اپنا مذہب سمجھے ہوئے ہین اور جن کا یہ مقولہ ہے کہ امیر مینائی کے اکثر شاگرد داغ سے اچھا کہتے ہین۔ یا یہ کہ داغ کی زبان دہلی کی مستند زبان نہین ہے۔ غرضکہ داغ کے شاعرانہ وقار کی کشتی اس وقت تحسین ناشناس اور نفرین بیجا کے دوآبے مین پھنسی ہوئی ہے اور ایک عجیب طوفان اس کے گرد برپا ہے۔ مگر زمانہ کا ناخدا اس سے زیادہ زور و شور کے طوفان جھیلے ہوئے ہے۔ وہ اس کشتی کو بھی ایک دن اپنے اصلی مرکز پر پہونچا دیگا۔ ہان بالفعل اس نامور شاعر کے کمال کا بے تعصبی کے ساتھ اندازہ کرنا کسی قدر دشوار ہوگیا ہے۔ کیونکہ اس راہ مین قدم رکھتے ہی اکثر ایسی صورتین درپیش آتی ہین جو گمراہ کرنے کے لئے غول صحرائی سے کم نہین لیکن انصاف پسندی اور بے تعصبی کا وہ اسم اعظم ہے جو مسافر تحقیق کو ضرور منزل مقصود تک پہونچا سکتا ہے۔ اس حالت مین اگر دہلی اور لکھنؤ کی معرکہ آرائیون کے پرانے زخمون پر مرہم رکھکر داغ کی شاعری پر ایک منصفانہ نظر ڈالی جائے تو یہ ثابت ہو جائیگا کہ یہ شوخ طبع شاعر نہ اس معراج کا مستحق ہے جو تحسین ناشناس کی بدولت اسے اکثر نگاہون مین حاصل ہے۔ نہ یہ غریب اس قعر بے کمالی مین پڑا ہے جس مین اس کے بیدرد اور کم نظر مخالف اسکو دھکیلنا چاہتے ہین

داغ کے کلام کی تاثیر اس امر کی شاہد ہے۔ کہ اس کے قدرتی طور پر شاعر ہونے مین
کلام نہین۔ اِس کے کلام کا اثر حرارت برق کی طرح سُننے والے کے دل مین دوڑ جاتا ہے۔
اور ایک کیفیت پیدا کر دیتا ہے، جس کا نام تاثیر سخن ہے۔ مگر تاثیر تاثیر مین فرق ہے اور شاعر
شاعر کے کمال مین امتیاز ہو سکتا ہے۔ ہمارا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ داغ کا پایۂ اردو شعرا کے
دربار مین کیا ہے۔ اور اس کا کلام کس قسم کی تاثیر دل مین پیدا کرتا ہے۔ اِس امر کا فیصلہ کرنے
کے لئے اِس بات کی ضرورت ہے۔ کہ یہ دیکھا جاے، کہ وہ معیار کیا ہے جس سے شاعرانہ
دقار کے مختلف مدارج کا اندازہ ممکن ہو سکتا ہے۔ یہ معیار اُسی وقت قائم ہو سکتا ہے، جب کہ
شاعری کے اصلی مفہوم سے واقفیت ہو۔ اب دیکھنا چاہئیے کہ شاعری کا اصلی مفہوم کیا ہے
شاعری وہ جادو یا اعجاز ہے جس کا کرشمہ یہ ہے۔ کہ انسان کے خیالات اور احساسات
اُس کے جذبات دلی کے سانچے مین ڈھل کر زبان سے نکلتے ہین۔ اور ایک عالم تصویر پیدا
کر دیتے ہین۔ اور چونکہ شاعر کی کانون کی فضا مین سلاست بان کا نغمہ قدرتی طور پر سمایا ہوا
ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے الفاظ کو اِس خوبی سے ترتیب دیتا ہے کہ اُن مین علاوہ عالم تصویر
کے ایک تاثیر موسیقی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعر کا کلام ایک آئینہ ہوتا ہے۔ جس مین اُس کے
اُن خیالات اور احساسات کا عکس نظر آتا ہے جو اُس کے جذبات دلی کے رنگ مین ڈوبے
ہوے اس کی زبان سے نکلتے ہین۔ غرضکہ جذبات شاعری کی روح رواں ہین۔ اور چونکہ دل کو
دل سے راہ ہے۔ لہٰذا جس قسم کے جذبات کے رنگ مین شاعر کا کلام ڈوبا ہوا ہو گا وہ اسی
قسم کے جذبات سامع کے دل مین بھی جوش مین لائیگا۔ مگر ان جذبات و خیالات وغیرہ کی دو

قسمیں ہیں - اعلیٰ اور ادنیٰ - اعلیٰ جذبات و خیالات سے بحیثیت مجموعی فطرت انسانی کا روحانی حصّہ مراد لیا جاتا ہے - اور ادنیٰ جذبات و خیالات سے حیوانی حصّہ۔ جس شاعر کی فطرت میں اعلیٰ جذبات و خیالات ترقی پر ہوتے ہیں وہ پاکیزہ نظری اور بلند خیالی کی ہوا میں اُڑتا ہے برعکس اس کے جس شاعر کی فطرت میں ادنیٰ جذبات و خیالات کا دریا موجزن ہوتا ہے اس کے اعلیٰ جذبات و خیالات ریگ تہ نشین کی طرح پامال رہتے ہیں اور اُس کی شاعری سُننے والے کے دل میں بھی ادنیٰ جذبات برانگیختہ کرتی ہے - اِس معیار کو پیش نظر رکھ کر اگر ہم داغ کے کمال کا اندازہ کریں تو یہ روشن ہو جاتا ہے کہ داغ کی شاعری اُن جذبات و خیالات کی تصویر ہے، جن سے فطرتِ انسانی کا حیوانی حصّہ مراد لیا جاتا ہے - اُردو شاعری عموماً عاشقانہ شاعری کہلاتی ہے - اور ایسا کہنا ایک حدتک صحیح بھی ہے - کیونکہ اُردو شعرا نے عموماً حُسن و عشق کی تصویریں اپنے جادو کار قلم سے کھینچی ہیں - مگر جو اعلیٰ درجے کے اُردو شاعر ہیں اُنہوں نے حُسن کو محض بازاری حُسن نہیں سمجھا ہے اور عشق کو محض جذبۂ حیوانی نہیں خیال کیا ہے - برعکس اُس کے داغ کا معشوق ہمیشہ بازاری معشوق ہے - اور داغ کے نزدیک عشق نفس پرستی کا دوسرا نام ہے - اِس صورت میں داغ کی شاعری کو عاشقانہ شاعری کہنا زیبا نہیں ہے کیونکہ داغ حُسن و عشق کے اعلیٰ مفہوم سے بیخبر تھے - داغ کی شاعری عیاشانہ شاعری ہے - جو عاشقانہ شاعری کے مقابلے میں ادنےٰ درجے کی شاعری ہے - داغ کے اشعار سے وہ جذبات عالیہ جوش میں نہیں آتے جن کا تعلق حسن و عشق کے اعلیٰ مفہوم سے ہے - بلکہ اُن کا کلام اُن خواہشاتِ نفسانی کو برانگیختہ کرتا ہے جو محض جذباتِ حیوانی سے وابستہ ہیں - اعلیٰ درجے کے اُردو

شعرا نے بھی اکثر حُسن و عشق کے اعلیٰ مفہوم سے قطع نظر کر کے داغ کے رنگ کے شعر کہے ہیں مگر یہ اُن کا رنگ خاص نہیں ہے۔ جب اُن کا طائرِ خیال اپنی قدرتی پرواز کے جوہر دکھاتا ہے تو اُس عالم کی خبر لاتا ہے، جہاں بازاری حُسن و عشق کا بازار سرد نظر آتا ہے۔ تمثیلاً آتش و ذوق کے کلام سے چند اشعار ذیل میں درج ہیں۔ دیکھو ان اعلیٰ درجے کے شعرا کے حُسن و عشق کا مفہوم کتنا عالی ہے۔

آتش

چشمِ نامحرم کو برقِ حُسن کر دیتی تھی بند
دامنِ عصمت ترا آلودگی سے پاک تھا

حقیقت ہم سے پوچھے کوئی اس عشقِ مجازی کی
بہت دیکھا ہے تصویرِ گلی کے رنگ و روغن کو

شیرین زبان ہوئی ہو فرہاد کے دہن میں
لیلیٰ پکارتی ہے مجنون کے پیرہن میں

صحرائے تن کی سیر تو مجنون ذرا کرے
محمل سوار ہے اسی گرد و غبار میں

جو نعمت عشق کی چاہے تو راحت جان ایذا کو
عصا سمجھے پا پہلے چلا یا دستِ سستی کو

کیفیت اُسے ملتی ہے جو جس کے مقدر میں
مئے الفت نہ خم میں ہے نہ شیشے میں نہ ساغر میں

محبت کی نگہ سے لطف ہر اک گام میں پایا
تماشا تھا جو دیکھا چشمِ بلبل سے گلستان کو

تکلف سے بری ہے حُسنِ ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

جذبِ بلبل میں اثر ہو تو قفس میں آتش
بوئے گل پھاند کے دیوارِ گلستان آئے

ذوق

بنا ایسے صاحبِ عصمت پری پیکر کا عاشق ہوں
نمازیں پڑھتی ہیں حوریں ہمیشہ جس کے دامن پر

سینے میں بوالہوس کے بھی تھا آبلہ مگر
نشتر کا نام سنتے ہی منہ زرد ہو گیا

پروانہ بھی تھا گرم تپش پر کھلا نہ راز
بلبل کی تنگ حوصلگی تھی کہ غل ہوا

سینۂ چرخ میں ہر اختر اگر دل ہے تو کیا
ایک دل ہوتا مگر درد کے قابل ہوتا

مزے دل کے لئے تھے تھے زبان کے لئے
سو ہم نے دل میں مزے سوزش نہاں کے لئے

وہ دل کہ جس میں سوز محبت ہے بند ذوق
بہتر ہو اس سے سنگ کہ اُس میں شرر تو ہے

اسی طرح میر و سودا اور غالب وغیرہ کے یہاں اس رنگ کے شعر مل جائیں گے لیکن داغ کے کلام میں اس رنگ کا شعر مشکل سے ملیگا۔ اُن کے عشق و حسن کا جو مفہوم ہے وہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے۔

داغ

عشق کیا شوق دیدہ شوق کہ دل میں شوق وصل
خون ہو کر آ گیا غم بن گیا ستم ہو گیا

تم کہتے ہو معشوق اطاعت نہیں کرتے
عاشق بھی تو معشوق کے نوکر نہیں ہوتے

یوں تو معشوق گل و شمع بھی کہلاتے ہیں
دیکھنا یہ ہے کہ مرتا ہے زمانہ کس پر

الٰہی تو نے حسینوں کو کیوں کیا پیدا
کچھ ان کی ذات سے دُنیا کا انتظام نہیں

شوخی سے دیکھنا ابھی آتا نہیں انہیں
غرفے سے دیکھ لیتے ہیں بازار کی طرف

نہ دلاسا نہ تسلی نہ تشفی نہ وفا
دوستی اُس بتِ بدخو سے نباہیں کیونکر

وہ شرمائی ہوئی آنکھیں وہ گھبرائی ہوئی باتیں
نکل کر گھر سے وہ گھبرانا ترا امیدواروں میں

ہائے کہنا وہ کسی بت کا دمِ نظارہ
آنکھ بھر کر ہمیں دیکھے تو بس اندھا ہو جائے

وعدے پہ مرے اُنکے قیامت کی ہے تکرار — اور بات ہے اتنی کہ اِدھر کل ہے اُدھر آج

کوئی بھی مجھ سے شبِ عذر یہ نہیں کہتا — اُٹھو چلو کہیں جلدی وہ راہ دیکھتے ہیں

داغ یہ بات وہ سُن لے تو غضب ٹوٹ پڑے — کہتے پھرتے ہو بُلایا ہو سرِ شام مجھے

یہی اقرار، یہی قول، یہی وعدہ تھا — او دغا باز، فسون ساز مکرنے والے

ان تمام اشعار میں داغ کا مفہوم حسن و عشق بہت ہی ادنیٰ ہے۔ یہ بھی کہہ دینا مناسب ہے کہ اس مقام پر سوائے دو تین شعروں کے تمام شعر "گلزار داغ" سے لکھے گئے ہیں جس کی تصنیف کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب کہ داغ کے کمال کا آفتاب نصف النہار تک پہونچ گیا تھا۔ ورنہ "مہتاب داغ" میں داغ کا مذاق سخن حد سے زیادہ عیاشانہ ہو گیا ہے۔ مثلاً اس میں اس قسم کے شعر ملیں گے۔

لطف ہے میں بھی شبِ وصل کہیں چھپ رہتا — آدمی ان کا مری دوڑ میں گھر گھر پھرتا

شاید اس سے بڑھ کر معشوق کا غلط مفہوم کسی اردو شاعر کے کلام میں کم ملیگا۔ مہتاب داغ سے داغ کے کمال کا اندازہ کرنا انصاف سے بعید ہے۔ کیونکہ مہتاب داغ اس وقت کی تصنیف ہے جب کہ عمر کے ساتھ داغ کے کمال شاعری پر بھی زوال آ چکا تھا۔

علاوہ بریں اسی وجہ سے کے اردو شعراء کا یہ دستور رہا ہے کہ ان کا طائر فکر حسن و عشق کے محدود قفس سے نکل کر اُن وجدانی جذبات و خیالات عالی کے جستجو میں اکثر گرم سیر رہا ہے۔ جہاں نفس پرستی اور عیش پسندی کا پرند پر نہیں مار سکتا۔ مثلاً آتش و ذوق وغیرہ نے بے ثباتی دنیا، توکل عجز و نیاز، بلند نظری، عالی حوصلگی، قناعت، درد دل، سوز و گداز، تصوف وغیرہ کے مضامین شاعرانہ لطافت کے ساتھ نظم کئے ہیں۔ یا اکثر مناظر قدرت کو مصنف مصور کی نگاہ سے نہیں دیکھا ہے

بلکہ اُن کی باریک بین نظر کو صفحۂ ہستی کے ہر نقش و نگار کے پردے مین ایک روحانی کیفیت کا جلوہ دکھائی دیا ہے جس کو انھون نے شاعرانہ نزاکت کے سانچے مین ڈھال دیا ہے۔ اِس بات پر مشاہدۂ قدرت کرنا وہ اعلیٰ درجے کا شاعرانہ جوہر ہے جس پر دُنیا کے بڑے بڑے شاعر ناز کرتے ہوئے چلے گئے ہین۔ اِس رنگ کے کلام کا نمونہ بھی ہدیۂ ناظرین ہے۔

آتش

دور دورہ ہے لطف عیش و نشاط دُنیا — لوٹے شب عروسی یہان ہر پیر و جوان مین
مسافر جو نظر آیا نظر آیا جو دُنیا مین — جسے دیکھا اُسے آلودۂ گرد سفر دیکھا
باغ عالم مین رہا فہمید کو بے برگی کا غم — بے ثمر تھے اس چمن سے زرد صورت لے گئے
عالم اسباب سے حاصل ہوا آخر کفن — آسمان سے مرتے مرتے ہم بھی خلعت لے گئے
نعمت فقر و موجود ہے رغبت ہو — آب شیرین ہے جو نان نمکین تھوڑی سی ہی
ادب اے ذرۂ بے پر ایک فرد اپنے وادی کا — نہین ممکن کہ گرد اڑ کر پہونچے ہر کے دامن تک
محل او کلاہ جھکا کے چل نہ فقیرون کو — پیادہ ہو کے قدم یان سوار رکھتا ہے
طلب دُنیا کی کر کے زن مریدی ہو نہین سکتی — خیال آبروئے ہمت مردانہ آتا ہے
نہ جب تک ساہم پیالہ ہو کوئی دیتے نہین پیالہ — نہین مہمان تو فاقہ ہو خلیل اللہ کے گھر سے
دست یاران وطن سے نہین کچھ درکار — دب مرو نگاہ مین کہین گنبد بیابان کے تلے
باغ جہان مین گل کی قناعت چاہیے شاہ — عمر دو روزہ ایک قبا مین تمام کی
تیرہ بختی کے اثر نے شام سے محمل کر دیا — صبح کو گوشے اٹھا کر شمع تربت لے گئے

موت مانگو تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

مطلب یہ سرنوشت کا سمجھا تو شکر کر
دیوانہ ہو جو حال قضا و قدر کھلے

کعبہ کو دیر میں وہ خانہ برانداز کہاں
گردش کافر و دیندار لئے پھرتی ہے

بتخانہ کھود ڈالئے مسجد کو ڈھائیے
دل کو نہ توڑیے یہ خدا کا مقام ہے

پشت بر دیوار حیرت ہیں ہزاروں صورتیں
صاحب آئینہ خانہ آج تک روپوش ہے

اے موج بے لحاظ سمجھ کر مٹائیو
دریا بھی ہے اسیر طلسم حباب کا

نہیں کچھ دفتر گل ہی میں لکھی سرنوشت اسکی
شہادت نامہ بلبل ہی ہو ہر پتا گلستان کا

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

صحرا کو بھی نہ پایا بغض و حسد سے خالی
کیا کیا جلا ہے سا کھو پھولا جو ڈھاک بن میں

ہوا ہے قحط کیوں عالم میں موسیٰ و تجلی کا
وہی پتھر نظر آتے ہیں اب تک کوہساروں میں

اثر رکھتی ہے مے گلگوں کی کیفیت کی مستی سے
ابھرے زمیں میں حباب بحر کے اک جوش مستی سے

خدا دراز کرے عمر چرخ نیلی کی
یہ بیکسوں کے مزاروں کا شامیانہ ہوا

ذوق

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

بند آنکھیں کیے جاتا ہے کدھر کو، کہ تجھے
ہے ترا نقش قدم چشم نمائی کرتا

ہنسی کے ساتھ یہاں رونا ہے مثل قلقل مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدر وسعت
تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے

ہم رونے پر آجائین تو دریا ہی بہادین / شبنم کی طرح سے ہمین رونا نہین آتا

پتنگے سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی / جب قصد خون کو آئے تو پہلے پکار دے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہین کہ مرجائینگے / مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

کھل کے گل کچھ تو بہار جانفزا دکھلا گئے / حسرت ان غنچون پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

افسردہ دل کے واسطے کیا چاندنی کا لطف / لپٹا پڑا ہے مردہ سا گویا کفن کے ساتھ

آتی ہے صدائے جرس ناقۂ لیلےٰ / صد حیف کہ مجنون کا قدم اٹھ نہین سکتا

اس گلستان جہان مین کیا گل عشرت نہین / سیر کے قابل ہے لیکن سیر کی فرصت نہین

جو یہ سمجھتے کہ چن چن کے ہم کو توڑین گے / تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

رنگین سواے اسکے گل نو بہار سے / اگا جو برگ زرد کوئی اس چمن مین ہے

نہین گوش شنوا باغ جہان مین غافل / ورنہ ہر برگ ہے یان نغمہ سرائی کرتا

گندم ہو سینہ چاک فراق بہشت مین / آدم کو کیا نہ ہوگی محبت وطن کے ساتھ

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات / ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے

کب لباس ظاہری مین چھپتے ہین روشن ضمیر / پردۂ فانوس مین بھی شعلہ عریان ہی رہا

داغ کے کلام مین ایسے جذبات روحانی اور خیالات عالی کا پتا نہ ملیگا۔ نہ اس رنگ کی مشاہدۂ قدرت کی تصویرین نظر آئین گی۔ بیشک داغ پر کہین کہین ذوق کا سایہ پڑ گیا ہے۔ اور دو چار شعر بیکسی و یاس کے رنگ مین قلم سے نکل گئے ہین۔ مثلاً داغ کہتے ہین۔

اے آرزو ہی تازہ نہ کر مجھ سے چھیڑ چھاڑ / مین ہاے شوق و دست تمنا بریدہ ہون

لامکان میں بھی تو کچھ جلوہ نظر آتا ہے
بیکسی میں تو اُدھر ہوں کہ جدھر کچھ بھی نہیں

دل کی کلی نہ تجھ سے کبھی اے صبا کھلی
چمپا کھلا گلاب کھلا موتیا کھلی

خدا کرے نہ کسی کو امید وارِ وصال
دُعائیں مانگتے ہیں ترک مُدعا کے لئے

مگر ایسے شعروں کی تعداد داغ کے کلام میں بہت کم ہے یا نہ ہونے کے برابر ہے۔ عموماً اس شوخ طبع شاعر کا کلام ہجر و وصل اور کنگھی چوٹی کے مضامین کا ذخیرہ ہے۔ واقعی سچ کہا ہے

وہی جھگڑا ہے فرقت کا وہی قصہ ہو وصلت کا
تجھے اے داغ کوئی اور بھی افسانہ آتا ہے

پس جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے۔ داغ کی شاعری کے لئے سب سے موزوں لقب "عیاشانہ شاعری ہے"۔ اکثر حضرات فرماتے ہیں کہ داغ کا کلام دل میں چٹکی لیتا ہے یہ بات آتش و ذوق و غالب وغیرہ کو نصیب نہیں۔ مگر ان حضرات کو یہ خیال کر لینا چاہیئے کہ داغ کا کلام کس قسم کی "چٹکی" لیتا ہے یعنی کس قسم کی تاثیر پیدا کرتا ہے۔ اگر کوئی حسین و حیا پرور صورت نظر آئے یا کسی شاداب چمن یا دل فریب منظر کی سیر نصیب ہو تو انسان کے دل کو ایک روحانی سرور حاصل ہوتا ہے۔ اس کا نام بھی تاثیر ہے۔ اور میں کہوں گا۔ کہ ذوق و آتش وغیرہ کی شاعری اسی قسم کی تاثیر سے مالامال ہے۔ برعکس اس کے اگر کوئی حیا باختہ عورت بانکا دوپٹا اوڑھ کر سامنے سے نکل جائے تب بھی دل میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کو بھی تاثیر کہیں گے۔ داغ کا کلام سُننے سے اسی قسم کی تاثیر دل میں پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ذوق کا شعر ہے۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کروبیان کچھ کم نہ تھے

ذوق کا یہ خیال کہ انسان دردِ دل کے واسطے پیدا ہوا ہے یعنی غیرون سے ہمدردی کرنے کے لئے، نہ کہ محض اپنے بھلے کے لئے عبادت کرنے کو۔ یہ وہ پاکیزہ خیال ہے جس کو تہذیبِ انسانی کا معیار سمجھنا چاہیئے۔ اور چونکہ یہ خیال اِس شعر مین شاعرانہ لطافت کے ساتھ نظم کیا گیا ہے لہذا اس کے پڑھنے سے یا سُننے سے بلند ہمتی اور ہمدردی کے جذباتِ عالی جوش مین آتے ہین۔ داغ نے بھی اسی طرز کا ایک شعر کہا ہے۔ ؎

پندِ واعظ سنتے سنتے کان اپنے بھر گئے
کیا عبادت کو ہمین ہین سب فرشتے مر گئے

اِس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ ہم کیون عبادت کرنے لگے یہ کام فرشتون کا ہے۔ اندازِ بیان مین ایک ظریفانہ شوخی ہے جو دل مین چٹکی ضرور لیتی ہے، مگر کسی جذبۂ عالی کو جوش مین نہین لاتی وہ بات کہان۔ ع ''دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو''

اسی طرح اکثر حضرات داغ کی زبردست شہرت سے یہ نتیجہ نکالتے ہین کہ داغ کی شاعری بھی اعلیٰ درجے کی شاعری ہے چنانچہ کہتے ہین کہ داغ کے شعر آج ہندوستان مین بچے بچے کی زبان پر ہین۔ آتش و ذوق و غالب وغیرہ کو بھی ایسی شہرت حاصل نہوئی۔ بیشک داغ کی شہرت سے کوئی انکار نہین کر سکتا۔ لیکن امر غور طلب ہے کہ محض شہرت کو اصلی قابلیت کا معیار سمجھنا ہرگز جائز نہین ہے۔

داغ کی یہ شہرت محض اس لئے ہے کہ اُن کا کلام عموماً اُن جذبات اور خواہشاتِ نفسانی کی تصویر ہے جو عوام کے دل مین اُمنگ پیدا کرنے کے لئے جادو کا اثر رکھتی ہین۔ برعکس اس کے

آتش و ذوق و غالب وغیرہ کے کلام کی قدر کرنے اور سمجھنے کے لئے ایک قسم کی شاعرانہ تربیت اور مذاق کی شائستگی درکار ہے۔ عوام الناس کی فطرت مین چونکہ جذبات روحانی اور خیالاتِ عالی خس پوش پھولون کی طرح خواہشات نفسانی اور ادنے جذبات سے دبے رہتے ہین اور چونکہ علم سے اُن کے آئینۂ فہم کو جلا نہین ہوتی لہذا وہ آتش اور غالب وغیرہ کی بلند پروازی کی داد نہین دے سکتے۔ اُن اعلیٰ درجے کے شعرا کی وقعت ترتیب یافتہ طبقون تک لازمی طور سے محدود ہے مثلاً داغ کا شعر ہے۔ ؎

ہائے کہتا وہ کسی بُت کا دمِ نظّارہ ۔ آنکھ بھر کر ہمین دیکھے تو بس اندھا ہو جائے

ہر بازاری شخص کو یہ شعر اسی قسم کا کوئی نہ کوئی گذشتہ تجربہ یاد دلا دیگا۔ اور اِس لئے وہ اس کو سُن کر تڑپ جائیگا لیکن اگر اسی شخص کے سامنے آتش کا ذیل کا شعر پڑھ دیا جائے۔ ؎

چشمِ نامحرم کو برقِ حُسن کر دیتی تھی بند ۔ دامنِ عصمت ترا آلودگی سے پاک تھا

تو اُس کو خاک لطف حاصل نہ ہوگا کیونکہ جو جذبۂ عالی اِس شعر کے پڑھنے سے جوش مین آسکتا ہے وہ شخص مذکور کے دل مین مُردہ حیثیت مین ہے۔ اِس شعر کی داد وہی سخن فہم دیگا جس کی طبیعت مین پاکیزگی کا جوہر موجود ہے۔ اور جس کو شاعرانہ ترتیب حاصل ہے۔ داغ کا کلام اُنہین لوگون مین ضرورت سے زیادہ پسند کیا جاتا ہے جو اعلیٰ درجے کی شاعری سے واقف نہین ہین۔ مثلاً ارباب نشاط کا فرقہ داغ کو اپنا پیغمبر سمجھتا ہے۔ اور ایسا ہونا تعجب کی بات نہین ہے کیونکہ عیاشانہ شاعری سے جو جذبات جوش مین آتے ہین اُن کی لذت سے اِس طبقۂ خاص کے برابر کون واقف ہو سکتا ہے پس کسی شاعر کے کلام کا عام فہم ہونا اُس کے کمال شاعری پر دلالت نہین کرتا۔ اکثر شاعر ایسے

ہین جن کو پسند عام کے ساتھ قبول خاص کا شرف بھی حاصل ہے، مگر داغ اس شرف سے محروم ہین - اُن کا کلام جس قدر عام پسند ہے اُس حدتک خاص طبقون مین مقبول نہین -

اکثر بزرگوار یہ بھی کہتے ہین کہ داغ کا سُلجھا ہُوا کلام عموماً استعارون اور تشبیہون کی گتھیون سے پاک ہے، محض سُتھری ستھری ترکیبین ہین اور ہر شعر روزمرہ کی گفتگو کی تصویر ہے - اِن حضرات کے نزدیک کمال شاعری کے معنے یہی ہین - کہ انداز بیان سلیس ہو اور کوئی محاورہ یا چٹکلا روانی کے ساتھ نظم کر دیا جائے - مگر سخن فہم جانتے ہین کہ یہ باتین ادنےٰ قسم کے محاسن شعری مین داخل ہین - شاعری کے جوہرون مین استعارہ و تشبیہ کا پایہ بہت بلند ہے - استعارہ و تشبیہ کی بختگی سے کلام کی تاثیر ہی نہین بڑھ جاتی بلکہ شاعر کی نازک خیالی اور باریک بینی کا بھی پتا چلتا ہے جن دو اشیا مین بادی النظر مین کوئی مشابہت نظر نہین آتی شاعر اُن کا پرتو اپنے آئینۂ خیال مین دیکھتا ہے - اور اس کی باریک بین نگاہ کو اُن اشیا مین معنوی حیثیت سے ایک مناسبت نظر آتی ہے وہ اِس کیفیت کی تصویر الفاظ مین کھینچ دیتا ہے - اِسی کا نام تشبیہ و استعارہ ہے - دیکھو اعلیٰ درجے کے اُردو شاعرون نے اِس رنگ مین کیا نازک خیالی اور باریک بینی کی داد دی ہے - ؎

آتش

کیا پوچھتے ہو حال خزان و بہار کا — اک زخم تھا کہ خشک ہوا اور نم ہُوا
جو کام ہین نہین اندیشۂ آتش اُن کو بدن کا — وہان زخم کاری خندہ زن ہین چشم سوزن پر
خراب مٹی نہ ہو کسی کی کوئی مُردُود دستان ہو — جُدا ہوا شاخ سے جو پتا غبار خاطر ہوا چمن کا
اندامِ روح ہے تنِ خانہ خراب سے — پائے سمند اُلجھا ہوا ہے رکاب سے

نازک خیال اب بھی ہیں موجود اے فلک — خالی رہا نہیں کبھی دریا حباب سے

قیدِ عفت میں ہے وہ محبوبِ عاشق جاں بلب — نزع میں بیمارِ عیسیٰ دامنِ مریم میں ہے

جوشِ جنوں میں دیکھیے پیچھے نہ مڑ کے پھر — رُخ جس طرف کو صحبتِ دریا اُٹھائیے

ذوق

سمجھ یہ دار و رسن تار و سوزن اے منصور — یہ چاک پردہ حقیقت کا ہیں رفو کرتے

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابرِ سیاہ — کہ جیسے جائے کوئی فیل مست لیے زنجیر

نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے — عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جوان کے لئے

بیٹھے بھرے ہوئے ہیں خمِ مے کی طرح سے — پر کیا کریں کہ مُہر ہے لب پر لگی ہوئی

وادیِ ظلمت میں اپنے دخل کب ہے نور کا — پھر اک شعلہ سا ہے وہ بھی چراغِ طور کا

دل کا یہ حال ہے غم سے ترے او مستِ ناز — جیسے مُرجھایا ہوا دانہ کوئی انگور کا

رہے جوں شیشۂ ساعت وہ مکدر دونوں — کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے

دیکھو چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا — آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

ان اشعار کے دیکھنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اعلےٰ درجے کے شعرا نے محض محاورہ یا چٹکلا یا چونچلا نظم کرنے کو معراجِ کمال نہیں تصور کیا ہے۔ بلکہ اپنے لطیف خیالات کے دریائے موجزن کو استعارہ یا تشبیہ کے کوزے میں بند کر کے معجزہ دکھایا ہے۔ داغ کا مذاقِ سخن عموماً محاورے یا چٹکلے نظم کرنے تک محدود ہے۔ اگر کبھی استعارہ یا تشبیہ کی طرف توجہ ہوئی ہے تو محض پامال اور

پیش پا افتادہ تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا ہے۔ مثلاً زلف کو سنبل سے۔ لب کو گلاب کی پتی سے۔ ہلال کو ابرو سے۔ آبلہ کو آنکھ سے تشبیہ دی ہے۔ یا گل کا ہنسنا، شبنم کا رونا، یا سایۂ اُفتادہ ہونا نظم کیا ہے:۔

داغ

سوز و گدازِ عشق کا لذت چشیدہ ہوں　　مانند آبلہ ہمہ تن آبدیدہ ہوں

افتادگی پہ بھی نہ گئی میری جستجو　　گویا زمیں پہ سایۂ مرغ پریدہ ہوں

ابتدائے رمضاں میں ہو مہ عید کی دھوم　　کسی کافر نے دکھایا نہ ہو ابرو اپنا

اِس قسم کی تشبیہوں اور استعاروں سے اِس امر کا ثبوت نہیں ملتا کہ شاعر میں نازک خیالی اور باریک بینی کا مادّہ غیر معمولی طور سے موجود ہے۔

اب تک ہم نے محض جذبات و خیالات وغیرہ کی لطافت، طبیعت کی بلند پروازی، نازک خیالی اور باریک بینی وغیرہ کے لحاظ سے داغ کی شاعری پر بحث کی ہے۔ اور اس امر کا اندازہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ یہ جوہر جو کہ شاعری کے جزوِ اعظم ہیں۔ داغ کے کلام میں بمقابلہ دیگر گرانمایہ شعرائے اُردو کے کس حد تک موجود ہیں۔ اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ داغ کی زبان کا کیا رنگ ہے۔

(زبان مضامین کا لباس ہے۔ اور جیسا کہ لباس و ملبوس میں عموماً ایک تناسب پایا جاتا ہے اسی طرح داغ کی زبان خاص طور پر اُن مضامین کے نظم کرنے کے لئے موزوں ہے جو اس رنگ کی طبیعت کے ساتھ خصوصیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ (داغ کی زبان کی بے تکلفی اور شوخی عیاشانہ مضامین کا حسن دوبالا کر دیتی ہے۔ اور یہ شوخی اور بے تکلفی بھی ضرور ایک حد تک قابل تعریف ہے،

کیونکہ یہ خوبیان بھی ہر کس و ناکس کے حصّے مین نہین آئین لیکن وہ جوہر عالی جو شاعرانہ زبان کی جان ہے داغ کی زبان مین موجود نہین ہے یہ وہ جوہر ہے جو زبان مین الفاظ سے صنّاعی کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ صنّاعی سے میری مراد تصنّع نہین ہے۔ تصنّع اُس تکلّف بے اندکا نام ہے جو قدرتی خوبیون پر پردہ ہو جاتا ہے۔ برعکس اس کے صنّاعی سے کسی شی کے قدرتی محاسن کا عالم دوبالا ہو جاتا ہے۔ جس طرح کوئی عالی دماغ صناع کسی چاندی یا سونے کے ٹکڑے سے نفیس نفیس زیور تیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح اعلیٰ درجے کے شعرا روزمرّہ کی گفتگو کو نازک بندشون اور چست ترکیبون سے آراستہ کر کے اپنی زبان مین ایک عالم تصویر پیدا کر دیتے ہین جس کا حسن تاثیر بیان نہین کیا جا سکتا مگر محسوس ہو سکتا ہے۔ آتش نے اپنے ذیل کے شعر مین اسی کیفیت کا اشارہ کیا ہے۔ ؎

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگون کے کم نہین
شاعری بھی کام ہے آتش مرصّع ساز کا

داغ کی زبان مین اس صنّاعی کو دخل نہین ہے۔ اُنھون نے محاورے اور چٹکلے بجنسہٖ اسی طرح نظم کر دیے ہین جس طرح روزمرّہ کی گفتگو مین بولے جاتے ہین۔ حاصل یہ کہ داغ کی زبان زبان اُردو کا وہ پاک اور نفیس سرچشمہ نہین ہے جو آتش ذوق انیس وغیرہ کے فیضان سخن سے ہندوستان مین جاری ہے اور جس کا ترنم قدردانان سخن کو ہمیشہ وجد مین لاتا رہیگا۔ دیکھو اعلیٰ درجے کی شاعرانہ زبان یہ ہے۔ ؎

آتش

وہی نشو و نمائے سبزہ ہے گورِ غریبان پر
ہوائے چرخ زنگاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

مصوّر کو تری تصویر کا سودا مبارک ہو
مقام گیسوئے مشکین خالِ عنبرین آیا

تراشا تجھکو جس بُت ساز نے ہے بُت قیامت کی — بنایا شیشے سے نازک مزاج سنگ خارا کو
موسم گل کی ہوا کرنے لگی نازبری — سکہ بازارِ جنون کا داغ سودا ہو گیا
چمن مین جاکے پھولے سے ہین خستہ دل کراہا تھا — کیا کی گل سے بلبل حیلۂ دردِ گلو برسون
سبوے غنچہ ہے معمور جام گل لبریز — ٹپک رہی ہے شراب بر نو بہاری سے
آنکھ وہ فتنۂ دوران کسے کھلاتا ہے — شعبدہ جانتے ہین گردش ایام کو ہم
شباب تک نہین پہونچا ہے عالم طفلی — ہنوز حسن جوانی یار راہ مین ہے
بہار لالہ و گل سے لگی ہے آگ گلشن مین — گریبان پھاڑکر چل بیٹھیے صحرا کے دامن مین

اسی طرح اوراعلے درجے کے اُردو شعرا نے اپنی اپنی لیاقت و قابلیت کے مطابق صنائعی کو زبان مین دخل دیا ہے۔

اب داغ کا رنگ زبان ملاحظہ ہو۔

داغ

حضرتِ دل آپ ہین کس دھیان مین — مر گئے لاکھون اسی ارمان مین
دل کی قیمت اک نگہ ہے اے صنم — آگے جو آئے ترے ایمان مین
لطف مے تجھ سے کیا کہون زاہد — ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہین
شب وعدہ گزر گئی آدھی — اب سنا ہے کہ تیل سر مین پڑا
مرحبا او دل و دین لے کے مکرنے والے — ہاتھ کانون پہ مرے نام سے دھرنے والے

داغ کہتے ہین جنھین دیکھیے وہ میٹھے ہین
آپ کی جان سے دور آپ پہ مرنے والے

بتاؤن نام اے دربان سمجھے کیا
یہ کہدے کوئی آیا ہے کہین سے

دل مین سما گئی ہین قیامت کی شوخیان
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ مین

وقت ملنے کا جو پوچھا تو کہا کہدین گے
غیر کا حال جو پوچھا تو کہا کہتے ہین

دیکھا ہی بتکدے مین جب اے شیخ کچھ نہ پوچھ
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

داغ کے نام سے نفرت ہے وہ جل جاتے ہین
ذکر آنے کو تو کمبخت کا اکثر آیا

جس طرح علم الارض کے جاننے والے زمین کے دو طبقون مین وہ فرق محسوس کر لیتے ہین جو معمولی شخص کو نظر نہین آسکتا۔ اسی طرح سخن شناس اس امر کا بخوبی اندازہ کرسکتے ہین کہ داغ کی زبان مین اور آتش کی زبان مین کیا فرق ہے۔ دونون کی زبان مین پاکیزگی اور روانی کے جوہر موجود ہین۔ مگر ایک مین قدرتی سادگی کے علاوہ شاعر کے جادو نگار قلم نے عالم تصویر پیدا کر دیا ہے۔ دوسرے مین محض وہی سادگی اور روانی ہے جو پانی مین ہوتی ہے۔ یا یون کہیے کہ دو آئینے ہین ایک محض شیشے کا ٹکڑا ہے۔ دوسرے مین جلا بھی کر دی گئی ہے۔

اکثر ایسے معمولی مضامین ہین جن کو ہر اُردو شاعر اپنی میراث سمجھتا ہے اور جن کو نظم کرنے مین صرف اسی قدر جدت صرف کرنا پڑتی ہے کہ بندش و ترکیب الفاظ کا لباس نیا ہو۔ دیکھو داغ نے اس قسم کے مضامین کو زبان کا کیسا سادہ لباس پہنایا ہے، اور اُردو کے اعلیٰ درجے کے شعرا نے اِن شاہدانِ معنی کے لیے کیسا نفیس پیراہن تیار کیا ہے۔

داغ	اے داغ بُرا مان نہ کچھ اُسکے کہے کا	معشوق کی گالی سے تو عزّت نہیں جاتی
مومن	دشنام یار طبع حزین پر گران نہین	اے ہمنشین نزاکتِ آواز دیکھنا
داغ	کون تھا مجھ سا تمنائی کہ برسون میرے بعد	قبر پر آ آکے چلائی پکاری آرزو
آتش	برابر جان کے رکھا ہو اُسکو مرتے دم تک	ہماری قبر پر رویا کرے گی آرزو برسون
داغ	جاتے تھے مُنہ چھپائے ہوے میکدے کو ہم	آتے ہوے اُدھر سے کئی پارسا ملے
غالب	کہان میخانے کا دروازہ غالب اور کہان واعظ	پر اتنا جانتے ہین کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے
داغ	دیکھا ہے تم کو آخرِ شب پاس غیر کے	سنتے ہین خواب صبح کا ہوتا ہے کم غلط
غالب	بغل مین غیر کے آج آپ سوتے ہین کہین ورنہ	سبب کیا خواب مین آکر تبسمہاے پنہان کا
داغ	وہ اثر سے مین ڈرا ہون کہ دعائین مانگتا ہون	کہ مری دُعا الٰہی نہ ہو مستجاب ہرگز
مومن	مانگا کرین گے ہم بھی دُعا ہجر یار کی	آخر تو دشمنی ہے اثر کو دُعا کے ساتھ
داغ	بھلا ہو پیر مغان کا ذرا اِنگاہ ملے	فقیر ہین کوئی چھلو خدا کی راہ ملے
آتش	کیا بادۂ گلگون سے سرور کیا دل کو	آباد رکھے داتا ساقی تری محفل کو

اِس طولانی بحث سے ہمارا منشا یہ ہے کہ اہلِ سخن پر ظاہر ہو جائے کہ بلحاظ نوعیت مضامین و نیز بلحاظ حُسن بیان و پاکیزگی زبان داغ اُن اعلیٰ درجے کے اُردو شعرا کے ہمپایہ نہین ہین جن کا شمار نظم اُردو کے دربار کے بالا نشینون مین ہے۔ (ورجو داغ کے رنگ کی خصوصیات ہین۔ مثلاً محاورے یا چٹکلے نظم کرنا۔ استعارہ و تشبیہ سے کم کام لینا۔ عاشق و معشوق کی نوک جھونک کے عیاشانہ مضامین شوخی اور چلبلاہٹ کے ساتھ باندھنا یہ خصوصیات اعلیٰ درجے

کی شاعری کے جوہر نہیں ہیں۔ مختصر یہ کہ داغ کی شاعری بحیثیت مجموعی عیاشانہ شاعری ہے اور عیاشانہ شاعری ادنے درجے کی شاعری خیال کی جاتی ہے۔ آج جبکہ شاعری کا اصلی مفہوم اکثر دلون سے فراموش ہوگیا ہے تو ممکن ہے کہ ایسا کہنا بہت سے حضرات کو ناگوار گذرے لیکن اُردو کے اساتذۂ قدیم بھی عیاشانہ شاعری کو وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ قدما مین میان جرأت اس رنگ کے کہنے والے تھے۔ ان کی نسبت میر تقی میر کا جو خیال تھا وہ ذیل کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے۔

کسی مشاعرے مین ایک دفعہ جرأت نے غزل پڑھی اور غزل بھی وہ ہوئی کہ تعریفون کے غل سے شعر تک سُنائی نہ دیے۔ میان جرأت یا تو اُس جوش سرور مین جو اس حالت مین انسان کو سرشار کر دیتا ہے یا شوخی مزاج سے میر صاحب کے چھیڑنے کے ارادے سے ایک شاگرد کا ہاتھ پکڑ کے اُن کے پاس آکر بیٹھے اور کہا کہ حضرت اگرچہ آپ کے سامنے غزل پڑھنا بے ادبی اور بے حیائی ہے مگر خیر۔ اِس بیہودہ گو نے جو یاوہ گوئی کی وہ آپ نے سماعت فرمائی؟ میر صاحب تیوری چڑھا کر چپکے ہو رہے۔ جرأت نے پھر کہا، میر صاحب کچھ ہون ہان کر کے پھر ٹال گئے۔ جب اُنھون نے بہ تکرار کہا تو میر صاحب نے جو الفاظ فرمائے وہ یہ ہین:-
"کیفیت اِس کی یہ ہے کہ تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ہو، اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو۔" (آبِ حیات)

اِس موقع پر ایک غلط فہمی کا رفع کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یعنی معترض کہہ سکتا ہے کہ آتش و غالب و ذوق وغیرہ کے یہان بھی ایسے شعر ملین گے جو عیاشانہ شاعری کے رنگ مین ڈوبے ہوئے ہین اور جن کی زبان کا رنگ داغ کی زبان سے ملتا ہو۔ مثلاً آتش کہتے ہین۔

ع وصل کی شب رنگ گردون نوع دیگر ہو گیا شام سے یار او رمین جامے سے باہر ہو گیا

یا غالب کہتے ہین:-

وہ ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن ۔۔۔ دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہین

پس ان شعرائے گرانمایہ مین اور داغ مین کیا فرق ہے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ کسی شاعر کے کلام کا اندازہ متفرقات سے نہین کیا جاتا بلکہ اس کے کلام پر ایک جامع اور وسیع نظر ڈالی جاتی ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ بالعموم اس کی طبیعت کا رنگ کیا ہے۔ اور کس قسم کے مضامین نظم کرنے مین اس کو سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ آتش و غالب وغیرہ کے یہان اکثر عیاشانہ مضامین کے شعر ملین گے۔ مگر وہ اِن کی شاعری کے دامن پر داغ خیال کئے جاتے ہین۔ جس رنگ کے اشعار سے اِن کا وقار قائم ہے۔ وہ کسی اور ہی عالم کا اشارہ کرتے ہین۔ اِسی طرح داغ کا ایک شعر اسیر یا ناسخ کے رنگ مین ہے

پانی کی کب گرہ پہ ماہی مین رہ گئی ۔۔۔ رُکتے ہین پیچ و تاب سے بھی تیز رو کہین

اگر دو چار شعر داغ کے کلام مین اس رنگ کے اور نکل آئین تو اُن کی بنیاد پر یہ نہین کہا جا سکتا کہ داغ کے رنگ مین اور ناسخ یا اسیر کے رنگ مین کوئی فرق نہین ہے۔ کیونکہ اِس قسم کے اشعار کی تعداد داغ کے کلام مین بہت ہی محدود ہے اور نیز اِس رنگ کے مضامین کے نظم کرنے مین داغ کو وہ کامیابی نہین حاصل ہوئی جس کا پتا اُن کے عیاشانہ رنگ کے اشعار مین ملتا ہے یعنی وہ بے تکلفی اور شوخی جو داغ کے لئے باعثِ فخر ہے اس طرز کے اشعار مین نظر نہین آتی۔ پس اگر داغ کا اور دیگر اعلیٰ درجے کے اُردو شعرا کا موازنہ منظور ہے تو یہ دیکھو کہ آتش و غالب وغیرہ کے طائرِ فکر کی قدرتی پرواز کیا ہے اور اُن کے اُن اشعار پر غور

کرد جوان کی شہرت کے آسمان پر آفتاب بن کر چمک رہے ہین اور پھر یہ دیکھو کہ داغ کی پرواز فکر کا نقطہ انتہائی کیا ہے اور کس رنگ کے اشعار اس کی شہرت کے لئے طرّہ دستار ہین - اِس روش پہ چلنے سے یہ آئینہ ہو جائیگا کہ (جو عیاّ شانہ مضامین آتش و غالب وغیرہ کے جام سخن مین تلچھٹ کی طرح نظر آتے ہین - داغ کا ساغر فکر انہین سے لبریز ہے - داغ کی شاعری کی زمین وہ زمین ہے جس پر عمارت کا
۲ بام عالی ان کے رفیع الشان قصر سخن کا آستانہ ہے - پس آتش و غالب وغیرہ کے یہان اکثر مقامات پر عیاّ شانہ رنگ کے اشعار کا ہونا بہ حیثیت مجموعی ان اعلیٰ درجے کے شعرا کا وقار نہین گھٹا سکتا - نہ داغ کو ان کا ہمپایہ ثابت کر سکتا ہے)۔

مگر با این ہمہ اِس وقت اِس تیرہ خاکدان ہند مین داغ کے دم کی روشنی غنیمت تھی - اُردو شاعری کا نام اسی کی ذات سے زندہ تھا (گو وہ آتش و غالب و ذوق وغیرہ کا ہمپایہ نہ ہو لیکن اس کے قدرتی طور پر شاعر ہونے مین کوئی شک نہین - اور اس نعمت خداداد کا حاصل ہونا بھی کچھ کم فخر کی بات نہین ہو کہ اس کے کلام کی شوخی مصنوعی شوخی نہین ہے - جو شعر اس کی زبان سے نکلتا ہے تاثیر مین ڈوبا ہوا نکلتا ہے اور اصل یہ ہے کہ اپنے رنگ خاص مین وہ معجزہ دکھا گیا ہے) واقعی کیا خوب کہا ہے -

دل کا کیا حال کہوں صبح کو جب اس بت نے ... لیکے انگڑائی کہا ناز سے ہم جاتے ہین
آتا ہے مجھ کو یاد سوالِ وصال پہ ... کہنا کسی کا ہائے وہ مُنہ پھیر کر نہین
گلے شکوے کہان تک ہو نگے آدھی رات تو گذری ... پریشان تم بھی ہوتے ہو پریشان ہم بھی ہوتے ہین
خبر سُن کر مرے مرنے کی وہ بولے رقیبوں سے ... خدا بخشے بہت سی خوبیان تھین مرنے والے مین

کسی کی نرگس مخمور کچھ کہدے اشارون مین
مزا ہے رات دن چلتی رہے پرہیزگارون مین

غضب ہے دیکھنا اس سادگی پر مرگئے لاکھون
کہا تھا کس نے بن ٹھہین وہ میرے سوگوارون مین

لڑگئی یارِ گلعذار سے آنکھ
اب نہین جھپتی ہزار سے آنکھ

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤن تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

بتاؤن نام لے دربان تجھے کیا
یہ کہدے کوئی آیا ہے کہین سے

زاہد کو بندگی کا نتیجہ تو مل گیا
گردن خمیدہ یادِ الٰہی مین رہ گئی

وصل کا وعدہ اشارون مین کہین ہوتا ہے
مین ترے سر کی قسم کچھ نہ مری جان سمجھا

ہاتھون سے جو بچے تری باتون سے مرگئے
چٹکی مین تیر جو تھا وہ لب پر سخن ہُوا

رازِ دل کوئی کہہ لاکھون مین کیونکر اپنا
داورِ حشر جُدا چاہیے محشر اپنا

زبان سے کر لیا بھی وعدہ تو نے تو یقین کس کو
نگاہین صاف کہتی ہین کہ دیکھو یون مکرتے ہین

رنج وہ رنج ہے جس مین بتون کو بھولین
عیش وہ عیش ہے جس مین نہ خدا یاد رہے

کیسا نظارہ کس کا اشارہ کہان کی بات
سب کچھ ہے اور کچھ نہین نیچی نگاہ مین

بڑا مزا ہے جو محشر مین ہم کرین شکوہ
وہ منتون سے کہین چپ ہو خدا کے لئے

سب سے تم اچھے ہو تم سے مری قسمت اچھی
یہی کمبخت دکھا دیتی ہے صورت اچھی

دیکھنے والون سے انداز کہین چھپتے ہین
ہم کو پردے مین نظر آتی ہے صورت اچھی

آپ محشر مین ہین قول کے سچے کیا خوب
اُنگلیان اُٹھینگی وہ آئے مکرنے والے

اِس رنگ مین اِس سے بڑھ کر کوئی کیا کہیگا۔ داغ کی شاعری کا دائرہ چاہے وسیع نہ ہو
لیکن جو اس کا اندازِ خاص ہے اس پر وہ حاوی ہے اور اپنے بیشۂ سخن کا شیر ہے۔ داغ کے ٧
مقابلہ مین یون تو بہت سے حضرات آستینین چڑھایا کیے لیکن اگر میدانِ سخن مین اِس کا کوئی قابلِ وقعت
مدعی تھا تو وہ لکھنو کا چراغ امیر احمد مینائی تھا۔ گو کہ امیر مرحوم کو داغ کے برابر شہرت نہین حاصل
ہوئی تھی لیکن خاص خاص طبقون مین امیر کا نام ہمیشہ داغ کے مقابلے مین لیا گیا۔ اِس مین
شک نہین کہ امیر کی مشکل پسند طبیعت نے اکثر ایسے جوہر دکھائے جس کی بدولت اِس پہلوانِ سخن کو
زمانہ سے اُستادی کی سند ملی لیکن امیر کی طبیعت کو شاعری سے وہ ازلی مناسبت نہین ہے
جو داغ کا حصّہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ داغ کا مذاقِ سخن اعلیٰ درجے کا نہین ہے لیکن اِس کے
قدرتی طور پر شاعر ہونے مین کلام نہین۔ یا اور بات ہے کہ اِس کی نگاہ بلند بینی کے عوض مائل
بہ پستی ہو۔ اور قدرت کے وسیع میدان سے قطع نظر کرکے ایک خاص دائرے تک محدود رہو۔
مگر اِس سے کوئی انکار نہین کر سکتا کہ یہ نگاہ شاعر کی نگاہ ہے۔ (داغ کے سینے مین شاعری کی
آگ روشن ہے۔ لہذا اس کا کلام گرمیِ تاثیر سے مالا مال ہے۔ امیر کا کلام اِس کیفیت سے
خالی ہے۔ اُن کی شاعری مصنوعی شاعری ہے۔ اُنھون نے شاعری کو مشق کے زور سے حاصل
کیا ہے۔ وہ اصل جوہر شاعری جو قدرتی شاعر اپنے ساتھ لیکر پیدا ہوتا ہے۔ امیر کی طبیعت کا
حصّہ نہین ہے یہی وجہ ہے کہ داغ کے اندازِ کلام مین جو پختگی ہے۔ اُس کا نشان امیر کے طرزِ
سخن مین نہین ملتا۔ داغ کا کلام شروع سے آخر تک اس کی طبیعت کے قدرتی رنگ مین
ڈوبا ہوا ہے۔ اس کا شعر زبانِ حال سے پکار کر کہتا ہے کہ مین داغ کا شعر ہون۔ اِس کا مرتبہ

اعلیٰ درجے کے شعرا کے مقابل مین پست ہو۔ مگر وہ کسی کا مقلد نہین ہے وہ ایک خاص طرز کا مالک ہے۔ جس کو ایک حد تک اسی کا ایجاد سمجھنا چاہیئے۔ آمیر کے ساتھ کسی طرز خاص کو خصوصیت نہین ہے۔ اِن کے دو دیوان ہین، اور دو ورنگ کے۔ مراۃ الغیب مین آمیر و ناسخ کی شاعری کا اُترا ہوا چہرہ نظر آتا ہے۔ اور صنمخانۂ عشق مین قدیمی متانت کو بالاے طاق رکھ کر داغ کی شوخی کا چربہ اُتارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ دوسرے دیوان مین خود فرماتے ہین ؎

پچھلا کلام بھی ہے جو اس مین شریک امیر
دیوان مین ایک رنگ کہین ہے کہین نہین

آمیر کے کلام کی دو ورنگی اِس بات کی شاہد ہے کہ ان کی طبیعت قدرتی طور پر شاعرانہ نہین واقع ہوئی تھی۔ کیونکہ اصلی شاعر اپنی طبیعت کا رنگ نہین بدل سکتا۔ وہ اگر خواب مین بھی شعر کہیگا تو اُسی رنگ مین کہیگا جو قدرت نے اِس کی طبیعت مین ودیعت کیا ہے۔ بیشک ایک آدھ شعر کسی خاص موقع پر خاص حالت مین طبیعت کے قدرتی رنگ کے خلاف موزون ہو سکتا ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی قدرتی شاعر کا کلام ایک ہی سانچے مین ڈھلا ہوا نظر آتا ہے۔ بیشک جس کی شاعری کا دارمدار مصنوعی تکلفات پر ہے وہ اِن تکلفات کا رنگ جب چاہے بدل سکتا ہے۔ داغ نے اکثر معرکہ آرا طرحون پر غزلین کہی ہین۔ گو کہ اساتذہ قدیم کے مقابل مین فروغ نہین حاصل ہوا ہے لیکن جو کچھ کہا ہے اِس مین ایک قسم کی جدّت و تازگی پائی جاتی ہے۔ یہ نہین معلوم ہوتا کہ اِس نے اساتذہ کے خرمن سے خوشہ چینی کی ہے۔ مثلاً گردن مین، آہن مین، ایک قدیمی طرح ہے۔ اِس طرح مین "گردن" کے قافیے کو نظم کیا ہے۔

مگر سب سے الگ۔

لاعلم اسیریٔ عشق کو منظور تھی میرے لڑکپن مین — پنہایا طوقِ منت کے بہانے میری گردن مین
آتش یہ سودائے شہادت ہے ہمارے سر کو اے قاتل — تری تلوار کا دم بھرتی ہے جو رگ ہے گردن مین
صبا بہارِ وصل ہے ہم میکشی کرتے ہین گلشن مین — پڑے ہین ہار پھولون کے ہر اک شیشے کی گردن مین
داغ مزا ہے وصل کی شب اسطرح ہون پیار کی باتین — ہمارا ہاتھ سینے پر تمہارا ہاتھ گردن مین

اسی طرح یاد آیا' فریاد آیا' ایک مشہور طرح ہے۔ اور "یاد آیا" نظم کرنے مین اساتذہ نے بڑی بڑی جدتین دکھائی تھین۔ داغ نے اس طرح مین بھی "یاد آیا" عجب تازگی کے ساتھ نظم کیا ہے۔

آتش رو دیا ابر بہاری جو برستے دیکھا — کرم پیر خرابات مجھے یاد آیا
صبا چشم موسیٰ ہمہ تن بنگیا مین حیرت سے — دیکھا اک بت کا وہ عالم کہ خدا یاد آیا
قلق سچ تو ہے حضرتِ انسان ہین بڑے خود مطلب — جب دیا رنج بتون نے تو خدا یاد آیا
داغ دی مؤذن نے شبِ وصل اذان پچھلی رات — ہاے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا

امیر مرحوم کی طبیعت اس جدت سے خالی تھی بلکہ انھون نے جب اساتذۂ قدیم کی مشہور غزلین غزلون پر کہی ہین تو اکثر انھین کے چراغ سے اپنا چراغ روشن کیا ہے۔ اشعار ذیل تمثیلاً درج ہین۔

قلق ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا — بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا
امیر اُٹھو گلے سے لگا لو مٹے گلہ دل کا — ذرا سی بات مین ہوتا ہے فیصلہ دل کا

قلق — وہ ظلم کرتے ہین ہم پر تو لوگ کہتے ہین — خدا بُرے سے نہ ڈالے معاملہ دل کا

امیر — دم آ کے آنکھون مین اٹکا تو کچھ نہین کھٹکا — اٹک نہ جائے الٰہی معاملہ دل کا

رند — پھر وہی کُنجِ قفس ہے وہی صیّاد کا گھر — چار دن اور ہوا باغ کی کھا لے بلبل

امیر — آخر اک روز خزان ہو گی طلسمی ہے بہار — چار دن رنگ گلستان مین جما لے بلبل

اکثر امیر و داغ دونون نے اساتذہ قدیم کی مشہور غزلون پر غزلین کہی ہین۔ مثلاً ناسخ کی اُس مشہور غزل پر جس کا مطلع ہے

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجران کا — طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے اپنے گریبان کا

دونون کی غزلین موجود ہین۔ امیر نے تقریباً اسی شعر کہے ہین اور تصنع و آورد کا خوب حق ادا کیا ہے لیکن ایک شعر سے تازگی کا رنگ نہین عیان ہوتا۔ بلکہ اکثر اشعار مین ناسخ کے اشعار کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔ مثلاً ناسخ کا شعر ہے۔ ؎

یہ کس خورشید رو کو جذبِ دل نے آج کھینچا ہے — کہ نورِ صبحِ صادق ہے غبار اپنے بیابان کا

امیر کا شعر ہے:۔

ہوا ہے زلف مین اک حور کے سودا یہ چمکا ہو — بیاضِ صبحِ جنت ہے سواد اپنے بیابان کا

داغ نے جو کچھ اس بحر مین کہا ہے اپنے رنگ مین کہا ہے اور جدت کو ہاتھ سے نہین جانے دیا ہے۔ چنانچہ ایک شعر اس کا مشہور بھی ہے۔

کسی کی شرم آلودہ نگاہون مین یہ شوخی ہے — ابھی دیکھا اُسے دیکھا اِدھر تاکا اُدھر جھانکا

اسی طرح اگر اور غزلون کا موازنہ کیا جائے تو ہمارے بیان کی تائید ہو تی جائیگی داغ کی

زبان مین گو کہ شاعرانہ صناعی کو دخل نہین ہے لیکن اسکی زبان روانی اور بے تکلفی سے ضرور معمور ہے میر کی زبان کا رنگ روانی اور بے تکلفی کے لحاظ سے داغ کے مقابل مین پھیکا ہے بلکہ اکثر اشعار مین ایسے مغلق الفاظ بھر دیے ہین جو کانون کو برے معلوم ہوتے ہین - مثلاً ؎

پڑا خط بھی نہ میرے تن پہ میری سخت جانی سے
تفاخر تھا بہت قاتل کو اپنے زور بازو پر

شان پیدا ہوئی ہے عشق مین معشوق کی
جوڑ ہے تیری نزاکت کا نحافت میری

لکھنا ہے مجھ کو دیدۂ گریان کا اپنے حال
جذاب چاہیے کوئی کاغذ کتاب پر

ہے چرخ پہ یہ ایما ابروے ماہ نو کا
کچھ کچھ خمیدگی بھی لازم ہے بانکپن مین

تفوق رکھتی ہو سرگشتگی نخوت فروشی پر
کہین دامن سے ہوتا ہے مقام اونچا گریبان کا

داغ کی زبان سے ایسے الفاظ نظم ہونا دشوار ہین -

بیشک شکوہ الفاظ اور متانت بیان کے لحاظ سے امیر کا پایہ داغ سے عالی ہے - اور جب اِس شکوہ و متانت کے ساتھ امیر کے کلام پر شاعرانہ لطافت کا پرتو بھی پڑ جاتا ہے تو خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے - مثلاً کیا خوب کہا ہے -

جو چہرہ ارغوانی تھا وہی اب زعفرانی ہے
شکن چہرے پر نقش پائے طاوس خزانی ہے

ستا نہ خاطر مظلوم کو ڈرا ے قاتل
پڑے نہ تیغ کبھی جیسے آہ پڑتی ہے

کباب سیخ ہین ہم کروٹین ہر سو بدلتے ہین
جل اُٹھتا ہے جو یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہین

کس شان سے ہم آئے تری جلوہ گاہ مین
مشعل دکھائی برق تجلے نے راہ مین

داغ کی زبان اس شوکت بیان سے خالی ہے -

آخر میں دونوں اُستادوں کا کلام ہم طرح غزلوں سے انتخاب کرکے لکھا جاتا ہے جس سے دونوں کی زبان اور مذاق سخن کا رنگ معلوم ہوتا ہے۔

داغ	عرصۂ حشر میں اللہ کرے گم مجھ کو	اور پھر وہ ڈھونڈتے گھبرائے ہوئے تم مجھ کو
	جب سے آنکھوں میں سمائی ہے وہ کافر نظریں	رات دن اپنی نظر سے ہے توہم مجھ کو
	دیکھتا پیر مغان حضرت واعظ تو نہیں	کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پس خم مجھ کو
امیر	صورت غنچہ کہاں تاب تکلم مجھ کو	منہ کے سو ٹکڑے ہوئے آیا جو تبسم مجھ کو
	حشر میں وجد کناں قبر سے یارب اٹھوں	نفخۂ صور ہو آوازِ ترنم مجھ کو
	میں جو مر جاؤں تو اے پیر مغان کہہ دینا	کھینچ کے ڈال آئیں پس خم مجھ کو
داغ	ساقیا اس میں کھنچی کیا کسی مجذوب کی لاش	کوئی کھینچے لیے جاتا ہے سوئے خم مجھ کو
امیر	مجلس وعظ میں میں مست اگر جا بیٹھوں	کھینچ کے لے جائیں سوئے خم مجھ کو
داغ	یار کا پاس نزاکت دل ناشاد رہے	نالہ رکتا ہوا الٹی ہوئی فریاد رہے
	رنج وہ رنج ہو جس میں ستم ان کو بھولیں	عیش وہ عیش ہو جس میں ستم ایجاد رہے
	عکس رخسار سے بن جائے مصور تصویر	دیکھ کے تجھ کو تو بہزاد نہ بہزاد رہے
امیر	زعفران زار میں بھی گر دل ناشاد رہے	یہی نالہ یہی گریہ یہی فریاد رہے
	قتل بے خنجر و شمشیر جو ہو منظور	اک ذرا آپ کو کھینچے ہوئے جلاد رہے
	اس کی تصویر میں اس درجہ نزاکت کا ہو حشر	موج باقی نہ قلم میں کف بہزاد رہے
داغ	کوئی پہلو تو رہے کہہ کے پلٹ جانے کا	آنکھ سے وہ نہ سہی بات سے ارشاد رہے

امیر — آنکھین مر جانے کو کہتی ہین وہ لب جینے کو — کہئے یہ حکم رہے کہئے وہ ارشاد رہے

داغ — جب تک کسی کی چاہ نہ تھی کیا غرور تھا — میرا ہی دل بغل مین مرے رشکِ حور تھا

واعظ ترے لحاظ سے ہم اُن کے پی گئے — کیا ناگوار ذکر شرابِ طہور تھا

کیون تونے چشمِ لطف سے دیکھا غضب کیا — قربان اُس نگاہ کے جس مین غرور تھا

امیر — موقوف جرم ہی پہ کرم کا ظہور تھا — بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تھا

آیا بڑا مزہ مجھے مجلس مین وعظ کی — واعظ تھا مست ذکرِ شرابِ طہور تھا

نیچی رقیب سے نہ ہوئی آنکھ عمر بھر — جھکتا مین کیا نظر مین تمہارا غرور تھا

داغ — کیون نا اُمیدِ عفو ہون کیا یہ سُنے گا وہ — اس کا نہ بخشنا تری رحمت سے دُور تھا

امیر — میرے عمل تو قابلِ دوزخ ہی تھے، مگر — کرتا نہ وہ جو رحم تو رحمت سے دور تھا

داغ — ہم بوسہ لے کے اُن سے عجب چال کر گئے — یون بخشوا لیا کہ یہ پہلا قصور تھا

امیر — لپٹا مین بوسہ لے کے تو بولے کہ دیکھیے — یہ دوسری خطا ہے وہ پہلا قصور تھا

داغ — مہمان ہے وہ غیرتِ خورشید و قمر آج — دن آج ہے، رات آج ہے، شام آج سحر آج

روکا ہی کیا رشک بٹھایا ہی کیا ضعف — بیتابیِ دل لے ہی گئی غیر کے گھر آج

یہ شوق یہ ارمان یہ حسرت یہ تمنا — کیا ہو مرے قابو مین تم آ جاؤ اگر آج

جب تاب فغان تھی تو تہا تیر کہان تھی. — کیا کیا لبِ خاموش پہ قربان ہے اثر آج

امیر — ہوتا ہی تو ہے فیصلۂ گردن و سر آج — وہ قتل پہ ہین مرگ پہ باندھے ہون کمر آج

گو جاتے ہین آہستہ نزاکت سے وہ لیکن — دَوڑی ہوئی جاتی ہے خوشی غیر کے گھر آج

کس غیرتِ خورشید سے ہوتی ہی لڑائی
اوڑھے ہوے کیون شلم کی کملی ہی سحر آج

مانگی ہی دُعا کس نے آلہی کہ کھُلا ہے
آغوشِ تمنا کی طرح بابِ اثر آج

شوخی سے ٹھہرتی نہین قاتل کی نظر آج
یہ برق بلا دیکھیے گرتی ہے کدھر آج

شوخی سے ہی بیچین وہ بجلی سی نظر آج
کہتی ہے حیا دیکھیے گرتی ہی کدھر آج

وعدے پہ مرے اُنکے قیامت کی ہی تکرار
اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہی اِدھر آج

دیدار طلب تو بھی ہی اور مین بھی ہون اہد
لیکن ترے گھر کل ہی وہ دن اور مرے گھر آج

یون تو پر سون نہ پلاؤن تہ پیون اے زاہد
توبہ کرتے ہی بدل جاتی ہی نیت میری

توبہ کی جان کو کلپی ہے چمکنا بجلی کی
بدلی آتے ہی بدل جاتی ہی نیت میری

کیا فلک ٹوٹ پڑا بعدِ فنا بھی مجھ پر
بیٹھی جاتی ہی دبی جاتی ہی تربت میری

شمع روتی ہی بہت اسکو اُٹھالے کوئی
بیٹھ جائے نہ کہین کچّی ہے تربت میری

شرمیرآنکھ، نگہ بیقرار، چتون شوخ
تم اپنی شکل تو پیدا کرو حیا کے لئے

خدا کی شان جو شوخی سے آشنا ہی تھین
ترس رہی ہین وہی آنکھین اب حیا کے لئے

پوچھتا جائے مرقد سے گزرنے والے
کیا گذرتی ہی تری جان پہ مرنے والے

اک ذرا دیکھ تو کیا کہتے ہین مرنے والے
او غریبون کے مزارون پہ گذرنے والے

روح کس مست کی پیاسی گئی میخانے سے
مے اُڑی جاتی ہی ساقی ترے پیمانے سے

رخصت رز ٹالکی ہی ساقی کسی دیوانے سے
کہ پری بن کے اُڑی جاتی ہی پیمانے سے

زبان سے گر کیا بھی وعدہ تونے تو یقین کس کو
نگاہین صاف کہتی ہین کہ دیکھو یون مکرتے ہین

آمیر — تسلّی خاک ہو وعدون سے اُنکے چتونین اُنکی ۔۔۔ اشارون سے یہ کہتی ہین کہ دیکھو یون مکرتے ہین
داغ — کوئی کہدے کہ تمنے دل لیا پھر دیکھیے کیا کیا ۔۔۔ لپٹتے ہین اکڑتے ہین پلٹتے ہین مکرتے ہین
آمیر — مین کہتا ہون تمہین نے دل لیا میرا تو کہتے ہین ۔۔۔ کہ ہان ہان لے لیا اچھا کیا ہم کب مکرتے ہین
داغ — وہ اور ہین جو پیتے ہین موسم کو دیکھکر ۔۔۔ آتی رہی بہار مین توبہ شکن ہوا
آمیر — واعظ کا تھا لحاظ تو فصلِ خزان تلک ۔۔۔ لو آگئی بہار مین توبہ شکن ہوا
داغ — اِس روے بے نقاب کا جلوہ ہوا نقاب ۔۔۔ نکلی ہے رنگ رنگ سے صورت حجاب کی
آمیر — پردہ چمک ہے اسکے رخِ بے حجاب کی ۔۔۔ حاجت ہے کیا نقاب پر اسکو نقاب کی

ان اشعار سے دونون اُستادون کی طبیعت کے رنگ کے علاوہ اندازِ بیان کا فرق بھی معلوم ہوتا ہے ۔ داغ کی زبان کی قدرتی شوخی اور بے تکلفی آمیر کے مصنوعی تکلفات سے صاف الگ نظر آتی ہے ۔ آمیر نے اکثر داغ کی شوخی کی نقل کی ہے لیکن کامیاب نہین ہوئے ہین ۔

ر داغ کا کلام عموماً شاعری کے ظاہری عیبون سے پاک ہے ۔ اور اُن کا ضروریات شعر سے باخبر ہونا ثابت کرتا ہے لیکن حریفون نے اعتراضات کی فکرین وقت کے دفتر سیاہ کر ڈالے ہین ۔ عموماً اعتراضات زبان پر ہین کہ فلان محاورہ غلط نظم کیا ہے ۔ یا فلان بندش غیر فصیح ہے اس زمانے مین جب کہ کمال شاعری کا دارمدار محض صحت زبان پر سمجھا جاتا ہے ۔ اس صورت مین اگر داغ کے مٹانے کی فکر مین اس کی زبان پر اعتراض کئے گئے تو زیادہ تعجب نہین ہے لیکن قابل افسوس یہ بات ہے کہ ان اعتراضات کے پھیر مین داغ پر ایسے ذاتی حملے کیے گئے ہین

جن کا شاعری سے کوئی تعلق نہین اور جو بالکل مذاق سلیم کے معیار سے گرے ہوے ہین مثلاً داغ کے نجیب الطرفین ہونے مین شک ظاہر کیا گیا ہے چاہے علم تاریخ کے لئے ایسے واقعات کی تشریح ضروری ہو۔ لیکن ادبی مباحثون کا دامن ایسے گندہ مضامین سے آلودہ کرنا تہذیب کو خاک مین ملانا ہے۔

ہم کو داغ کی شاعری سے غرض ہے نہ کہ اُس کے اعزاز خاندانی سے۔

بندۂ عشق شدی ترک نسب کُن جامی

کہ درین راہ فلان ابن فلان چیزی نیست

اِس رُسوائی کے لئے وہ حضرات بھی ایک حد تک ذمہ دار ہین جو داغ کے کمال کو فروغ بیجا دینا اپنا فخر سمجھتے ہین۔ اِن حضرات نے محض یہی بات ثابت کرنے کی کوشش نہین کی ہے کہ داغ کا سا شاعر ہندوستان مین کم پیدا ہوا بلکہ داغ کی ذات کو تمام فضائل انسانی کا مجموعہ بتایا ہے۔ خاندانی اعزاز۔ اخلاقی فضیلت حُسن صورت کے لحاظ سے داغ کی بہت کچھ مدحت سرائی کی ہے۔ علاوہ اِس کے فنون سپہگری۔ رمل۔ جفر۔ نجوم اور دیگر علوم عقلی و نقلی کی ہوا مین بھی داغ کو تحسین و ستایش کے پر لگا کر اُڑانا چاہا ہے۔ اگر اسی پر اکتفا کیا جائے تب بھی غنیمت تھا لیکن قیامت تو یہ ہے کہ اِس فانوس خیالی کے تیار کرنے کی فکر مین اکثر شعرائے لکھنؤ کے مٹانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بھلا لکھنؤ کے آتش مزاجون کو اس کی تاب کہان۔ وہ پہلے ہی داغ کی گرم بازاری سے داغ کھائے ہوے بیٹھے تھے۔ اس اشتعال نے دبی ہوئی آگ کو اچھی طرح سے مشتعل کر دیا۔ پھر جو اہل لکھنؤ کی جانب سے اعتراضات کی بوچھار ہوئی

ہے۔ تو کوئی اُس کی انتہا ہی نہ تھی۔ اور داغ کے مداحون نے ان اعتراضات کے جواب مین جو جو زبان درازیان کین وہ بھی اپنے رنگ مین جواب نہین رکھتین بس بعینہ یہی کیفیت تھی۔

تو گوئی خروسانِ شاطر بہ جنگ

درافتادہ باہم بہ منقار و چنگ

غرضکہ ہر دو جانب سے خوب خوب زہر اُگلا گیا۔ افسوس ہے تو اس قدر، کہ اس تلخ گفتاری سے سوائے اس کے کہ اُردو زبان کے شیرین چشمے کی لطافت مین فرق آ گیا۔ اور کچھ نہ حاصل ہوا۔ اب ذرا ان مباحثون کا رنگ ملاحظہ ہو۔

اکثر داغ کے شاگرد اپنے اُستاد کو اتقا اور پرہیزگاری کا خلعت پنہاتے ہین۔ یعنی داغ کو باکمال شاعر ہی نہین بتلاتے ہین بلکہ عابد روشن ضمیر بھی کہتے ہین۔ حریف ایسے موقع پر کب چوکتے ہین وہ داغ اور حجاب[1] کے عشق کا پردہ اچھی طرح سے فاش کرتے ہین۔ کل داستان رُسوائی نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہین۔ اور اکثر موقعون پر تصرف بھی کرتے جاتے ہین۔ اور جہان تک سُنا گیا ہے مرزا داغ ایک عاشق مزاج اور عیاش طبع شخص تھے۔ اُنھون نے حجاب کے عشق کی داستان "فریاد داغ" مین نظم کی ہے۔ اور اپنی غزلون مین بھی کبھی کبھی اس قسم کے اشارے کئے ہین۔ مثلاً کہتے ہین۔ ؎

اور پردہ تم جلاؤ جلاؤن نہ مین تمھین میرا بھی نام داغ ہے گر تم حجاب ہو

علاوہ اس کے عیش پرستی کے اور بھی بہت سے سامان موجود تھے۔ اور انہین

---

[1] حجاب ایک کلکتہ کی طوائف کا تخلص ہے۔

بے اعتدالیوں کا نتیجہ تھا کہ داغ کا کمال بھی شباب کے ساتھ مٹ گیا مگر اکثر قدردانان داغ ان واقعات پر خاک ڈال کر زمانے بھر کو بیوقوف بنانا چاہتے ہین۔

اسی طرح داغ کے حُسن سخن کے قدردان اِن کے حُسن صورت کو بھی اپنی تعریف سے جلا دیتے ہین اور کہتے ہین کہ وہ شباب مین خوش رو اور خوش رنگ جوان ہونگے۔ معترض کہتے ہین کہ داغ کی بدصورتی ضرب المثل ہے اور سند مین یہ مصرع داغ کا پیش کرتے ہین۔ ع "جسے داغ کہتے ہین دوستو اسی روسیاہ کا نام ہے"

خیر خواہانِ داغ کہتے ہین کہ رامپور مین جو قدر داغ کی ہوئی وہ کسی کی نہ ہوئی۔ مخالفین اس دعوے کی اس طرح تردید کرتے ہین کہ رامپور مین داغ پچاس روپیہ ماہوار پر داروغہ اصطبل مقرر ہوے تھے چنانچہ اس واقعے کی تائید مین کسی دریدہ دہن گستاخ شخص کا یہ شعر پیش کرتے ہین۔

آیا دلّی سے اک نیا مشکی
آتے ہی اصطبل مین داغ ہوا

مُریدانِ داغ کہتے ہین کہ رامپور کے مشاعرون مین جب داغ غزل پڑھ چکتے تھے تو آدھے لوگ اُٹھ جاتے تھے۔ اور مشاعرہ برخاست ہونے پر حضرت اسیر مینائی سے آکر باہر آڑ مین کھڑے ہو جاتے تھے، اور یہ دیکھتے تھے کہ زبان پر کس کا شعر ہے۔ تو اکثر داغ ہی کا شعر زبان زد پاتے تھے۔ حریف اس کا جواب یہ دیتے ہین کہ "گلزار داغ" جو داغ کی شہرت کا باعث ہے اُن کی تصنیف ہی نہین ہے۔ اس کا بہترین حصہ حضرت ذوق کے زور فکر کا نتیجہ ہے جو اُنہون نے صاحب عالم مرزا فصیح الملک بہادر کے واسطے کہا تھا۔ اور یہ بھی کہتے ہین کہ دیوان امیر و اسیر کی اصلاح کی بدولت اس قدر مقبول ہے۔ داغ کی زبان پر بھی جو اعتراض کئے ہین۔ ان مین بھی عموماً اسی قدر مبالغہ سے کام لیا

گیا ہے۔جس قدر مبالغہ مرحوم کے شاگردون نے اپنے اُستاد کے کلام کو فروغ دینے مین صرف لیا ہے۔مثلاً داغ کا ایک مصرع ہے۔ ع

بیقراری ٹھہر گئی دل مین

اس پر اعتراض ہے کہ بیقراری کے لئے کہنا کہ "ٹھہر گئی" غلط ہے۔کیونکہ بیقراری تو خود اُس کیفیت کا نام ہے جو ٹھہرنے کے برعکس ہے۔مگر ایسا کہنا انصاف سے خالی ہے داغ نے اِس موقع پر ٹھہرنا سکون کے معنون مین نہین استعمال کیا ہے بلکہ "جاگزین ہونے" کے معنون مین بیشک "ٹھہر گئی" کے دو معنے ہونے سے شعر مین ایک قسم کی شاعرانہ لطافت پیدا ہو گئی ہے چنانچہ میر حسن نے بھی اِسی طرز کا ایک شعر کہا ہے۔ ؎

ٹھہرنے لگا جان مین اضطراب		لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب

یا داغ کا ایک شعر ہے۔ ؎

خارِ حسرت بیان سے نکلا		دل کا کانٹا زبان سے نکلا

اعتراض ہے کہ "دل کا کانٹا" خلاف محاورہ ہے۔اِس اعتراض کا جواب داغ نے ایک خط مین کسی دوست کو لکھا ہے۔ وہ خط درج ذیل ہے۔

مورخہ ۸ ربیع الثانی ۱۳۱۸ھ یوم یکشنبہ

جناب من سلمہ اللہ تعالیٰ۔

آپ کا کارڈ جواب مین آیا۔حسادِ نافہم سے بحث نہین۔ ان کا جواب خاموشی ہے ور آج تک جتنے اعتراضات میرے کلام پر ہوئے اُن کو مین نے ہیچ سمجھا۔مگر آپ کے

اطمینان کے واسطے دو حرف لکھے دیتا ہون ۔ ؎

خار حسرت بیان سے نکلا　　　دل کا کانٹا زبان سے نکلا

یہ کانٹا دل کی پھانس کی جگہ نہین ہے بلکہ خار حسرت سے بنایا گیا ہے۔ اِس سے محاورے سے بحث نہین ہے۔ زیادہ نیاز۔

فصیح الملک داغ دہلوی

ہمارے خیال مین جواب نہایت معقول ہے۔ عموماً تمام اعتراض کا یہی رنگ ہے اِس موقع پر یہ لکھنا ضروری ہے کہ اِن اعتراضات کی بحث مین دونون جانب سے وہی لوگ شریک تھے جن کی طبیعتین جادۂ اعتدال سے ہٹی ہوئی تھین۔ دہلی اور لکھنؤ کے منصف مزاج نقادانِ سخن کو ہنگامہ آرائیون سے کچھ مطلب نہ تھا۔ چنانچہ منشی امیر احمد صاحب مینائی جو واقعی بزم سخن مین داغ کے رقیب تھے اِن اعتراضات کی نسبت خود داغ کو تحریر فرماتے ہین ۔

میرے پرانے یار غمگسار حضرتِ داغ سلامت

خدا روز بروز آپ کے اعزاز کو بڑھائے اور اس فن کو چمکائے۔ مُلک کو آپ کی قدر ہو، یا نہ ہو۔ میری نظر مین تو جس قدر ہے آپ کا دل بخوبی جانتا ہوگا۔ آپ حاسدین کوتہ اندیش کا کچھ خیال نہ کرین ۔ ارباب کمال خصوصاً وہ جن سے زمانہ موافقت کرتا ہے ہمیشہ محسود ہوا کرتے ہین ۔ محسود ہونا سرمایۂ ناز و فخر ہے ۔ خدا حاسد ہونے سے محفوظ رکھے۔

یادآوری کا منت پذیر۔ امیر فقیر

بیشک داغ کے کلام مین بمقتضائے بشریت اکثر عیوب ہین۔ اُن سے داغ کے انصاف

پسند قدردانون کو بھی انکار نہ ہوگا -

مثلاً داغ کے کلام مین اکثر محاورے ملین گے - جن کا نظم کرنا ریختہ متین کی شان کے خلاف ہے - اگر ہزل یا ریختی مین ایسے محاورے نظم کئے جائین - تو مضائقہ نہین -

ہائے کہنا وہ کسی بُت کا دمِ نظارہ
آنکھ بھر کر ہمین دیکھے تو بس اندھا ہو جائے

کیون صرفہٗ نگاہ مری جان ہو گیا
اک تیر اور مین ترے قربان ہو گیا

کوئی خوشی تو ہوئی ہے کہ ہنستے آتے ہو
گئے تھے کیا کسی مرتے پہ آشنا کے تم

اے شیخ جو بتائے مے عشق کو حرام
ایسے کو دو لگائے بھگو کر شراب مین

حورون کا انتظار کرے کون حشر تک
مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب مین

سرِ عدالتِ محشر جواب کیا دو گے
جو دادخواہون نے تم پر کہین سوال دیا

بزم سے گلدستے سب اُٹھوا دئیے
داغ کا نزلہ گل تر پر گرا

اکثر ایسے محاورے بھی داغ نے نظم کئے ہین جن کا اصلی مفہوم غت ربود ہو گیا - مثلاً

آنسو نہ پیے جائین گے اے ناصح نادان
ہیرے کی کنی جان کے کھائی نہین جاتی

دوسرے مصرع کا جو مفہوم ہے وہ اِس محاورے سے ادا ہوتا ہے کہ "جیتی مکھی دیکھ کے نہین نگلی جاتی" ہیرے کی کنی تو جو کھاتا ہے وہ جان کر کھاتا ہے - مثلاً اکثر عورتین اپنی عصمت بچانے کے لئے اپنی ناک کی کیل سے ہیرے کی کنی نکال کر کھا لیتی ہین - ایک اور شعر ہے -

کیا قبر ناتوان کی ترے سبے نمود ہے
افسوس فاتحہ ہے نہ جس کی درود ہے

دوسرے مصرعے مین جو محاورہ نظم کیا ہے وہ عالم بیکسی ظاہر کرنے کے لئے نہین استعمال کیا جاتا بلکہ غصّے کے عالم مین بولا جاتا ہے "مرگیا مردود نہ فاتحہ نہ درود" داغ کی جس غزل کا مطلع ہے۔ ؎

الٰہی کیا کرین ضبط محبّت ہم تو مرتے ہین
کہ نالے تیر بن بن کر کلیجے مین اُترتے ہین

اسی غزل کا ایک شعر ہے۔ ؎

کبھی یہ دل تماشا گاہ تھا عیش و مسرّت کا
اب اس مین حسرت و یاس و تمنّا سیر کرتے ہین

چونکہ "حسرت و یاس و تمنّا" تانیث کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہین لہذا دوسرے مصرعے کا قافیہ بہ یائے معروف ہونا چاہیے۔ نہ کہ بہ یائے مجہول۔ اور اس صورت مین قافیہ غلط ہو جائیگا۔ یا ایک شعر ہے۔ ؎

کبھی تو صلح بھی ہو جائے زہد و مستی مین
الٰہی شیخ بھی میخوار ہون مغان کی طرح

اب "مغان کی طرح" مین "مغان" کی ترکیب خلاف فصاحت سمجھی جاتی ہے۔ آتش وغیرہ کے وقت مین ایسی ترکیب جائز تھی۔ چنانچہ آتش کا شعر ہے۔ ؎

رفتگان کا بھی خیال اے اہل عالم کیجیے
عالمِ ارواح سے صحبت کوئی دم کیجیے

سانس کو اہل دہلی اور اہل لکھنؤ نے مؤنث کہا ہے۔ ظفر کہتے ہیں۔ ؎

ہمیشہ چپ ہی رہے ہم کبھی جو ٹھنڈی سانس
بھری بھی ہم نے تو ہو کر کے تنگ جان سے بھری

یا نسیم لکھنوی کا شعر ہے۔ ؎

واں پھانس چبھی ہے اس کو غم کی
یاں سانس نہیں ہے ایک دم کی

لیکن داغ نے سانس کو مذکر کہا ہے۔ ؎

اک ترے دم کے لئے سانس لگا رکھا ہے
ورنہ بیمار غم ہجر میں کیا رکھا ہے

غالباً حال میں دہلی کے اہل زبان سانس کو مذکر ہی بولتے ہیں۔ کیونکہ محمد حسین آزاد نے بھی "آب حیات" میں سانس کو تذکیر کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

حریف اکثر جزئیات پر بھی حرف رکھتے ہیں۔ مثلاً داغ کا شعر ہے۔ ؎

اے مری جان جان سے بہتر
جان کیا ہے جہان سے بہتر

اعتراض ہے کہ جس وقت عام مثل ہے کہ "جان ہے تو جہان ہے" اس وقت یہ کہنا کیا معنی کہ "جان کیا ہے جہان سے بہتر" یا ایک شعر ہے۔ ؎

دمبدم دل کو ولاسے شب غم دیتے ہیں　　　جس کو تم دے نہیں سکتے اسے ہم دیتے ہیں

اس شعر کے دوسرے مصرع مین ضم کا پہلو بتلایا جاتا ہے۔ ایک اور شعر ہے۔ ؎

انکار میکشی نے ہمین کیا مزا دیا
سینے پہ چڑھ کے اُس نے خُم سے پلادیا

حریف اِس شعر کا خوب مضحکہ اُڑاتے ہین اور کہتے ہین کہ معشوق کا ہے کو تھا کہ شید ہی لندھور تھا اور عاشق کے پیٹ کا ظرف بھی مبالغے سے خالی نہین۔

یا داغ کا ایک شعر ہے۔ ؎

دلبر سے جُدا ہونا یا دل کا جُدا کرنا
اِس فکر مین بیٹھا ہون آخر مجھے کیا کرنا

اعتراض ہے کہ دوسرے مصرعے مین "کیا کرنا چاہیے" کے بدلے محض "کیا کرنا" کہنا درست نہین۔ ایسا اختصار نا جائز ہے۔

مگر ایسی لغزشین اِس شہسوار سخن کی گرم جولانی کا وقار نہین گھٹا سکتین۔ آج ہندوستان کے لئے داغ باعث فخر تھا۔ چمنستان نظم شاداب تھا تو اس کے قدم سے، اور اُردو شاعری کا چراغ روشن تھا تو اس کے دم سے۔ یون تو اب بھی ایسے بزرگ موجود ہین جو پُرانے استادون کی آنکھین دیکھے ہوئے ہین اور جنھون نے علم اور مشق کے زور سے اپنی شاعری کو مصنوعی تکلفات سے آراستہ کرنے مین ایک حد تک کمال حاصل کر لیا ہے۔ یا نئی روشنی پر چلنے والے بہت سے واعظان قافیہ پیما ہو گئے ہین جو اپنی نظم نثر نما کو شاعری کے نام سے تعبیر کرتے ہین لیکن وہ شخص جس کو شاعری سے طبعی تعلق تھا اور جس کی زبان مین جادو تھا وہ داغ ہی تھا۔ اس کی شاعری

طبیعت کے زور سے تھی نہ کہ محض علم کے زور سے۔

مُرغانِ خوش آہنگ اندر باغ سخن لیکن
نالیدنِ این بلبل شورے دگرے دارد

افسوس کہ یہ بلبل ہزار داستان خاموش ہوگیا!

اللہ اللہ اُردو شاعری نے بھی کیا کیا رنگ دیکھے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ میر و سودا کے آغوشِ ناز مین اِس نے پرورش پائی۔ ایک وہ زمانہ آیا جب کہ آتش و غالب و ذوق وغیرہ نے اس کے شباب کی بہار دیکھی۔ اب آخر وقت مین اِس کے مٹے ہوئے حُسن کے چراغ سحری کی روشنی سے داغ نے آنکھین سینکین لیکن آج اس کے آخری عاشقِ زار کے ساتھ اِس شاعری کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اب دیکھیے کون مسیحا نفس پیدا ہو۔ جو اُردو شاعری کی مُردہ ہڈیون مین نئی روح پھونکے اور زمانے کے رنگ سے اس کے پیراہن کو رنگے۔

لچھی رام سرور

(ماخوذ از "کشمیر درپن" ستمبر ۱۹۰۵ء)

جب کشمیر کے چمن زار مین آوارہ وطنی کی آندھی آئی - تو بہت سے ہواخواہانِ چمن اپنا مسکن چھوڑ کر بوئے گل کی طرح نکل کھڑے ہوے - اِن پریشان حالون مین اکثر بلبلِ خوش لہجہ بھی شامل تھے جن کے کانون مین نغمۂ شیراز سمایا ہُوا تھا - اور جن کی زبان قند پارسی کی شیرینی سے کامیاب تھی - اِن نواسنجانِ کشمیر کو عموماً آب و دانہ کی کشش سرزمین دہلی کی طرف کھینچ لیگئی اور وہین اُن کی زمزمہ پردازیون کی ہوا بھی بندھی - مثلاً پنڈت داتا رام برہمن کی شاعری نے مرزا جوان بخت بہادر اور مرزا خرم بخت بہادر کے دامانِ دولت کے سائے مین فروغ پایا - یا پنڈت گوبند رام زیرک کو شاہ عالم کی رفاقت کا فخر عمر بھر حاصل رہا - اسی طرح صیرفی و ضمیر کی شاعری نے دہلی کی خاک پر نشو و نما پائی - اور یہ بزرگ دہلی ہی کے خاک کے پیوند ہوے - لیکن خاک کشمیر کا یہ ذرہ جس کا نام نامی زیبِ عنوان ہے لکھنؤ کی سرزمین پر آفتاب ہو کر چمکا -

آج لچھی رام سرور کے خاندانی حالات تفصیل کے ساتھ لکھنا ممکن نہین کیونکہ اُن کے خاندان کا کوئی یادگار باقی نہین اور اگر کوئی ہوتا بھی تب بھی اس سے زیادہ مدد ملنے کی اُمید نہ تھی - کیونکہ

بزرگون کے سوانحی حالات یادگار کے طور پر یا تبرکاً قلبند کرکے رکھنا ایشیائی تہذیب کا حصّہ نہین - اِس حالت مین لچھمی رام سرورؔ کے حسب و نسب کا حال لکھنا بھولے ہوے خواب کا یاد کرنا ہے - علاوہ برین جو بزرگ اس وقت ہمارے سر پر سلامت ہین، اور جو اِس گذرگاہ ہستی کی نشر اسّی منزلین طے کر چکے ہین وہ یہی کہتے ہین کہ جب اُنھون نے آنکھین کھولین تو لچھمی رام سرورؔ کا اِس دارِ فانی سے کوچ ہو چکا تھا - ان کہن سال بزرگون نے اپنے بزرگون سے جو کچھ لچھمی رام سرورؔ کے متعلق سُنا ہے وہ تبرکاً مجھ تک بھی پہونچا ہے یہین وہ غیر مسلسل حالات کاغذ و قلم کے سپرد کئے دیتا ہون -

تقریباً ڈیڑھ سو برس کا عرصہ ہوا کہ شجاع الدّولہ کے آخری عہد مین یا آصف الدّولہ کے ابتدائی عہد مین پنڈت لچھمی رام سرورؔ کشمیر سے صوبہ اودھ مین آئے اور سعادت علی خان کے دورانِ حکومت مین اُنھون نے وفات پائی حضرت سرورؔ کے سلسلۂ معاش کی نسبت صرف اِس قدر معلوم ہو سکا کہ وہ کچھ عرصے تک قندھاریون کے رسالے مین نوکر رہے - پنڈت نرم ام تخلّص اسی زمانے مین اِس رسالے کے میر منشی تھے - اور ان چند سربرآوردہ اشخاص مین سے تھے جن کا وقار نواب کے دربار مین قائم تھا حضرت سرورؔ انہین کے ماتحت تھے - عبدالرحمن خان کے لڑکے حبیب اللہ خان قندھاریون کے رسالے کے افسر تھے اور ایک خوشرو اور خوش رنگ جوان تھے - سرورؔ کی شاعرانہ طبیعت کا لوازمہ حُسن پرستی بھی تھی چنانچہ حبیب اللہ خان سے عشق تھا اور اُنھون نے اکثر اپنی غزلون مین اِس خوبصورت جوان کے حُسن کی تعریف کی ہے - دو شعر تمثیلاً درج ذیل ہین -

کرد از حبیب حور بہ شکلِ بشر عیان   سرور مگر تو صنع خدائے جلیل را

دادہ سرور بہ یوسف نسبتِ روئے حبیب   ہان غلط کردی کہ حسنش را صفائی دیگر است

کچھ زمانہ لچھمی رام سرور کا اندور مین بھی گذرا ہے اس کی یہ وجہ ہوئی کہ ایک زمانے مین مفسدون کی فتنہ پردازی کے سبب سے پنڈت زندہ رام تنخواہ سے اور نواب سے بگڑ گئی۔ پنڈت زندہ رام نے اودھ کی سرکار کو سلام کہا اور اندور کی راہ لی۔ لچھمی رام سرور نے بھی اپنے آقا کی رفاقت مین اُسی سرزمین کا رُخ کیا۔ مہاراجہ ہولکر یعنی والیِ اندور ان لوگون سے بہت عزت سے پیش آئے۔ اور ان کے اعزاز اور پایہ کے مطابق اپنے لشکر مین عہدہ عطا فرمایا۔ لیکن اندور کے دربار کے پُرانے امرا نے ان غریب الوطنون کی بیخ کنی شروع کی اور مہاراجہ کو ان کی طرف سے بدظن کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مہاراجہ ان لوگون سے کم التفاتی سے پیش آنے لگے۔ یہ ناقدری پنڈت زندہ رام کو بہت ناگوار گذری اور اُنھون نے پھر اپنے قدیمی وطن کی راہ لی۔ لچھمی رام سرور کے دل مین بھی جو آتشِ غضب اِن معاملات سے جوش مین آئی وہ زبان سے گرمیِ سخن بن کر ظاہر ہوئی۔ اُنھون نے مہاراجہ ہلکر کی ایک ہجو اندور سے چلتے چلتے کہدی۔ مہاراجہ ہلکر کانے تھے۔ اور دوسری آنکھ کو بھی نور کا کافی حصّہ نہ ملا تھا۔ لچھمی رام سرور نے ہجو مین اِس عیب کا بھی اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہین ؎

یاران ہوائے سیم و زر از سر بدر کنید   گیرید راہ خانہ و ترکِ سفر کنید
زین کور چشم چشم ہمی داشتن خطاست   قطع نظر ز ہلکر کوتہ نظر کنید
گوید ہزار وقت . . . . . . نہ می دہد   از مکر و چاپلوسیِ ہلکر حذر کنید

ماندن کنون بہ لشکر ہلاکر صلاح نیست　　اصلاح کار خود بہ صلاحِ دگر کنید

سرور بہ پیادہ می رود و ہمرہان سوار
ہائے وائے یا حبیب[1] زِ حالش خبر کنید

لچھمی رام سرور سے ایک دیوان یادگار ہے جس کے قلمی نسخے شاذونادر اکثر بزرگون کے پاس موجود ہین۔ ایک نسخہ اس دیوان کا بخت رسا کی مدد سے میرے پاس بھی آگیا[2]۔ اِس مین تقریباً تین سو غزلین ردیف وار درج ہین۔ دیوان کے آخر مین دو ایک ترجیع بند ہین۔ ایک مثنوی ہے اور ایک قصیدہ ہے۔ قصیدہ اور مثنوی حبیب اللہ خان کی شان مین ہے کلام کا رنگ دیکھنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس نواسنج کشمیر نے بلبلِ شیراز کا طرز فریاد اُڑایا ہے۔ اور عاشقانہ اور رندانہ مضامین فصیح اور پاکیزہ زبان مین نظم کئے ہین صفائی بندش سے قدرتی روانی کا پتہ ملتا ہے۔ دقیق مضامین اور بلیغ ترکیبون سے عام طور سے پرہیز کیا ہے۔ چونکہ بڑا حصہ مصیبت ہی مین گذرا لہذا کلام مین ایک قسم کا درد بھی ہے۔ چند اشعار تمثیلاً درج ہین۔

باچشم کم مبین من ظاہر ذلیل را　　بحث از غلاف کہنہ چہ تیغِ اصیل را
ناصح خموش و گوش خراشم مشو کہ نیست　　رہ در حریم خلوتِ من قال و قیل را
مفروش جلوۂ اہدِ خشک از ارم برو　　عاشق بہ چشم تر نخرد سلسبیل را

---

[1] یعنی حبیب اللہ خان ۱۲　[2] میرے عنایت فرما پنڈت شمبر ناتھ صاحب مشران سے مجھ کو یہ دیوان ملا مشکور ہون ۱۲

ہمچو رندان نہ بود بادہ کشی پیشۂ ما
بادۂ ما ہمہ خونِ دل و دل شیشۂ ما

نیست خورشید کہ بر روے فلک می تابد
جستہ از سنگ شرارے ز دمِ تیشۂ ما

بسکہ در یادِ تو سرمستِ انا الحق شدہ ایم
سرِ منصور زند سر ز رگ و ریشۂ ما

وہ چہ خوش گلبنِ رنگین گلستانِ غمیم
آب از خونِ جگر یافتہ ہر ریشۂ ما

وصفِ ذاتِ تو حبیبا چہ بگوید سرور
نیست در بزم صفاتت رہِ اندیشۂ ما

نے مقیمِ مسجد و نے ساکنِ بتخانہ ایم
گشتہ ایم از کفر و دین آزاد ما دیوانہ ایم

زاہدا ما را مدہ تکلیف از صوم و نماز
بندۂ پیرِ مغان و خادمِ میخانہ ایم

ساختن با سوختن در عشقِ خوبان کارِ ماست
جا دہ گر ہر جا کہ شمع ہست ما پروانہ ایم

در کنجِ غم افتادم و دمسازِ کسے نیست
دردا کہ بہ فریادم و فریادرسے نیست

در گلشنِ پرخار و خس دہر ندیدم
یک مرغِ خوش الحان کہ اسیرِ قفسے نیست

بشور آمد جنون در سینۂ من نالہ شد پیدا
گرہ شد نالۂ من بر لب و تبخالہ شد پیدا

چہ رنگین آتشے زد در دلم عشقش کہ در گلشن
شرارے جست از داغم چراغِ لالہ شد پیدا

رخصتِ آہ دہم گر دلِ شیدائی را
آتشے در زدم این گنبدِ مینائی را

پردہ برداشت ز رخ عشق تو رسوائی را　　خیر بادیست ز من صبر و شکیبائی را

مژدہ اے دل کہ ترا ہم نفسے می آید　　عندلیب ز چمن در قفسے می آید
ہر نفس قافلۂ عمر روان می گذرد　　گوش کن گوش کہ بانگ جرسے می آید

متجلی ست از تو خانۂ ما　　رشک طور ست آشیانۂ ما
خواب در دیدہ سوخت اے سرو　　آہ از گرمی فسانۂ ما

بہار آمد بدہ ساقی شراب ارغوانی را　　کہ تا زین آب سازم سبز نخل زندگانی را

گر حواس آشفتہ ایم اے ہمنفس با ما مرنج　　وز غم گیسو پریشانے پریشانیم ما
ہر دم از افغان و آہ آتشین و چشم تر　　رعد نالان برق سوزان ابر گریانیم ما

داغہاے کہ بود در دل سودا زدہ ام　　لالہ زاریست کہ در دامن صحرائے ہاست

بے تو جان بر لبم و ذوق طپیدن باقیست　　یک نفس فرصت صد نالہ کشیدن باقیست

گہ کرشمہ گہ نگہہ گہ غمزہ گاہے ناز کرد		سحرہا در کار دل آن چشم جادو ساز کرد

مہ شد تمام تا چو رخ او شود نہ شد		کاہید باز تا خم ابرو شود نہ شد

بوصف چشم تو سازم چو ابتدائے غزل		غزال سر زند از خامہ ام بجائے غزل

مطرب نواز نشی کن و ساز طرب بباز		بنواز نے کہ نغمۂ مستانہ برکشیم

یہی رنگ کلام کا شروع سے آخر تک ہے۔ زبان پر قدرت کا یہ عالم ہے کہ سنگلاخ زمینون مین بھی اس شہسوار سخن کے قدم نہین ڈگمگائے ہین اور فصاحت کی شاہراہ نہین چھوٹنے پائی ہے چند شعر اس رنگ کے بھی ملاحظہ ہون۔

اے دل چنین بخون چو طپیدی چہ شد ترا		از تیغ غمزۂ کہ شہیدی چہ شد ترا
صد فصل نو بہار گذشت و درین چمن		بلبل تو نالۂ نہ کشیدی چہ شد ترا

یارب از دستم نیامد جز گنہگاری دگر		بسکہ دارم شرمساری گریہ می آید مرا
مزرع خشک امید ما لبے ہم تر نہ کرد		از تو اے ابر بہاری گریہ می آید مرا

فصل گل ست اے چمن آرائے میکدہ		بگذار زیر سایۂ ہر تاک شیشہ را

افتادہ است بر سر خاک از فراق مے | بردار ساقیا ز سر خاک شیشہ را
از فیض رنگ بادۂ رنگین برنگ گل | بر سنگ گر فتد نبود باک شیشہ را

شبے کسے بدر او طپید و ہیچ نہ گفت | چنانالہا کہ ز دل بر کشید و ہیچ نہ گفت
ہلاک شیوۂ آن سر کشم کز استغنا | مرا طپان بسر راہ دید و ہیچ نہ گفت
زو از دہان تو حرفے بہ غنچہ باد صبا | ز شرم سر بہ گریبان کشید و ہیچ نہ گفت

ز باد آن زلف عنبر بار گاہے راست گاہے کج | چو خوش زیباست بر رخسار گاہے راست گاہے کج
گہے از قہر و گہ از خشم چشم فتنہ پرداز ش | نگاہے میکند ہر بار گاہے راست گاہے کج

حافظ کی غزلوں پر اکثر غزلیں کہی ہیں اور بعض موقعوں پر خوب طبیعت داری دکھائی ہے۔ حافظ کی اُس مشہور غزل پر بھی غزل کہی ہے۔ جس کا مطلع ہے ۔

الا یا ایّہا الساقی ادر کاسا و ناولہا | کہ عشق آسان نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

اِس زمین میں اکثر فارسی شعرا نے زور مارے ہیں۔ مگر میرے خیال میں حافظ کے بعد جیسا مطلع سرور نے کہا ہے اِس پایہ کا شعر اس خاص زمین میں دوسروں کے یہاں نہ ملیگا۔ سرور کا مطلع ہے ؎

بہ تحریر آورم گر نامۂ بیتابی دلہا | تو اید خامہ جائے مدہم اللہ بسملہا

ظہیر فاریابی، ناصر علی اور ہلالی نے اِس زمین میں غزلیں کہی ہیں۔ ذیل میں حافظ کے شعر بھی

تبرکاً لکھتا ہون اوران شعرا کے بھی سب کا رنگ سخن ملاحظہ ہو۔

حافظ — الا یا ایہا الساقی ادر کاسا وناولہا — کہ عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلہا
سرور — بہ تحریر آورم گر نامۂ بیتابی دلہا — نویسد خامہ جاے بسم اللہ بسملہا
ظہیر — من از باد صبا باور ندارم حل مشکلہا — چہ حاصل عقدہ از زلف کشود و بست دلہا
ہلالی — ز آب چشم من گل شد براہ عشق منزلہا — ندانم تا چہ گلہا بشگفد آخر ازین گلہا
ناصر علی — محبت جادہ دارد نہان در خلوت دلہا — چو تار سبحہ گم گردید این رہ زیر منزلہا

حافظ — بمے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغان گوید — کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا
سرور — ز خود شو بیخبر گر وصل جانان آرزو داری — بود از خود بریدن اندرین رہ قطع منزلہا

حافظ — شب تاریک و بیم موج و گردابے چنین حائل — کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا
ظہیر — ظہیر از موج این دریاے بے پایان نیندیشد — خبر از وے ببر نزدیک بیداران ساحلہا
ہلالی — ز طوفان سرشک خود بگردابے گرفتارم — کہ عمر نوح گر یابم نہ بینم روے ساحلہا
ناصر علی — گذشتم از رہ دریاے دل زین کہنہ منزلہا — دو عالم خشک بر جا ماند از حسرت ساحلہا
سرور — زند پہلو بہ طوفان بلا ہر موج اشک من — ز جوش گریہ ام رشک دل دریاست ساحلہا

حافظ — ہمہ کارم بہ خود کامی بہ بدنامی کشید آخر — نہان کے ماند آن رازے کزو سازند محفلہا

ناصر علی۔ بنقشِ دولت گردش چشم تو می سازد | به یک پیمانه رنگین کردهٔ یک شهر محفلها
سرور اگر حور و پری پروانه اش گردد سزد امشب | فتاد آتش ز شمع روے او در جان محفلها
ہلالی چون آن مہ یار اغیار است گرد او مگرد اے دل | چرا پروانه باید شد براے شمع محفل ها
ظہیر براے دیگرانم زنده گر بے بہرہ از خویشم | دہد نور ار چہ تاریک است پاے شمع محفلها

حافظ حضوری گر ہمی خواہی از و غائب مشو حافظ | متی ما تلق من تہوی دع الدنیا و اہملہا
ہلالی ہلالی چون حریف بزم رندان شد بخوان مطرب | الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا
سرور بوجد آورد امشب نغمهٔ شیراز سرور را | الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا
ناصر علی۔ علی امشب مے شیراز در جام و سبو دارد | الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا

اسی طرح بچھی رام سرور کے دیوان مین اور غزلین بھی حافظ کی غزلون پر ملین گی جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سرور نے اپنا جام سخن حافظ کی شاعری کے شیرین چشمے سے بھرا ہے۔ دیوان کے آخر مین ایک طوائف کی تاریخ وفات بھی درج ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرور کو تاریخ گوئی مین بھی کس قدر کمال حاصل تھا۔ تاریخ مذکور کا آخری شعر یہ ہے۔

مُرد گنّا[1] و گشت بے سر و پا | نغمه[2] و رقص و چنگ و طبله و عود

[1] نام طوائف ۱۲ [2] اگر نغمه۔ رقص۔ چنگ۔ طبله اور عود کے اولین اور آخری حروف نکال ڈالے جائین اور باقی ماندہ الفاظ کے عدد جوڑے جائین تو مادہ تاریخ نکل آتا ہے۔ ۱۲

ممکن ہے کہ اس زمانے کے تہذیب یافتہ نوجوان یہ تاریخ دیکھ کر زیرِ لب مُسکرائیں لیکن اُن کو یہ خیال کر لینا چاہیئے کہ ہر زمانے کی تہذیب کا رنگ جُدا گانہ ہُوا کرتا ہے۔ اس زمانے میں گو کہ کسی باکمال شاعر کے لئے ایک طوائف کی تاریخ کہنا ناموزوں سمجھا جائے مگر لچھمی رام سرور کے زمانے میں ایسی باتیں معیوب نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ نیرنگ روزگار اسی کا نام ہے۔ آج جن باتوں کو ہم آئینِ شرافت میں داخل سمجھتے ہیں ممکن ہے کہ سو برس بعد اُنہیں باتوں پر آئندہ نسلیں حرف رکھیں کسی نے سچ کہا ہے۔ ع

چنان نماند و چنین نیز ہم نخواہد ماند

جب حبیب اللہ خان نے اودھ سے دکن کا رُخ کیا تو سرور کو اپنے حبیب کی جُدائی بہت شاق گذری۔ چنانچہ اسی مضمون کی ایک غزل دردِ فراق کے لہجے میں کہی ہے۔ اُس غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔ ؎

بدل عزمِ سفر اے راحتِ جان داشتی رفتی
بہ کنجِ غم مرا در خون طپان بگذاشتی رفتی

نہ کردی آگہ از رفتن مرا نازم تغافل را
چرا اے آشنا بیگانہ ام انگاشتی رفتی

دل از حبِّ وطن برداشتی اے خسرِ خوبان
علم مردانہ در مُلکِ دکن افراشتی رفتی

چو رفتی رفت صبر و طاقت و ہوش و قرارِ من
ستم ہا بر سرم کردی نہ کردی آشتی رفتی

حبیبا[۱] از تو اُمیدِ وفا ہا بود سرورؔ را
روا بر وے چنین جور و جفا چون داشتی رفتی

مفلسی اکثر اہلِ جوہر کی رفیق رہی ہے۔ چنانچہ لچھمی رام سرور کا دامن بھی کبھی دولت

---

[۱] حبیب اللہ خان سے مراد ہے۔ ۱۲

دُنیا سے مالا مال نہ ہوا۔ جو مثنوی حبیب اللہ خان کی شان مین کہی ہے اُس مین اپنی بیکسی کا بیان عجب درد آمیز لہجے مین کیا ہے۔ حبیب اللہ خان کو مخاطب فرما کر کہتے ہین۔ ؎

توئی جوہر شناسِ گوہر من | مبین بر من بہ بین بر جوہرِ من
بہ صورت در نظر ہا گر حقیرم | ولے در کشورِ معنی امیرم
ولے از دستِ غم گردیدہ ویران | درین ویرانہ گنج ہست پنہان
چہ گنج وہ چہ گنجے پُر ز گوہر | چہ گوہر ہر یکے تابندہ اختر
منم آن طوطیِ شیرین ترانہ | کہ ہستم در سخندانی فسانہ
ولے از گردشِ ایام اے واے | ز جورِ بختِ نافرجام اے واے
گرفتارِ قفس گشتم بزاغے | ازین غم بر دلِ من ہست داغے
خداوندا ز دستِ تنگدستی | ز پا افتادہ ام بر خاکِ پستی
بسے درماندہ ام سازم چہ تدبیر | نمایم حالِ من پیشِ کہ تقریر
نہ غمخوارے مرا نے غمگسارے ست | نہ دمسازے نہ ہمرازے نہ یارے ست
چہ سازم حالِ خود را با کہ گویم | علاجِ دردِ دل را از چہ جویم

لیکن باوجود اس مفلسی اور تنگدستی کے زمانے نے لچھی رام سرور کے شاعرانہ کمال کی ضرور قدر کی۔ ایک مرتبہ لکھنؤ مین مشاعرہ قرار پایا۔ اُس وقت کے باکمال فارسی شعرا اس مین جمع تھے۔ لچھی رام سرور کو بھی شوقِ سخن اس بزمِ سخن کی طرف کھینچ لے گیا۔ اس وقت کشمیر سے آئے ہوے ان کو کم زمانہ گذرا تھا اور وطن کی محبت قدیمی پوشاک کی شکل مین دامنگیر تھی۔ ایک

پیرہن زیب تن تھا جس پر مفلسی کی گرد جمی ہوئی تھی۔ کمر مین ٹپکا بندھا تھا۔ سر پر دستار رکھی ہوئی تھی۔ اور ایک لوئی اوڑھے ہوے تھے۔ اِس ہیئت سے یہ ایک گوشے مین پا ئین فرش جا کر بیٹھ گئے۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ شمع پر شمع پائی ہوتی چلی گئی۔ مگر ان کی طرف کسی نے رُخ بھی نہ کیا۔ اتفاقاً ایک ایسے صاحب کی نظر ان پر بھی پڑی جو ان کے جاننے والون مین تھے اور ان کے کمال سے بھی واقف تھے۔ ان کی تحریک سے اِن سے بھی غزل پڑھنے کی فرمایش کی گئی اور شمع ان کے سامنے بھی آئی۔ بیشتر لوگون نے سمجھا کہ یہ آوارہ وطن بدہیئت مسافر کیا پڑھیگا لیکن جب اُنہون نے اپنی غزل پڑھی تو تمام مشاعرہ تحسین و آفرین کے نعرون سے گونج اُٹھا اور اہل مشاعرہ نے اُن کی بہت عزت وتوقیر کی۔ رات آخر ہوئی۔ مشاعرہ ختم ہوا اور صبح کی روشنی کے ساتھ لچھی رام سرور کی شہرت قدر دانانِ سخن مین پھیل گئی[۱]۔ پھر لکھنؤ مین ایک اور مشاعرہ ہوا جس مین یہ طرح تھی۔ ع

همسر مگر بآن قدِ دلجو شود نہ شد

مرزا قتیل بھی اِس مشاعرے مین شریک تھے۔ جب لچھی رام سرور نے اپنی غزل کا یہ مطلع پڑھا۔ ؎

مہ شد تمام تا چو رخِ او شود نہ شد

کاہید یاز تا خمِ ابرو شود نہ شد

تو مرزا قتیل نے اپنی غزل چاک کر ڈالی اور کہا کہ اس مطلع کے بعد غزل پڑھنا بیکار ہے[۲]۔ اللہ اللہ

---

[۱] پنڈت لچھمی نراین فنشی ایک دیرینہ سال اور سخن سنج بزرگ تھے اُن سے یہ واقعہ سُنا گیا تھا۔ اُن کو وہ غزل بھی یاد تھی جو لچھی رام سرور نے اس مشاعرے مین پڑھی تھی مگر افسوس ہے کہ لچھمی نراین صاحب کا تو انتقال ہو گیا اور جن صاحب نے یہ واقعہ اُن سے سُنا تھا اور مجھ سے بیان کیا اُن کو اس غزل کا ایک مصرع بھی نہ یاد رہا ورنہ دیوان مین غزل تلاش کر لی جاتی۔

[۲] یہ واقعہ پنڈت اجودھیا ناتھ صاحب تنخواہ سے معلوم ہوا۔ اُنہون نے پنڈت جوالا ناتھ صاحب کچو سے سُنا تھا۔

کیا عالی ظرف لوگ تھے اور کیا زمانہ تھا۔ مذہبی تعصب کی تاریکی نے ان کے دلون کو سیہ خانہ نہین بنادیا تھا۔ وہ صاحب جوہراہل ہنر کی قدردانی اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ایک آج کل کا زمانہ ہے کہ تنگ خیالی اور کم نظری سے کام لینا اور نکتہ چینی کرنا مذہب مین داخل سمجھا جاتا ہے۔کسی ایسے صاحب جوہر کی دستگیری کرنا جو کہ گمنامی کے قعر مین پڑا ہوا ہے تو درکنار محض جہل و تعصب کی بنیاد پر ان صاحب کمالون کے جوہر مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے جن کے سرپر زمانہ قبول عام کا تاج رکھ چکا ہے۔اور جن کی شہرت کی عالی شان عمارت سیکڑون مخالفت کے طوفان جھیلنے کے بعد زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ میری دیوارون سے اب سر ٹکرانا فضول ہے۔مگر جن کے سرون مین تعصب کا سودا سمایا ہوا ہے وہ ٹکرین لڑنے سے باز نہین آتے اور اِس فکر مین رہتے ہین کہ شاید کوئی خشتِ کہن جنبش مین آجائے۔

دیباچۂ گلزارِ نسیم

(ماخوذ از گلزارِ نسیم معہ انتخاب دیوان نسیم، مرتبہ پنڈت برج نراین چکبست)

پنڈت دیا شنکر صاحب کول تخلص بہ نسیم ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوے تھے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام پنڈت گنگا پرشاد کول تھا۔ لکھنؤ آپ کا وطن تھا۔ بزرگوں سے سنا جاتا ہے کہ وجاہت جس کے لیے عموماً اہل خطۂ مشہور ہیں آپ کا حصہ نہ تھی۔ پستہ قامت گندمی رنگ، سیہ چشم اور چھریرے بدن کے آدمی تھے۔ سلسلۂ معاش یہ تھا کہ شاہی فوج میں وکیل تھے۔ جیسا کہ اُس زمانے کا دستور تھا۔ اُردو، فارسی کی تعلیم عالم صغر سنی میں پائی۔ شعرائے اُردو و فارسی کا کلام نظر سے گزرتا رہا۔ خلقی طبیعت داری اور ذہانت نے شاعری کا شوق دلایا۔ غرضکہ بیس برس کی عمر میں شعر و سخن کا خاصہ اچھا مذاق پیدا کر لیا۔ خواجہ حیدر علی آتش کی گرمی سخن اور آتش بیانی نے ایسا فریفتہ کیا کہ انکی شاگردی اختیار کی۔ شروع میں غزل گوئی کا شوق رہا لیکن جو دل کا ولولہ تھا وہ غزل میں نہ نکل سکا جدتِ طبع نے کہا ؎

بقدر شوق نہیں اپنے تنگنائے غزل　　　کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیان کے لئے

مگر وسعت کہاں ملے۔ اُردو شاعری کی کائنات کیا۔ غزل، قصیدہ، رباعی یا مثنوی۔ میر حسن کی

مثنوی سحرالبیان کا اُس زمانے مین ہر طرف چرچا تھا۔ اصنافِ سخن مین مثنوی کا رنگ ایسا پسند آیا کہ خود بھی اِس کوچے مین قدم رکھنے کی کوشش کی۔ مناسبت طبع نے آمین کہا۔ غرضکہ گل بکاؤلی کا قصّہ جو کہ نثر مین تھا اُس کو نظم کے سانچے مین ڈھالا۔ پچیس برس کی عمر مین یہ مثنوی طیار ہوئی۔ چونکہ گلہائے مضامین سے پُر تھی لہذا نام "گلزارِ نسیم" رکھا۔ واقعی اِس گلزار کا کیا کہنا تھا۔ ع

سینچا تھا جس کو خونِ جگر سے وہ باغ تھا

لیکن جس وقت یہ مثنوی طیار ہوئی اِس کا حجم بہت زیادہ تھا جب آتش کے پاس اصلاح کے لئے لے گئے تو اُنہون نے کہا اسے بھئی اتنی بڑی مثنوی کون پڑھیگا۔ یا تم پڑھو گے کہ تم نے تصنیف کی ہے یا مین اصلاح کے خیال سے ایک مرتبہ دیکھ جاؤنگا۔ اُستادِ کامل کی بات دل پر اثر کر گئی۔ مثنوی کی نظر ثانی کی۔ جتنے بھرتی کے شعر تھے نکال ڈالے۔ بلکہ جو مطلب چار شعرون مین ادا ہوتا تھا اُس کو اختصار کے ساتھ ایک ہی شعر مین ادا کیا۔ اِس صورت پر گلزارِ نسیم کو خس و خاشاک سے پاک کیا اور آتش کے پاس لے گئے۔ اُستاد نے شاگرد کی محنت پر آفرین کہی اور اصلاح کا قلم اُٹھایا۔ لیکن اکثر اصلاحین نسیم نے نہ مانین اور اشعار کو اپنی اصلی حالت پر رہنے دیا۔ مثلاً مثنوی کا ایک شعر تھا ؎

قلیان پہ مشکبو دُھوان دھار بیڑے چکنے پان کے مزیدار

آتش نے اس شعر کا دُوسرا مصرع اس طرح بدلنا چاہا۔ ع بیڑے چکنے بہت مزیدار ؛ لیکن نسیم کو یہ اصلاح پسند نہ آئی اور مصرع کی تبدیلی مناسب نہ سمجھی[1]۔ غرضکہ آتش کی نظر ثانی کے بعد یہ مثنوی

---

[1] یہ واقعہ میر رضا حسین صاحب شہا کی زبانی مجھکو معلوم ہوا۔ یہ بزرگ آتش کے شاگرد رشید میر وزیر علی صبا کے داماد اور شاگرد تھے یہ اُن معدودے چند بزرگوں مین سے تھے جنہوں نے پرانے اُستادوں کی آنکھیں دیکھی تھیں اور جنکی وضع کے بزرگوں سے ابتک لکھنؤ مین اردو شاعری کا نام زندہ ہے۔ تین چار سال کا عرصہ ہوا کہ قضا کی۔ ع کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

ایک مشاعرے میں پڑھی گئی جس میں کہ لکھنؤ کے تمام سرآوردہ شعرا جمع تھے۔ بعدازاں طبع ہوئی شایع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ زمانے نے پورے طور سے قدر کی۔ ابھی تک مثنوی کے رنگ میں یکتائی کا سہرا میر حسن کے سر تھا۔ اب گلزار نسیم کے بھی جابجا چرچے ہونے لگے۔ جواہر سخن کے پرکھنے والے سمجھ گئے کہ مثنوی کیا کہی ہے موتی پروئے ہیں۔ نسیم کو بھی شہرتِ عام کا خلعت نصیب ہوا اور بقائے دوام کے دربار میں میر حسن کے برابر کرسی ملی۔ اور واقعی حق یہ ہے کہ جب تک اُردو شاعری کا مذاق قائم ہے اُس وقت تک گلزار نسیم کی شادابی میں فرق نہیں آسکتا۔ مگر افسوس کہ نسیم کے ساتھ عمر نے وفا نہ کی۔ گلزار نسیم کو طبع ہوئے ایک برس گذرا تھا کہ باغ جوانی پر اوس پڑ گئی۔ ہیضہ کی بیماری نے دفعتًا خاتمہ کر دیا۔ اپنے شعر کے آپ ہی مصداق ہوئے۔ ؎

روح رواں و جسم کی صورت میں کیا کہوں — جھونکا ہوا تھا ادھر آیا اُدھر گیا

۱۸۴۳ء میں تخمیناً بتیس سال کی عمر میں وفات پائی۔

سخن شناس جانتے ہیں کہ نسیم نے گو کہ میر حسن کے مقابلے پر مثنوی کہی لیکن بالکل دوسرے رنگ میں کہی۔ کوئی نسیم کو میر حسن کے خرمن کا خوشہ چین نہیں کہہ سکتا۔ اگر وہ اپنے رنگ میں فرد ہیں تو یہ اپنے طرز میں یکتا ہے۔ اگر کلام کی سادگی اور بے تکلفی کا لطف اُٹھانا ہے تو میر حسن کی مثنوی دیکھو۔ اگر باریک بینی اور معنی آفرینی کا رنگ پسند ہے تو گلزار نسیم کی سیر کرو۔ دیکھو فراق یار میں صدمہ گذرنے کا مضمون ایک ہی ہے۔ دونوں اُستادوں کی طبیعت اِس مضمون پر برابر لڑی ہے۔ مگر دونوں کے اندازِ سخن پر خیال کرو۔

میر حسن — دوانی سی ہر سمت پھرنے لگی — درختوں میں جا جا کے گرنے لگی

ٹھہرنے لگا جان مین اضطراب — لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب
خفا زندگانی سے ہونے لگی — بہانے سے جا جا کے سونے لگی
جہان بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اُسے — محبت مین دن رات گھٹنا اُسے
کسی نے اگر بات کی بات کی — یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے — کہا خیر بہتر ہے، منگوائیے
جو پانی پلانا تو پینا اُسے — غرض غیر کے ہاتھ جینا اُسے

نسیم

سُنسان وہ دم بخود تھی رہتی — کچھ کہتی تو ضبط سے تھی کہتی
کرتی تھی جو بھوک پیاس تس مین — آنسو پیتی تھی کھا کے قسمین
جامہ سے جو زندگی کے تھی تنگ — کپڑون کے عوض بدلتی تھی رنگ
یکچند جو گذری بے خور و خواب — زائل ہوئی اُس کی طاقت و تاب
صورت مین خیال رہ گئی وہ — ہیئت مین مثال رہ گئی وہ
آنے لگے بیٹھے بیٹھے چکر — فانوس خیال بن گیا گھر

دونون نے اپنے اپنے رنگ مین حق سخنوری ادا کیا۔ میر حسن کے اشعار کا بیساختہ پن اور سادہ پن دل مین عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے۔ شبِ ہجران کی بیقراری کی تصویر آنکھون کے سامنے پھر جاتی ہے نسیم کے اشعار ایک دوسری ہی حالت پیدا کرتے ہین۔ الفاظ کی شوکت، بندش کی چستی، استعارون کی نزاکت تشبیہون کی پختگی سے مصنف کا زور طبیعت معلوم ہوتا ہے۔ نازک خیالی اور بلند پروازی اُس عالم کا اشارہ کرتی ہے جہان پہونچتے ہوئے ہمارے طائر خیال کے پر جلتے ہین۔ غرضکہ اگر صورت حال کا بیان

میر حسن پر ختم ہے تو کلام کا معنی خیز ہونا نسیم پر۔ میر حسن کہتے ہین ۔ع

سب اعضا بدن کے موافق درست ہر ایک کام مین اپنے چالاک و چست
قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام قیامت کرے جسکو جھک کر سلام

نسیم اسی مضمون کو اپنے رنگ مین ادا کرتے ہین ۔ع

دن دن اسے ہو گیا قیامت بوٹا سی بڑھی وہ سرو قامت
چلتی تو زمین مین سرو گڑتے باتین کرتی تو پھول جھڑتے

یا حسن تعمیر کا مضمون دونون نے اپنے اپنے طرز پر نظم کیا ہے ۔

میر حسن عمارت کی خوبی درون کی وہ شان لگے جس مین زربفت کے سائبان
چقین اور پردے بندھے زرنگار درون پر کھڑی دست بستہ بہار
نسیم ۔ گول اِس کے ستون تھے ساعدِ حور چلمن مژگان چشم مخمور
دکھلاتا تھا وہ مکان جادو محراب سے در سے چشم و ابرو

شاہزادے کے غائب ہو جانے پر میر حسن نے پس ماندہ لوگون کی پریشانی کا حال اس صورت پر نظم کیا ہے ع

کھلی آنکھ جو ایک کی واں کہین جو دیکھا تو واں شاہزادہ نہین

* * * * * * * *

کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی بلبلاتی سی پھرنے لگی کوئی ضعف کھا کھا کے گرنے لگی
کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دلگیر ہو گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو

ہوا گم وہ یوسف پڑی پھر یہ دھوم — کیا خادمانِ محل نے ہجوم
کہا شہ نے واں کا مجھے دو پتا — عزیزو جہان سے وہ یوسف گیا
گئین لے وہ شہ کو لب بام پر — دکھایا کہ سوتا تھا یان سیم بر
جو دیکھی جگہ وہ جہان سے گیا — کہا ہائے بیٹا تو یان سے گیا
مرے نوجوان اب کدھر جائے پیر — نظر تو نے مجھ پر نہ کی بے نظیر
عجب بحر غم مین ڈبویا مجھے — غرض جان سے تو نے کھویا مجھے

پھول کے غائب ہو جانے پر بکاؤلی کے اضطراب کی تصویر نسیم نے اپنے رنگ مین یون کھینچی ہے

دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے — کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہین کدھر گیا گل — جھنجھلائی کہ کون دے گیا جُل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون — ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
ہاتھ اُس پر اگر پڑا نہین ہے — بو ہو کے تو گُل اُڑا نہین ہے
نرگس تو دکھا کدھر گیا گل — سوسن تو بتا کدھر گیا گل
سنبل مرا تازیانہ لانا — شمشاد انہین سولی پر چڑھانا
تھرائین خواصین صورتِ بید — ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید

بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس — غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس

آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا — پتلی وہی چشم حوض کا تھا
نام اِس کا صبا نہ لیتی تھی مین — اِس گل کو ہوا نہ دیتی تھی مین
گلچین کا جو ہاے ہاتھ ٹوٹا — غنچے کے بھی مُنہ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار پڑا نہ تیرا اچنگل — مشکین کس لین نہ تو نے سنبل
او بادِ صبا ہوا نہ بتلا — خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا
بلبل تو چہک اگر خبر ہے — گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

میرحسن کے اشعار کا اثر بجلی کی طرح دل مین دوڑ جاتا ہے جو حالت وہ بیان کرتا ہے اُس کی تصویر آنکھون کے سامنے کھینچ دیتا ہے نسیم کے اشعار زبان کی پاکیزگی اور ترکیب لفاظ کی چستی کے لحاظ سے تاثیر کا طلسم بنے ہوے ہین - ایک کی زینت حُسن صورت سے ہے - دوسرے کی شان لطف معنی سے قائم ہے - میرحسن سخن آفرین ہین - نسیم معنی آفرین ہین میرحسن محاورہ اور روزمرہ کے بادشاہ ہین - استعارہ و تشبیہ نسیم کا حصہ ہے - مگر اتنا کہنا نا انصافی نہین کہ جو سوز وگداز میرحسن کے کلام مین ہے - وہ نسیم کے کلام مین نہین ہے - اور حقیقت یہ ہے کہ جو درد عموماً شعراے دہلی کے کلام مین پایا جاتا ہے وہ اہل لکھنو کے کلام مین نہین پایا جاتا - مگر با این ہمہ جیسا کہ بیشتر عرض کیا گیا ہے نسیم کی مثنوی اپنے رنگ مین لاجواب ہے - یہی وجہ ہے کہ جب ان کے طائرِ شہرت نے پر پرواز نکالے تو یہ کسی کے خرمن کے خوشہ چین نہ خیال کئے گئے بلکہ خود صاحبِ طرز کہلائے -

گلزار نسیم کا ایک خاص جوہر جو کہ نسیم کا حصہ ہے تناسب لفظی ہے - تناسب لفظی کی صفت ہمیشہ اُردو شاعرون کے پسند خاطر رہی ہے لیکن کسی نے اس کو اس درجہ کمال پر نہین پہونچایا جیسا

کہ گلزار نسیم میں ہم دیکھتے ہیں۔ چند اشعار تمثیلاً لکھے جاتے ہیں۔ ؎

پردہ سے جو دایہ نے نکالا
پتلی سا نگاہ رکھ کے پالا

اک مرغ ہوا اسیرِ صیّاد
دانا تھا طائرِ چمن زاد

پالا تو مفارقت ہے انجام
دانا ہے تو مجھ سے لے مرے دام

مجنون ہو اگر تو فصد لیجے
سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجے

سَودا ہے مری بکاؤلی کو
ہے چاہ بشر کی باولی کو

سختی سہی یا کڑی اُٹھائی
افتادِ وقتی جو پڑی اُٹھائی

اس رنگ کے اشعار گلزار نسیم میں کثرت سے ملیں گے۔ واقعی اس رنگ کو خوب نباہا ہے۔ اور طرّہ یہ کہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ۔ تناسب لفظی کی صنعت کا لطف یہ ہے کہ یہ کسی مقام پر نہ معلوم ہو کہ فلان لفظ خواہ مخواہ شعر مین اس لئے بھر دیا گیا ہے کہ دوسرے لفظ سے تناسب رکھتا ہے اور یہ لطف گلزار نسیم مین ہے۔ مثلاً کیا خوب مصرع ہے۔ ع

سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجے

اس مصرع مین سایہ دھوپ کے ساتھ عجیب کیفیت دکھا رہا ہے لیکن دونون لفظ اس خوبصورتی سے آئے ہین کہ بالکل ایک دوسرے سے ملے ہوے بھی ہین اور الگ بھی۔ حالانکہ ایک کی رونق دوسرے کی وجہ سے دوبالا ہے لیکن یہ کوئی نہین کہہ سکتا کہ سایہ کا لفظ خواہ مخواہ دھوپ کے لئے لایا گیا ہے۔ اس مین شک نہین کہ اس صنعت کا خوبی کے ساتھ نباہنا آسان نہین ہے۔ یہ راہ بڑی کٹھن ہے۔ قدم قدم پر ٹھوکرین کھانے کا اندیشہ ہے۔ مثلاً امانت کے لئے تناسب لفظی کا شوق جنون کے درجے تک پہونچ گیا ہے لیکن چونکہ زبان پر قدرت کاملہ حاصل نہین ہے اور طبیعت مین شستگی کا جوہر نہین لہذا جو شعر اس رنگ مین کہا ہے اسے پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ فرماتے ہین۔ ؎

پانی نہ آبرو پہ پھرے بہر حرص مال　　　موتی ملین تو دانت نہ اپنے نکالیے

ایک اور شعر اسی رنگ مین ہے۔ ؎

قبر پر میری لگایا نیم کا اُس نے درخت　　　بعد مرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی

سبحان اللہ کیا تناسب الفاظ ہے نیم حکیم اور نیم مُلّا سنے تھے اِس شعر کا مصنف نیم شاعر ہے۔ ایک صاحب نے گلزار نسیم کا جواب کہا ہے اور چونکہ تناسب لفظی گلزار نسیم کا خاص جوہر ہے لہذا اُنھون نے بھی اِس رنگ کے شعر کہے ہین مگر لطافت سخن قائم نہ رکھ سکے۔ ایک شعر ان کا بھی تمثیلاً لکھا جاتا ہے

پاجی ہین شہر سینے سب اُجڑ جائین　　　بیری ہوے بیر کیڑے پڑ جائین

اپنے نزدیک اِن صاحب نے یہ شعر نسیم کے ذیل کے شعر کا جواب کہا ہے۔ ؎

سنبل مرا تازیانہ لانا　　　شمشاد اسے سولی پر چڑھانا

لیکن سخن شناس جانتے ہین دونون شعرون مین اندھیرے اُجالے کا فرق ہے۔ خلیل کا بھی

ایک شعر اس رنگ مین یاد آگیا۔ ؎

وہ شمع رو پتنگ اُڑاتا ہے شاید آج کچھ پیچ پڑ گیا ہے جو آنے مین ڈھیل کی

یا آند کہتے ہین۔ ؎

میلا ہے چاند گنج مین سورج گہن کا آج تم کس لئے نہ غیرتِ شمس و قمر گئے

قلق بھی طلسم الفت مین کہتے ہین۔ ع

قند لب پی رہے تھے گڑا گڑیان

ان اشعار کے تمثیلاً پیش کرنے سے محض یہ مُراد ہے کہ تناسُب الفاظ کا لطافت کے ساتھ نباہنا اک اُمر دشوار ہے۔ نسیم کو اس رنگ مین ید طولی حاصل ہے۔ الفاظ کے اُلٹ پھیر سے وہ کام لیا ہے کہ کلام کی رونق دوبالا ہو گئی ہے۔ آتش کا شعر ان کی شاعری پر صادق آتا ہے۔ ؎

بندش الفاظ جڑنے سے نگون کے کم نہین شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

اس سلسلہ مین یہ عرض کرنا مناسب ہے کہ کہین نسیم سے بھی تناسب الفاظ کے ساتھ لطافت سخن قائم نہین رہ سکی ہے۔ مثلاً کہتے ہین۔ ؎

ان مختصرون نے جب دیا طول بولی وہ بکاولی کہ معقول

پانی کے جو بلبلون مین تھا گل پہونچا لبِ حوض سے نہ جنگل

لیکن اس قسم کے اشعار کل مثنوی مین دو فی صدی سے زیادہ نہ ملین گے۔ لہذا قابل معافی ہین۔

اختصار جیسا کہ پیشتر لکھا گیا ہے اِس مثنوی کا عجیب جوہر ہے۔ واقعی دریا کو کوزے مین بند کیا ہے۔ کل مثنوی مین ایک شعر بھرتی کا مشکل سے ملیگا۔ بعض مقامات پر طول طویل مضامین کو

چند شعرون مین اِس خوبصورتی سے ادا کر دیا ہے کہ کسی قسم کی کوتاہی کا شبہہ بھی نہین ہو سکتا۔
مثلاً صحرائے طلسم کی داستان مین مندرجۂ ذیل دو شعر کتنے پُرمعنی ہین اور کس قدر اختصار سے پُر ہین۔

طوطا بن کر شجر پہ جا کر — پھل کھا کے بشر کا روپ پا کر
تیتے پھل گوند چھال لکڑی — اِس پیڑ سے لے کے راہ پکڑی

یا ایک مقام پر تین چار داستانون کا خلاصہ کس خوبی سے نظم کیا ہے۔

وہ جعل وہ ہار وہ غلامی — وہ گھات وہ جیتنا تمامی
وہ دسترس اور وہ پائے مردی — وہ بیکسی اور وہ دشت گردی
وہ دیو کی بھوک اور وہ تقریر — وہ حلوے کی چاٹ اور وہ تحریر
وہ سعی وہ دیونی کی صحبت — محمودا کی وہ آدمیّت
تجویز کی وہ سُرنگ کی راہ — اور موش دوانیان وہ دلخواہ
وہ سیرِ چمن وہ پھول لینا — وہ عزمِ وطن وہ داغ دینا
وہ کور کے حق مین خضر ہونا — وہ غولون سے مل کے پھول کھونا
وہ بال کو آگ پر دکھانا — وعدے پر دیونی کا آنا
وہ نزہتِ گلشنِ نگارین — وہ دعوتِ بادشاہ وہ تمکین
گذرا تھا جو کچھ بیان کیا سب — پنہان تھا جو کچھ عیان کیا سب

یا اکثر دو تین شعر کا مطلب ایک شعر مین ادا کر دیا ہے۔

تیورا کے وہین وہ یار بر دوش — بیٹھا تو گرا، گرا تو بیہوش

مفلس زردار امیر قلاش   نوکر تاجر فقیر خوش باش

اقرار مین تھی جو بے حیائی   شرمائی لجائی مسکرائی

پوچھا کہ سبب، کہا کہ قسمت   پوچھا کہ طلب، کہا قناعت

میر حسن کی مثنوی مین معاملہ برعکس ہے۔ اُس مین ہر مضمون کو ضرورت سے زیادہ طول دیا ہے۔ اور یہی اِس مثنوی کا بہت بڑا عیب ہے۔

علاوہ برین نسیم کے کلام مین وہ پختگی اور ترکیب مین وہ متانت ہے کہ اکثر اشعار کی بندش ملدمن فیضی کا دبدبہ یاد دلاتی ہے۔ واقعی کیا پُرشوکت کلام ہے۔

پر جیب سخن سدا ہے باقی   دریا نہین کار بند ساقی

مرغانِ ہوا تھے پرسش راہی   نقشِ کفِ پا تھے ریگِ ماہی

سائے کو پتا نہ تھا شجر کا   عنقا تھا نام جانور کا

جاگی مرغِ سحر کے غل سے   اُٹھی نکہت سی فرشِ گل سے

پانچوں سرپنجۂ وفا تھے　　یا مطلع خمسۂ صفا تھے

اے آئینہ دار خود نمائی　　وے سُرمۂ چشم آشنائی

اک شب تھی کہ خال روی شامت　　یا مردم دیدۂ قیامت

خورشید بصر گہن سے چھوٹا　　خیرات کے در کا قفل ٹوٹا

انسان سے جھکی پری کی گردن　　کانٹے سے رُکا ہوا کا دامن

نیم نے عموماً مضامین کو تشبیہہ و استعارہ کے پیرایہ میں ادا کیا ہے اور نہایت لطافت کے ساتھ مثلاً ذیل کے دو اشعار تشبیہہ کامل کا نمونہ ہیں۔ ؎

آنے لگے بیٹھے بیٹھے چکّر　　فانوس خیال بن گیا گھر

محرم جو ہٹی تھی اُس قمر کی　　بُرجوں پہ سے چاندنی تھی سرکی

لیکن بعض مقامات پر طبیعت نے تکلف کا پردہ اُٹھا دیا ہے اور سادگی سے کام لیا ہے ایسے اشعار جو ہیں وہ لاجواب ہیں اور ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ مثلاً

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے　　جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

غم راہ نہین کہ ساتھ دیجے   دُکھ بوجھ نہین کہ بانٹ لیجے

سمجھانے سے تھا ہمین سروکار   اب مان نہ مان تو ہے مختار

ہوتا ہے وہی خدا جو چاہے   مختار ہے جس طرح نباہے

پانی نہ خاک کو روان ہے   تو شعلہ کی سوے آسمان ہے

انسان وپری کا سامنا کیا   مٹھی مین ہوا کا تھامنا کیا

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجے   جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجیے

درویش روان رہے تو بہتر   آب دریا بہے تو بہتر

نسیم کی زبان بھی نہایت سلیس وپاکیزہ ہے - اوراسے لکھنؤ کی ٹکسالی زبان سمجھنا چاہئے۔ واقعی کیا خوب کہا ہے۔ ؎

لپٹی تھی جو زلف کروٹون مین   بل کھا گئی تھی کمر لٹون مین

نور آگیا چشم آرزو مین　　آیا پھر آب رفتہ جو مین

گل ہون تو کوئی چمن بتاؤن　　غربت زدہ کیا وطن بتاؤن

بیچا تو ٹکے کا جانور ہون　　گر ذبح کیا تو گُشت پر ہون

اِس نام کے اس لقب کے صدقے　　اِس نامہ کے اس طلب کے صدقے

کیون مُنہ پہ شفق خوشی سے پھولی　　کیا شامِ وصال راہ بھولی

مُنہ پھیر کے ایک مسکرائی　　آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی

چتون کو ملا کے رہ گئی ایک　　ہونٹون کو ملا کے رہ گئی ایک

کیا رنگ زمانے نے دکھائے　　گُل لینے گئے تھے داغ لائے

راتوں کو جو گنتے تھے ستارے　　　　دن گننے لگے خوشی کے مارے

گلزارِ نسیم کی زبان میں اور آج کل کی زبان میں کچھ فرق نہیں ہے۔ صرف بعض محاورے جو کہ نسیم کے وقت میں رائج تھے اب متروک ہوگئے ہیں۔ مثلاً نسیم کہتے ہیں۔ ؎

پَل مارنے کی ہوئی جو دیری　　　　سبحان اللہ شان تیری

اب "دیری" متروک ہے۔ "دیر" جو زیادہ فصیح ہے رائج ہے۔

یا ایک شعر ہے۔ ؎

ٹھہری یہ غرض کہ آج کی رات　　　　فیروز شہ آگے چھیڑیے بات

اب یوں کہیں گے فیروز شہ کے آگے چھیڑیے بات۔

غرضکہ تناسبِ لفظی، اختصار، پختگیٔ کلام، چستیٔ بندش، شوکتِ الفاظ، پاکیزگیٔ زبان اِس مثنوی کے خاص جوہر ہیں۔ اور استعاروں اور تشبیہوں سے جو مینا کاری کی ہے اُس نے اور حسن دوبالا کر دیا ہے۔ اِس مثنوی کے مقبول ہونے کا راز یہی ہے کہ باوجود اِس اختصار کے یہ اتنے محاسن کا مجموعہ ہے۔ اور حق یہ ہے کہ زمانہ نے جیسی اِس کی قدر کی اُس پر ہر مصنف کو ناز ہو سکتا ہے۔ پسندِ عام کے ساتھ قبولِ خاص کا شرف گلزارِ نسیم کو حاصل ہے۔ نقادانِ سخن کا سرتاج اور اُردو زبان کا مُستند مورخ محمد حسین آزاد لکھتا ہے "پنڈت دیا شنکر نسیم نے گلزارِ نسیم لکھی اور بہت خوب لکھی۔ اِس کی عام و خاص سب میں شہرت ہے۔ اِس کے نکتے اور باریکیوں کو سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر سب لیتے ہیں اور پڑھتے ہیں جتنی سمجھ میں آتی ہے اُس پر خوش ہوتے ہیں اور لوٹے جاتے ہیں .... ہمارے ملکِ سخن میں سیکڑوں مثنویاں لکھی گئیں۔ مگر ان میں

فقط دو نسخے ایسے نکلے جنھون نے طبیعت کی موافقت سے قبول عام کی سند پائی۔ ایک سحرالبیان دوسری گلزار نسیم " (آب حیات) مگر طبائع کا رنگ مختلف ہے۔ جہان منصف مزاجون نے گلزار نسیم کی قدر دانی سے آبیاری کی وہان اکثر نگاہون مین اِس باغ کی شادابی کانٹا بنکر کھٹکی ان حضرات نے اپنی اپنی ہئیت کے موافق نسیم کی شہرت پر خاک ڈالنے کی فکر کی ہے۔ چنانچہ اب تک اکثر لوگ کہتے ہین کہ آتش نے یہ مثنوی کہہ کر نسیم کو دے دی تھی۔ لیکن میری رائے مین اس دعوے بے دلیل پر چین بہ جبین ہونا بیکار ہے۔ ایک معنی مین یہ بیان قدر دانانِ نسیم کے لئے باعث فخر ہے۔ اِس سے بڑھ کر نسیم کی شاعری کی تعریف کیا ہو سکتی ہے۔ کہ اس کا کلام آتش ایسے زبردست اُستاد کی طرف منسوب کیا جائے۔ حالانکہ سخن شناس جانتے ہین کہ جس رنگ مین گلزار نسیم کہی گئی ہے اس رنگ مین آتش نے اپنی زندگی مین ایک شعر نہین کہا۔

ایک تذکرہ نویس صاحب فرماتے ہین کہ نسیم مشرف باسلام تھے۔ اس کا جواب مجھے نہین آتا۔ خیر یہ تو پرانے زمانے کے لوگون کی طبّاعی ہے۔ اِس زمانہ مین مولانا حالی نے گلزار نسیم کو اپنے اشہب قلم سے پامال کرنا چاہا ہے۔ آپ فرماتے ہین کہ "مثنوی لکھنے والے کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ بیتون اور مصرعون کی ترتیب ایسی سنجیدہ ہو کہ ہر مصرع دوسرے مصرع سے اور ہر بیت دوسری بیت سے چسپان ہوتی چلی جاے مصنّف گلزار نسیم نے اِس کا لحاظ نہین کیا۔ گلزار نسیم مین دو شعر اِس صورت پر ہین۔ ؎

خوش ہوتے تھے طفل مہ جبین سے ثابت یہ ہوا ستارہ بین سے
پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو پھر دیکھ نہ سکیے گا کسی کو

جو مطلب کہ مصنف ادا کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ لوگ تو اس طفل مہ جبین کو دیکھکر خوش ہوتے تھے مگر نجومیون نے بادشاہ سے یہ کہا کہ لڑکا آپ کو پیارا تو ہے مگر یہ ایسا پیارا ہے کہ اس کو دیکھکر پھر کسی کو نہ دیکھ سکیے گا۔ (کیونکہ اس کو دیکھ کر بینائی جاتی رہیگی) ظاہر ہے کہ ان دونون بیتون مین جب تک کئی لفظ بڑھائے اور جب تک کئی لفظ بدلے نہ جائین تب تک یہ مطلب جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے ان بیتون سے سیدھی طرح نہین نکل سکتا اور مصرع دوسرے مصرع سے اور دوسرا مصرع تیسرے مصرع سے چسپان نہین ہو سکتا (مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۹۵ سطر ۴ - ۱۶) اس کے جواب مین صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ اگر مولانا حالی گلزار نسیم کا کوئی صحیح نسخہ ملاحظہ فرماتے تو مولانا موصوف کو اس اعتراض کی تکلیف نہ گوارا کرنی پڑتی۔ آج کل گلزار نسیم کے بیشمار نسخے شایع ہوتے ہین جن مین سیکڑون جگہ کاتب کی اصلاحین ہوتی ہین۔ اور تو اور اکثر اشعار ان نسخون سے غائب ہین۔ اور جو ہین ان کی ترتیب مین غلطی ہے۔ چنانچہ یہ دو شعر بھی جو مولانا حالی کی طبع گرامی کے بار خاطر ہوے صحیح نسخے[1] مین اس صورت پر ہین۔

---

[1] یہ نسخہ کمیاب ضرور ہے لیکن لکھنؤ مین پرانے بزرگون کے پاس ملیگا۔ اس نسخے کی شناخت یہ ہے کہ اس کے آخر مین ذیل کی عبارت درج ہو "... بشارت و یا شنکر متخلص بہ نسیم کہ در فن شاعری کمالے بہم رسانیدہ اند...... قصۂ تاج الملوک بکاولی را از نثر بہ نظم آوردہ بہ گلزار نسیم موسوم ساختہ بود..... در بیت السلطنت لکھنؤ بمحلہ محمود نگر متصل اکبری دروازہ در مطبع حسینی سیدی سندی میر حسن رضوی ولد میر حسین عرف میر کامل مرحوم و مغفور بہ تصحیح و مقابلہ مصنف حلیۂ طبع پوشید"۔ اس نسخے مین مصنف کی طبعزاد تاریخ طبع مثنوی بھی درج ہے جو کہ آج کل کے نسخون مین نہین ملتی ہے۔

اے خالق کردگار شکرا ۔ شکرا شکرا ہزار شکرا ۔ کین جملہ ز ابتدا خبر داد ۔ شاخ قلم چنین ثمر داد
در عہد خلافت شہنشاہ ۔ امجد علی شاہ خلد اللہ ۔ سید حسن آنکہ طبع پاکش ۔ چون مطلع اوست خوب و دلکش
از سمع رضا شنید و بستود ۔ در مطبع خویش طبع فرمود ۔ چون زیور طبع یافت پوشید ۔ بہر تاریخ طبع کوشید
گلزار نسیم شد چو مسموع ۔ گل گفت کہ تازہ گشت مطبوع
۱۲۶۰

یہ نسخہ ہمارا اسی پرانے نسخے کی نقل ہے۔ گو اس پرانے نسخے مین بھی چھاپے کی غلطیان موجود ہین مگر بہت کم۔

خوش ہوتی ہے طفل مہ جبین سے ثابت یہ ہوا ستارہ بین سے
پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو پھر دیکھ نہ سکیے گا کسی کو

اب مطلب صاف ہے اور مصرعون مین کامل ربط ہے یعنی طفل مہ جبین سے خوش ہوتی ہو ستارہ بین سے یہ ثابت ہوا کہ یہ لڑکا پیارا تو ہے مگر اس کو دیکھ کر پھر کسی کو نہ دیکھ سکے گا۔

دوسرا اعتراض ملاحظہ ہو۔ نسیم کا شعر ہے۔

نور آنکھ کا کہتے ہین پسر کو
چشمک تھی نصیب اس پدر کو

مولانا حالی فرماتے ہین کہ بیٹا باپ کی آنکھ کا نور ہوتا ہے۔ مگر یہ بیٹا باپ کی آنکھون کے لئے ظلمت تھا پس جب تک دوسرے مصرع کے الفاظ نہ بدلے جائین کلام مربوط نہین ہو سکتا۔ (مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۱۶) مین اس اعتراض کی تہ کو بالکل نہین پہونچا۔ مجھکو یہ شعر کسی طرح پر بے ربط نہین نظر آتا۔ جو مضمون مولانا حالی نے نثر مین بیان کیا ہے وہی نظم کے پیرائے مین ظاہر کیا گیا ہے۔ نسیم کے اس شعر پر اعتراض کرنا ہوا سے لڑنا ہے۔

تیسرا اعتراض مولانا حالی کا یہ ہے کہ نسیم کا ذیل کا شعر اصلاح طلب ہے۔

آتا تھا شکارگاہ سے شاہ
نظارہ کیا پدر نے ناگاہ

آپ فرماتے ہین کہ اس شعر کے دونون مصرع مربوط نہین ہین کیونکہ ظاہر الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے کہ "شاہ" اور شخص ہے اور پدر اور شخص ہے۔ حالانکہ پدر اور شاہ سے ایک ہی

شخص مُراد ہے۔ (مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۹۶ سطر ۴-۱)

اِس اعتراض کی نسبت صرف اس قدر عرض کرنا کافی ہے کہ اصل شعر اس صورت پر ہے

آتا تھا شکار گاہ سے شاہ
نظارہ کیا پسر کا ناگاہ

ابھی لکھنؤ میں ایسے بزرگ موجود ہیں جن کو قریب قریب کل مثنوی حفظ ہے ان کی زبان سے یہ شعر اسی صورت پر سُنا گیا ہے۔

نسیم نے بکاؤلی کے اضطراب کے بیان میں چند شعر کہے ہیں۔

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں — آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں
جامے سے جو زندگی کے تھی تنگ — کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ
یکچند جو گذری بے خور و خواب — زائل ہوئی اس کی طاقت و تاب
صورت میں خیال رہ گئی وہ — ہیئت میں مثال رہ گئی وہ

مولانا حالی فرماتے ہیں کہ ان اشعار میں تیسرے شعر کے سوا باقی تین شعروں کا مطلب کچھ نہیں معلوم ہوتا اور بظاہر مصنف نے کوئی مطلب رکھا بھی نہیں ہے۔ مصنف کو تو فقط یہ لطیفہ بیان کرنا مقصود ہے کہ کھانے کی جگہ قسمیں کھاتی تھی پینے کی جگہ آنسو پیتی تھی۔ اور کپڑوں کے عوض رنگ بدلتی تھی۔ (مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۲۱۵ سطر ۲-۹)

مجھ کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مولانا موصوف اُصول شاعری سے بیخبر ہیں۔ نازک خیالی اور بلند پروازی جو کہ اعلیٰ درجے کی شاعری کے جوہر ہیں ان اشعار میں موجود ہیں۔ پھر ان کو

بے معنی کہنا چہ معنی دارد۔ وجہ یہ ہے کہ مولانا حالی مغربی شاعری کی پیروی کی فکر مین انگریزی نظمون کے ترجمے پڑھتے ہین اور چونکہ غیر زبان مین ترجمہ ہونے سے ان نظمون کے نازک خیالی اور بلند پروازی کے جوہر تشریف لے جاتے ہین اور استعارون اور تشبیہون کی پیچیدگیان قائم نہین رہتین لہذا آپ خیال کرتے ہین کہ مغربی شاعری کا اصول یہ ہے کہ عبارت سادہ نظم کردی جائے اور اِس خیال کے موافق اُردو کے جن اشعار مین آپ نازک خیالی اور باریک بینی کی وجہ سے کسی قسم کی پیچیدگی پاتے مین اُس کو بے معنی اور مہمل قرار دیتے ہین لیکن یہ یاد رہے کہ محض عبارت سادہ نظم کرنا شاعری نہین ہے۔ شاعری کی عام تعریف یہ ہے کہ نثر سے زیادہ دلکش اور پُرتاثیر ہو۔ نثر کا انداز یہ ہے کہ جو مضمون بیان کیا جائے وہ نہایت فصاحت کے ساتھ بیان کیا جائے اور الفاظ کی بندش ایسی ہو کہ ان سے ایک خاص معنی صاف طور پر پیدا ہون۔ برخلاف اِس کے شاعری مین یہ اصول مدنظر رہتا ہے کہ جو مضمون باندھا جائے اختصار کے ساتھ باندھا جائے اور محض ایک حالت کا اشارہ کرے۔ ترکیب الفاظ ایسی ہو کہ اِس حالت کی نسبت مختلف نقشے پڑھنے والے کی آنکھون کے سامنے گذر جائین۔ اگر اِس اصول کو پیش نظر رکھ کر اشعار مرقومہ بالا کی وقعت کا اندازہ کیا جائے تو وہ بےمعنی نہ نظر آئین گے بلکہ ایک کوزہ دریا نوش کی کیفیت نمایان کرین گے۔ مثلاً پہلے شعر کے معنی یہ ہین کہ" اُس کے دل پر فراق یار کا صدمہ ایسا تھا کہ کھانے پینے کی اس کو مطلق فکر نہ تھی اگر کوئی شخص اس قسم کا ذکر بھی کرتا تھا تو ٹال دیتی تھی۔ پس دن رات ضبط گریہ کیے پڑی رہتی تھی اگر کوئی کھانے پینے پر اصرار کرتا تھا تو قسمین کھاتی تھی کہ مین نہ کھاؤن گی"۔ یہ ظاہر ہے کہ نثر مین یہ مضمون اس وضاحت کے ساتھ وہ لطف نہین دیتا

جو لطف کہ نظم میں اختصار کے ساتھ پیدا کرتا ہے اسی طرح دوسرے شعر کا مطلب یہ ہے کہ "وہ اپنی زندگی سے تنگ تھی۔ اپنی آسایش کا اُس کو مطلق خیال نہیں رہتا تھا۔ یہاں تک کہ کپڑے بھی نہیں بدلتی تھی۔ بیشک طرح طرح کے صدمے جو اُس کے دل پر گذرتے تھے تو اسکے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا" چوتھا شعر سچی شاعری کی تصویر ہے۔ اس میں مصنف نے اپنی قوت خیال کا کمال دکھایا ہے اِس کے معنی یہ ہیں کہ" وہ ایسی نحیف و زار ہو گئی تھی کہ اس کی شکل دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ بس ایک تصویر خیالی روبرو ہے جس میں نہ دم ہے نہ تاب و توان ہے۔ اِس کی عجیب ہیئت ہو گئی تھی۔ بس ایک سکتے کا عالم طاری تھا عالم اجسام کے رہنے والوں کی اِس میں کوئی بات باقی نہیں رہی تھی وہ اپنی اگلی ہستی کا محض ایک شبہہ ہو کر رہ گئی تھی"۔

ان اعتراضات کو دیکھ کر انیس مرحوم کا ایک قطعہ یاد آتا ہے[1]۔

مزہ یہ طرفہ کہ مضمون تو دستیاب نہیں ‏ ‏ ‏ ‏ مقابلے پہ چڑھاتے ہیں آستینوں کو
غلط یہ لفظ وہ بندش بُری وہ مضمون سُست ‏ ‏ ‏ ‏ ہنر عجیب ملا ہے یہ عیب بینوں کو

لیکن ان نکتہ چینیوں سے نسیم کی شہرت میں فرق نہیں آ سکتا۔ جب تک اُردو شاعری کا مذاق قائم ہے اور طبیعتوں میں جوہر شناسی کی قابلیت باقی ہے گلزار نسیم کی تازگی قدر دانان سخن کے

---

[1] مولانا حالی کے اعتراضات کی نسبت صرف میری ہی یہ رائے نہیں۔ میرے ایک دوست اور مولانا شبلی سے گلزار نسیم کی نسبت کچھ خط و کتابت ہوئی تھی۔ مولانا شبلی نے اپنی ایک تحریر میں صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ گلزار نسیم کی تنقید میں مولانا حالی نے سخت بیرحمی اور ناانصافی سے کام لیا ہے ۱۲

نوٹ — اُستادانِ سخن کے سرتاج اور ایک با انصاف شخص کو ان القابات سے ملقب کرنا گویا انصاف کا خون کرنا ہے [illegible] علامہ شبلی کی رائے سے زیادہ وقیع نہیں ہو سکتی۔

دماغ کو فرحت بخشتی رہیگی۔ ہان جن لوگون کے دماغ مین تعصب کی ہوا بھری ہے وہ اس گلزار مین پھول ہٹا کر کانٹے چنا کرین گے۔

صرف اکثر احباب کے اصرار نے مجبور کیا ورنہ مین ان اعتراضات کا ذکر بھی نہ کرتا۔ کیونکہ ایسے بے بنیاد اعتراضون کو زمانہ خود فنا کر دیتا ہے۔ ان کی تردید کرنا فعل عبث ہے علاوہ مثنوی کے نسیم کا غزلون کا چھوٹا سا دیوان بھی ہے لیکن ناتمام۔ بہت سی غزلین جو تلف ہو گئین ان کا نام و نشان بھی اِس دیوان مین نہین ملتا۔ سن رسیدہ حضرات سے معلوم ہوا کہ چند غزلین اکثر احباب نے اپنی تصنیف کی اس دیوان مین رکھدی ہین۔ یہ مفت کرم داشتن کا نرالا مضمون ہے۔ مگر یہ غزلین صاف نسیم کے اصل کلام سے الگ معلوم ہوتی ہین۔ چونکہ نسیم کی وفات کے بہت روز بعد یہ دیوان شایع ہوا۔ لہذا لوگون کو اِس دست اندازی کا موقع ملا۔ بہرحال جو ذخیرہ اشعار کا نسیم کے زور طبیعت کا یادگار ہے وہ واقعی قدر و منزلت کی نگاہون سے دیکھے جانے کے قابل ہے۔ اکثر مقامات پر طبیعت کی بلند پروازی اور معنی آفرینی قیامت کرتی ہے مثلاً ؎

بجز گور غریبان نقش پا تھے پھر نہین آگے — یہین تک ہر مسافر نے پتا پایا ہے منزل کا
نسیم اپنے ہی اعمالون سے گردش ہو زمانے کی — روان کشتی پہ آتا ہے نظر ہر نخل ساحل کا

اے مرغ دل تو شاخ نشیمن سے گر پڑا — حیف آشیان بلند ہے پرواز پست ہے
تھے محو زلف دیدۂ تر دل بھی آپھنسا — مچھلی کو کیا خبر تھی کہ پانی مین شست ہے

گر یہی ہے اِس گلستان کی ہوا　　شاخِ گل اک روز جھونکا کھائیگی
جان نکل جائیگی تن سے اے نسیم　　گل کو بوے گل ہوا بتلائیگی

طریق شعر وسخن مین اگر نہین اعجاز　　قلم کی طرح سے ہر اک شکستہ پا چلتا

ذرّے کا بھی چمکیگا ستارہ　　قائم جو زمین و آسمان ہے

معنی روشن جو ہو تو سو سے بہتر ایک شعر　　مطلع خورشید کافی ہے پے دیوان صبح

اِس مین شک نہین کہ نسیم کا کلام آتش و ناسخ و ذوق و غالب کے کلام کا ہم پایہ نہین ہے - یہ لوگ آسمان سخن کے تارے ہین - اِن کے برابر کسی کو عروج نہین حاصل ہوا لیکن غزل گوئی کے میدان مین نسیم رند، صبا وغیرہ سے پیچھے نہین ہین - تینون اُستادون کی ہم طرح غزلون کے انتخاب درج ذیل ہین - جن غزلون مین ایک ہی مضمون کے شعر ملے وہ بھی پہلو بہ پہلو لکھ دیے گئے ہین - سخن شناس نگاہ انصاف سے دیکھین -

نسیم　　صہباکشون کی خاک ہے ہر اک مقام پر　　ساقی لُنڈھا شراب کو مستون کے نام پر
صبا　　لائی ہے مجھ کو وحشتِ دل اس مقام پر　　ہنسنے کی جا ہے قیس کے سودا ے خام پر
رند　　پڑتی ہے آنکھ جب مری مینا و جام پر　　سو سو درود پڑھتا ہون ساقی کے نام پر
نسیم　　دل سے ہر دم ہمین آواز بکا آتی ہے　　بند کانون کو بھی گریہ کی صدا آتی ہے

رند — تیرۂ و تار دھوان دھار گھٹا آتی ہے — میکشو فصلِ مئے ہوش ربا آتی ہے
نسیم — گل ہوا کونی چراغِ سحری و بلبل — ہاتھ ملتی ہوئی پتون سے صبا آتی ہے
رند — جانبِ خانۂ خمار سے کیا آتی ہے — لڑکھڑاتی ہوئی جو بادِ صبا آتی ہے
نسیم — چھو لیا دھوکے سے دامانِ صبا تو نے تو کیا — غنچۂ گل کہین مٹھی مین ہوا آتی ہے
رند — یہ پتا کوچہ کا اُس حور کے سُن رکھ قاصد — لو ن ٹھین چلتی ہی جنت کی ہوا آتی ہے
نسیم — خم نہ بن کر خود غرض ہو جائیے — مثل ساغر اور کے کام آئیے
رند — دھوپ دن کی اوس شب کی کھائیے — آستانِ یار پر مر جائیے
نسیم — آپ آہو چشم ہین آہو نہین — ہم سے وحشت کی نہ لیجیے آئیے
رند — مجھ سے بیہودہ نہ گرمی کیجیے — ٹھنڈے ٹھنڈے آپ گھر کو جائیے
نسیم — ابرِ رحمت سنتے ہین نام آپ کا — خاکسارون پر کرم فرمائیے
رند — دن کو تو تشریف تم لاتے ہو روز — شب کو بھی اک دن کرم فرمائیے
نسیم — جوہرِ تیغ نگہ کھل جائے گا — منہ نہ میرے زخم کا کھلوائیے
رند — کچھ کرون گا مین بھی اب خدمت مین عرض — چپکے رہیے منہ نہ اب کھلوائیے
نسیم — لائے اُس بت کو التجا کر کے — کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے
رند — کیا ملا عرض مدعا کر کے — بات بھی کھوئی التجا کر کے
نسیم — جب ہو چکی شراب تو مین مست مر گیا — شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا
صبا — واعظ کے مین ضرور ڈرانے سے ڈر گیا — جامِ شراب لائے بھی ساقی کدھر گیا

نسیم — روحِ رواں نسیم کی حالت میں کیا کہوں — جھونکا ہوا تھا اِدھر آیا اُدھر گیا

صبا — مثلِ حبابِ بحرِ جہاں میں نہ دم لیا — اِک موج تھا کہ میں اِدھر آیا اُدھر گیا

نسیم — گذرا جہاں سے میں تو کہا ہنس کے یار نے — قصہ گیا فساد گیا دردِ سر گیا

صبا — اچھا ہوا جو ہو گئے وحدت پرست ہم — فتنہ گیا فساد گیا شور و شر گیا

نسیم — ہے رنجِ عشق میرے لئے میں برائے رنج — خود بھی مٹے یقین ہے جو مجھکو مٹائے رنج

صبا — دل ہے غذائے رنج جگر ہے غذائے رنج — پیدا کیا ہے ہمکو خدا نے برائے رنج

نسیم — یا تنگیِ کنار تھی یا اب فشارِ قبر — وہ ابتدائے عیش تھی یہ انتہائے رنج

صبا — آدم سے باغِ خلد چھٹا ہم سے کوے یار — وہ ابتدائے رنج ہے یہ انتہائے رنج

نسیم — ہم شیشۂ شکستہ ہیں تم کیف موج مے — بنیادِ عیش تم سے ہے ہم سے بنائے رنج

صبا — اے صانعِ ازل مری مٹی خراب کی — کیا چاہیے تھی خانۂ دل میں بنائے رنج

نسیم — زاروں سے ڈر گئے بھولیے زر پہ نہ زور پر — کیجے نگاہ حال سلیمان و مور پر

اک عمر سے وظیفہ ہے صاحب کے نام کا — ناخن کے خط ہیں انگلیوں کی پور پور پر

صبا — اگلی برس جنون جو رہا زور و شور پر — زنجیر ہم چڑھائیں گے مجنون کی گور پر

دنیا تمام بازیِ شطرنج باز ہے — مہروں کی طرح ایک کے ہے ایک زور پر

نسیم — کسی کے دل سے نہ یارب کوئی خراب کرے — نہ شیشہ طاق سے نے شیشے سے شراب گرے

تمہارے دور میں گر خاک پر شراب گرے — پڑے زمیں پہ اُفتاد آفتاب گرے

صبا — کہوں میں اپنی جو اُفتاد بزمِ ساقی میں — سبو سے بادہ گرے سیخ سے کباب گرے

صبا — بغیر یار ہوئی بزم سے تہ و بالا — شراب خم سے نہی سیخ سے کباب گرے

نسیم — منّت دلا کسی کی نہ اصلا اُٹھائیے — مرجائیے نہ ناز مسیحا اُٹھائیے

صبا — اُفتادگی سے خاک سر اپنا اُٹھائیے — ممکن نہین کہ نقش کف پا اُٹھائیے

نسیم — چاہ اپنی مانتا نہین وہ بے یقین اگر — قرآن کا جامہ پہنئے گنگا اُٹھائیے

صبا — اُس بُت کو اعتبار کسی بات کا نہین — قرآن سر پہ رکھیے کہ گنگا اُٹھائیے

نسیم — فراق دیدہ ہون مین وصل یار باقی ہے — خزان رسیدہ چمن کی بہار باقی ہے

ہوا تو کہتی ہے صاف آمد بہار چمن — صدائے غنچۂ وحدت ہزار باقی ہے

جنون و عقل کے قصّے سے چھوٹے بعد فنا — نہ پردہ در ہے نہ وہ پردہ دار باقی ہے

بتون کے قہر سے ہم کو مقام یاس نہین — اُمید رحمت پروردگار باقی ہے

صبا — نہ جیب کا ہے نہ دامن کا تار باقی ہے — جنون کا جوش ہے فصل بہار باقی ہے

خدا کے واسطے کلمہ بتون کا پڑھ واعظ — زبان تر ہے ابھی اختیار باقی ہے

ہزار حیف اسے بھی فلک مٹا دیگا — کہین کہین جو یہ نقش و نگار باقی ہے

پھنسائیگا مجھے دشت جنون کے کانٹون مین — یہ ایک آدھ جو دامن کا تار باقی ہے

نسیم — کیون خفا رشک حور ہوتا ہے — آدمی سے قصور ہوتا ہے

جس کو دیکھو وہ اِس زمانے مین — اپنے نزدیک دور ہوتا ہے

خاکساری وہ ہے کہ ذرّون پر — روز باران نور ہوتا ہے

صبا — بندہ اب ناصبور ہوتا ہے — عفو ہووے قصور ہوتا ہے

پرتوِ رخ سے ان کا جیب قبا دامن کوہ طور ہوتا ہے

اے صبا جب بہار آتی ہے ہم کو سودا ضرور ہوتا ہے

اِس موقع پر یہ لکھنا غیر مناسب نہین کہ گو یہ آتش کے شاگرد تھے لیکن آتش کی گرمی سخن ان کے کلام مین نہین پائی جاتی۔ ان کی شکل پسند طبیعت نے ناسخ کا رنگ پسند کیا مگر باوجود اس تصنّع کے جو کہ اس رنگ کا خاص جوہر ہے نسیم کا کلام بالکل بے نمک نہین ہے۔ طبیعت مین ایک خداداد کیفیت ہے جو کلام کو مزیدار بنا دیتی ہے۔

شاعری کا رنگ تو دیکھ چکے اب طبیعت کا رنگ ملاحظہ ہو۔ سُنا جاتا ہے کہ بڑے ظریف و بذلہ سنج آدمی تھے تیزی ذہن و ذکاوت طبع کا عجیب عالم تھا۔ حاضر جوابی تیغ زبان کا جوہر تھی۔ انہین صفات خاص نے ان کا وقار معصر شعرا مین قائم کیا۔ اگر یہ جوہر نہ ہوتے تو کون پوچھتا۔ اُس زمانے مین لکھنؤ کل ہندوستان کی تہذیب و تربیت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ گو کہ اردو شاعری کے زوال کا زمانہ قریب آ چکا تھا لیکن جیسے چراغ کی روشنی بجھنے کے پیشتر تیز ہو جاتی ہے اسی طرح اس زمانے نے شعر و سخن کا ایسا عروج دیکھا کہ باید و شاید۔ آتش و ناسخ کی جادو نگار طبیعتین اپنا زور دکھا رہی تھین۔ انیس و دبیر فن مرثیہ گوئی کو عرش پر پہونچا رہے تھے۔ خواجہ وزیر صبا رند و خلیل وغیرہ کی نوجوان اور شوخ طبیعتین ایک طرف قیامت برپا کر رہی تھین۔ اِس زمانے مین ایک ہندو شاعر کے لئے شعرا کے زمرہ مین اپنا وقار قائم کرنا آسان کام نہ تھا لیکن نسیم نے اپنے کلھاے مضامین کا سب کو ہزار جان سے شیدا بنا لیا۔ ایسے ایسے معرکے جیتے کہ دھاک بیٹھ گئی۔ ایک مشاعرے مین نسیم نے مطلع پڑھا۔ ؎

منّت دلا کسی کی نہ اصلاً اُٹھائیے

مرجائیے نہ نازِ مسیحا اُٹھائیے

آتش بھی اِس مشاعرے مین موجود تھے۔ انہون نے نسیم کی بہت تعریف کی اور کہا کہ میرا مطلع اِس کے آگے گرد ہے۔ مطلع آتش ؎

جان بخش لب کے عشق مین ایذا اُٹھائیے

بیمار ہو کے نازِ مسیحا اُٹھائیے

خصوصاً نسیم کی حاضر جوابی و موزونی طبع کے سب قائل تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہین شاعرے کی صحبت تھی یہ بھی وہان موجود تھے۔ قبل مشاعرہ شروع ہونے کے شیخ ناسخ نے ان کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ پنڈت صاحب ایک مصرع کہا ہے دوسرا مصرع نہین سوجھتا کہ پورا شعر ہو جائے۔ انہون نے جواب دیا فرمائیے۔ ناسخ نے مصرع پڑھا۔ ع

" شیخ نے مسجد بنا مسمار بتخانہ کیا "

ان کے مُنہ سے یہ مصرع نکلنے کی دیر تھی کہ یہان دوسرا مصرع تیار تھا۔ ع

" تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا "

اِس مصرع کا سُننا تھا کہ حاضرین جلسہ پھڑک اُٹھے اور ہر طرف سے نعرہائے تحسین بلند ہوئے۔ شیخ ناسخ نے شاعری کی آڑ مین مذہبی چوٹ کی تھی لیکن نسیم نے ٹھنڈا کر دیا۔ اسی طرح ایک شخص نے مشاعرے مین ایک شعر پڑھا جس کا دوسرا مصرع یہ تھا۔ ع

"جانبِ ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہین"

پہلا مصرع کچھ پھس سا تھا۔ نسیم کے مُنہ سے بیساختہ نکل گیا کہ دوسرا مصرع تو خوب ہے لیکن پہلا مصرع ٹھیک نہین۔ وہ صاحب بھی جلے تن تھے ان کے کان تک یہ بات پہونچی تھی کہ جھنجھلا کر بولے کہ اچھا اِس سے بہتر مصرع کہہ دیجیے۔ یہان تو مضامین ہر وقت ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہتے تھے اُسی وقت مصرع موزون کر کے سُنا دیا

تیرہ دل کی بزم مین جامِ شراب آتا نہین
(جانبِ ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہین)

نسیم کی شاعرے مین دھاک بیٹھ گئی وہ بیچارہ ذلیل ہو گیا۔

ایک روز آتش کے یہان شاگردون کا جمگھٹا تھا۔ رند صبا خلیل وغیرہ بیٹھے ہوے تھے نسیم بھی موجود تھے۔ صبح کا سُہانا وقت، برسات کا موسم مینہ برستا ہوا عجیب کیفیت تھی۔ موسم بہار سے کچھ ایسی طبیعتین مست ہوئین کہ شاگردون نے آتش سے فرمائش کی کہ اُستاد اس وقت ایک غزل کہہ ڈالئے۔ گو کہ آتش کا بُڑھاپا تھا لیکن طبیعت مین جوانی کا زور بھرا تھا۔ فی البدیہہ اشعار موزون کرنے شروع کر دیے اور کہا کہ لکھتے جاؤ۔ جس غزل کا مطلع ہے۔ ؎

دہن پر ہین اُن کے گمان کیسے کیسے
کلام آتے ہین درمیان کیسے کیسے

وہ اسی موقع کی کہی ہوئی ہے۔ نسیم کی طبیعت بھی جوش بہار سے لہرائی ہوئی تھی۔ اُنھون نے ان اشعار کی تخمیس کرنی شروع کر دی۔ جتنی دیر مین آتش دوسرا شعر سوچتے تھے یہ اس عرصے مین

ان کے پہلے شعر پر تین مصرعے لگا چلتے تھے۔ اور بعض بعض مصرعے تو واقعی اس انداز سے لگائے ہین کہ اگر کوئی برسون فکر مین سرگریبان رہے تو اس سے بہتر مصرع نہین لگا سکتا آتش کے دو شعرون کی تخمیس مثالاً لکھی جاتی ہے۔ ؎

نہ خونی کفن ہین نہ گھائل ہوے ہین | نہ زخمی بدن ہین نہ بسمل ہوے ہین
لہو مل کے کشتون مین داخل ہوے ہین | تمہارے شہیدون مین شامل ہوئے ہین

گل ولالہ وارغوان کیسے کیسے

کوئی جانتا ہے کسی کو خبر ہے | کہ پردے مین کون اے صنم جلوہ گر ہے
کہین کچھ خیال اور کہین کچھ نظر ہے | دل و دیدۂ اہل عالم مین گھر ہے

تمہارے لیے ہین مکان کیسے کیسے

اسی طرح چودہ پندرہ شعر کی غزل پر مصرع لگائے ہین۔

آتش کے شاگردون مین صبا سے ان سے بہت یارانہ تھا۔ ان کے مرنے پر صبا نے ایک شعر کہا جو کہ واقعی درد دل کی تصویر ہے۔ ؎

اُٹھ گئے ہین نسیم جس دن سے
اے صبا وہ ہوا ے باغ نہین

لیکن رند سے چشمک تھی۔ چنانچہ ایک مشاعرے مین نسیم نے رند کی ایک مشہور غزل پر خمسہ پڑھا۔ جس کا مقطع یہ تھا۔ ؎

وصل انسان کا پریزادون کا ہو، ہے دشوار | فائدہ کچھ نہین تم مفت مین کیون ہوتے ہو خوار

کہتے کہتے تو ہوے تم کو نسیم اب لاچار عشق کو ترک کرو یا نہ کرو ہو مختار
نیک و بد ہم ہین تمہین رند سمجھاتے جاتے

اِس مصرع کا زبان سے نکلنا تھا کہ۔ ع کہتے کہتے تو ہوے تم کو نسیم اب لاچار۔ کہ رند نے سرِ مشاعرہ تلوار کھینچ لی اور نسیم سے برسرپیکار ہونے کا ارادہ کیا۔ نسیم کے مزاج مین بھی بانکپن تھا یہ بھی اُٹھ کھڑے ہوے اور کہنے لگے کہ تلوار پر نہ بھولنا۔ یہان چھٹرون سے تلوار چھین لیتے ہین لیکن آفتاب الدولہ قلق وغیرہ اِس مشاعرے مین موجود تھے اُنھون نے بگڑی ہوئی طبیعتون کو سنبھالا اور بھڑکتی ہوئی آگ پر پانی ڈالا۔ اور رند سے کہا کہ بندہ نواز یہ تلوار کا مقام نہین۔ یہان زورِ قلم سے کام لیجیے۔ اس ہنگامہ آرائی کی وجہ یہ تھی کہ رند جو کہ ایک رنگین مزاج اور عاشق تن آدمی تھے اِس زمانے مین ایک بارگاہ حُسن کے اُمیدوارون مین تھے لیکن قسمت کی نارسائی سے منزلِ مقصود تک رسائی نہین ہوئی تھی۔ تلوّن مزاجی نے اس مایوسی کی حالت کو غیظ وغضب سے بدل دیا تھا۔ نسیم نے اس خمسہ مین درپردہ اسی کیفیت کا اشارہ کیا تھا۔ رند کے چوٹ کھاے ہوے دل پر یہ طعن آمیز نصیحت گران گذری اور اس معرکے کا باعث ہوئی۔ علاوہ برین اسی غزل مین رند کا ایک شعر ہے۔ ؎

راستہ روک کے کہ لونگا جو کہنا ہے مجھے
کیا ملوگے نہ کبھی راہ مین آتے جاتے

نسیم نے ایک صحبت مین اِس شعر کا دوسرا مصرع پڑھا تو مذاقاً "ملوگے" تانیث کے ساتھ پڑھا یعنے

راستہ روک کے کہ لونگا جو کہنا ہے مجھے کیا ملوگی نہ کبھی راہ مین آتے جاتے

اس پر بڑا قہقہہ پڑا اور اس شعر کو لوگ اسی صورت پر پڑھنے لگے۔ اُڑتے اُڑتے یہ خبر رند کے کانون تک بھی پہونچی۔ حریفون نے اصل واقعہ پر اپنی طرف سے اور حاشیے چڑھائے۔ غرض کہ رند کے دل مین اس واقعہ کی وجہ سے بھی ایک کاوش موجود تھی۔ یہ بھی ان کے لئے نسیم سے بگڑنے کی وجہ ہوئی۔ ایک موقع پر رند نے ایک شعر پڑھا۔ ؎

کیا ملا عرض مُدعا کر کے

بات بھی کھوئی التجا کر کے

نسیم نے پہلا مصرع یون بدل کر پڑھا۔ ع

فائدہ عرض مُدعا کر کے

اور کہا اب شعر بہتر ہو گیا۔ اور لوگ بھی جو بیٹھے تھے اُنھون نے بھی نسیم کی ایسی کہی۔ یہ امر بھی رند کو ناگوار گذرا۔

نسیم کی جو وقعت شعرائے لکھنؤ کے زمرہ مین تھی اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعے سے ہو سکتا ہے۔ ایک مرتبہ دہلی سے تین مصرعے امتحاناً لکھنؤ بھیجے گئے کہ شاعرانِ لکھنؤ ان پر مصرعے لگا کر بھیجین تینون مصرعے ملاحظہ ہون۔

(۱) ناتوان ہون کفن بھی ہو ہلکا

(۲) اِس لئے قبر مین رکھا اُنھین زنجیر سمیت

(۳) من می روم بہ کعبہ و دل میرود بدیر

اب اہل لکھنؤ کی یہ کوشش ہوئی کہ ایسے مصرعے کہ کر بھیجے جائین کہ دہلی والون کو بھی یہان کی شاعری کا

قائل ہونا پڑے۔ اگر مصرعے سُست ہوے تو کرکری ہو جائیگی۔ غرضکہ تین شخصون کو جو ہر طرح اس کام کے لئے موزون خیال کئے گئے ایک ایک مصرع پر مصرع لگانے کا کام سپرد ہوا۔ پہلا مصرع ناسخ کو دیا گیا۔ دوسرا آتش کو اور تیسرا نسیم کو۔ گو کہ اُس وقت اور بڑے بڑے شاعر موجود تھے مگر آتش و ناسخ کے ساتھ لکھنؤ کی آبرو قائم رکھنے کا شرف نسیم ہی کو حاصل ہوا۔ تینون اُستادون نے جی توڑ کر مصرعے لگائے ہین۔

ناسخ کا مصرع ہے

ڈال دے سایہ اپنے آنچل کا
(ناتوان ہون کفن بھی ہو ہلکا)

آتش کا مصرع ہے۔

حشر مین حشر نہ برپا کرین یہ دیوانے
(اِس لئے قبر مین رکھا انھین زنجیر سمیت)

نسیم کا مصرع بھی لاجواب ہے۔

دارم زدین و کفر بہر یک قدم دو سیر
(من می روم بہ کعبہ و دل می رود بدیر)

نسیم کے مزاج مین آزادی اور بے پرواہی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کبھی دُنیا کے مال و دولت کی تمنا نہ کی۔ گو کہ بہت اہلِ قلم اس زمانے مین عہدہاے جلیلہ پر ممتاز تھے اور دربارِ شاہی مین ان لوگون کی رسائی تھی۔ اِن حضرات نے کئی مرتبہ نسیم سے خواہش ظاہر کی کہ وہ ان کو دربارِ شاہی

تک پہونچائین اوران کے منصب و جاگیر کی فکر کرین مگر اس شہنشاہ سخن نے دوات و قلم کو طبل و علم پر ترجیح دی اور دُنیا کی شان و شوکت کی طرف رُخ نہ کیا۔ اور یہ کیا اکثر اہل کمال اسی کے رنگ کی طبیعت رکھتے ہین۔ انیس مرحوم فرماتے ہین ؎

سر جہان رکھتے ہین سب ہم وان قدم رکھتے نہین
در پہ شاہون کے نہین جاتے فقیر اللہ کے

ایک مرتبہ امجد علی شاہ کے سامنے ایک طوائف نے نسیم کی وہ لاجواب غزل گائی جسکا مطلع ہے

کیا یہ دُنیا عاقبت بخشائیگی
جب نہ جیتے جی مرے کام آئیگی

جب اس مرصع غزل کا مقطع گایا

گُل کو بوے گُل ہوا بتلائیگی
جان نکل جائیگی تن سے اے نسیم

تو سخن شناس بادشاہ نے کہا کہ کیا یہ غزل اسی نسیم کی ہے جو گلزار نسیم کا مصنف ہے۔ اُس نے کہا ہان۔ یہ سُننا تھا کہ ارشاد ہوا کہ اس سخنور باکمال کو دربار شاہی مین حاضر کرو۔ حریفون نے کہا کہ حضور نسیم کا تو انتقال ہوگیا۔ خدا جانے وہ کیسا وقت تھا اور یہ منحوس کلمہ کیسی زبانون سے نکلا تھا۔ ادھر یہ بات مُنہ سے نکلی اُدھر قدر انداز قضا کے ترکش سے تیر نکلا جس نے کہ تھوڑے ہی عرصے مین نسیم کا خاتمہ کردیا۔ مرنے کے دو تین گھنٹے پیشتر یہ شعر کہا تھا ؎

پہونچی نہ راحت ہم سے کسی کو بلکہ اذیت کرش ہوے
جان پڑی تب بار شکم تھے مرکے وبال دوش ہوے

گلزارِ نسیم

(ماخوذ از "اُردوے معلّےٰ" جولائی ۱۹۰۵ء)

اُلجھ پڑون کسی دامن سے مین وہ خار نہین　　　وہ پھول ہون جو کسی کے گلے کا ہار نہین

گذشتہ مارچ اور اپریل کے "دلگداز" مین میرے عنایت فرما عبدالحلیم صاحب شرر کے دو مضمون "گلزارِ نسیم" کے متعلق شایع ہوے ہین جو کہ قدر دانانِ نسیم کے لئے کسی قدر دلخراش ثابت ہونگے۔ حال مین گلزار نسیم کا ایک نیا اڈیشن شایع ہوا ہے۔ جس کی ترتیب دینے کی خدمت مین نے اپنے ذمے لی تھی۔ یہ اِس نئے اڈیشن کی اشاعت ہے جس نے حضرتِ شرر کی روشنی طبع کو اشتعال دی ہے۔ حضرتِ موصوف نے جو کچھ "گلزار نسیم" کی نسبت تحریر فرمایا ہے اِس کا مناسب جواب خاموشی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ذیل کی تحریر سے ثابت ہوگا آپ کے مضامین خود زبانِ حال سے آپ کے دلائل کی تردید کرتے ہین۔ لیکن اِن مضامین سے ناواقفانِ سخن کے دل مین اکثر غلط فہمیان پیدا ہو سکتی ہین۔ اِس خیال نے ذیل کی چند سطرین لکھنے پر مجبور کیا ؎

منظور ہے گذارش احوال واقعی　　　اپنا بیانِ حُسن طبیعت نہین مجھے

حضرتِ شرر نے اپنے پہلے مضمون کی تمہید مین تحریر فرمایا ہے کہ "اگر اس مثنوی گلزار نسیم کے

محاسن کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ اُن نظموں مین ہے جیسی کہ اُردو شاعری کو اپنی لس صدی کی عمر مین دو ہی چار نصیب ہوئی ہونگی لیکن اِس کے ساتھ ہی اِس کے معائب پر نظر ڈالی جائے تو اس سے زیادہ عیوب کسی اُردو نظم مین نہین ہین"۔ یا اِسی سلسلہ مین آپ پھر تحریر فرماتے ہین۔ "کہ جس وقت اِس کے محاسن پر نظر ڈالی جائے تو اس قدر لطف آتا ہے کہ مجبور ہو کر تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ اس سے اچھی نظم نہین ہو سکتی۔ اور جس وقت اس کی غلطیون کی طرف توجہ کیجیے تو خیال گذرتا ہے کہ شاید اور کسی شاعر کے کلام مین اتنی غلطیان نہ ہونگی جتنی کہ نسیم لکھنوی مرحوم کے کلام مین ہین"۔ میری سمجھ مین نہین آتا کہ حضرت شرر نے ان الفاظ کے پردے مین کیا معنی پوشیدہ رکھے ہین۔ ظاہراطور پر جو معنی ان الفاظ سے پیدا ہوتے ہین وہ اصولاً قابل اعتراض نظر آتے ہین یعنی جس نظم کی نسبت یہ کہا جائے کہ "محاسن کے اعتبار سے اِس کا شمار ان نظمون مین ہے جیسی کہ اُردو شاعری کو دو ہی چار نصیب ہوئی ہونگی" اُسی نظم کی نسبت یہ کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے کہ اس مین اس قدر غلطیان ہین جن کا پتہ کسی اُردو شاعر کے کلام مین نہ ملتا ہو۔ مگر چونکہ اصل واقعات سے اس دعوی کی تردید ہوتی ہے۔ لہذا مین اس کے متعلق اصول کی بحث کو زیادہ طول دینا نہین چاہتا۔ حضرت شرر نے اپنے دوسرے مضمون مین گلزار نسیم کے جن اشعار پر اعتراض کیا ہے اُن کی تعداد چالیس پچاس سے زیادہ نہین ہے۔ گلزار نسیم مین تقریباً ڈیڑھ ہزار شعر ہین۔ اب اگر بفرض محال یہ مان لیا جائے۔ کہ حضرت شرر کے سب اعتراض بجا ہین۔ اِس حالت مین بھی گلزار نسیم مین تین یا چار فی صدی اشعار قابل اعتراض ثابت ہونگے۔ چونکہ حضرت شرر نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ کہ آپ کو علاوہ اِن اعتراضات کے اس مثنوی مین اور

بھی بہت سے شبہات ہین اِس لئیے یہ بھی فرض کرلیا جاتا ہے کہ جس قدر اعتراضات حضرت شرر نے تحریر فرمائے ہین ۔ وہ صرف مشتے نمونہ از خروارے ہین اور اصل مین حضرت شرر ان اعتراضات کے جو گنئے اعتراضات پیش کرسکتے ہین اس حساب سے بھی گلزار نسیم مین بارہ یا تیرہ فی صدی سے زیادہ اشعار قابل اعتراض نہ نکلین گے لہذا جس وقت حضرت شرر یہ فرماتے ہین کہ گلزار نسیم سے زیادہ عیوب کسی اُردو نظم مین نہین ہین تو کیا حضرت موصوف کا یہ مطلب ہے کہ کسی اُردو شاعر کے کلام مین بارہ فی صدی یا تیرہ فی صدی شعر بھی قابل اعتراض نہ نکلین گے ۔ مین اس کا انصاف سخن شناسون کی رائے پر چھوڑتا ہون ۔ کیونکہ جس شخص کی نظر سے دس پانچ اُردو شعرا کا کلام بھی گذرا ہوگا وہ اِس امر کا فیصلہ نہایت آسانی سے کریگا کہ حضرت شرر کے اِس دعوی کی تائید واقعات سے کس حد تک ہوتی ہے ۔ یون تو کہنے کو جس کا جی چاہے کہہ سکتا ہے ۔ میر حسن ہی کی مثنوی کی نسبت ایک بزرگ کا قول ہے ۔ (بدر منیر کی مثنوی نہین کہی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہین ۔ بھلا اِس کو شعر کیونکر کہیئے ۔ سارے لوگ دہلی کے لکھنؤ کے رنڈی سے لیکر مرد تک پڑھتے ہین ۔

چلی وان سے دامن اُٹھاتی ہوئی

کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی

(آب حیات مصنفہ محمد حسین صاحب آزاد) ظاہر ہے ان بزرگون نے کچھ سمجھ ہی کے یہ فرمایا ہوگا جس طرح اِن بزرگوار کو میر حسن کی مثنوی کے مقبول عام ہونے پر حیرت ہے اسی طرح حضرت شرر فرماتے ہین کہ " گلزار نسیم کو جو مقبولیت عام حاصل ہوئی ہے حیرت انگیز ہے " ان دونون بزرگون کا جواب فصیح شیراز کئی سو برس پیشتر دے گیا ہے کہ ع

قبول خاطر و لطف سخن خداداد ست

ہان اس موقع پر مین اِس قدر ضرور عرض کرونگا کہ گلزار نسیم کی شہرت کا ایک بہت بڑا راز یہ بھی ہے کہ اس مین محاسن کے مقابلے مین معائب بہت ہی کم ہین یا برابر نہ ہونے کے ہین اور اُردو زبان مین بہت کم نظمین ہین جو اس صورت مین اس کا مقابلہ کر سکتی ہین۔

حضرتِ شرر کے مضمون کے اِس تمہیدی حصّے کے انداز تحریر سے تو یہ پایا جاتا ہے کہ حضرت موصوف پنڈت دیا شنکر نسیم ہی کو گلزار نسیم کا مصنف تسلیم کر لیتے ہین اور جیساکہ دکھلایا جائیگا اِس مضمون کے آخری حصّے مین بھی حضرت شرر نے یہی عقیدہ ظاہر کیا ہے۔ لیکن مضمون کے درمیانی حصّے مین آپنے اِس پُرانے قصّے کو کہ گلزار نسیم آتش کی کہی ہوئی ہے اِس پردے مین تازہ کیا ہے کہ گلزار نسیم کا بہترین حصّہ آتش کے زور فکر کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہین کہ "معتبر ذرائع سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ انتخاب و اختصار کا (یہ) آخری عمل و تصرف خواجہ آتش کے قلم سے ہوا۔ منشی اشرف علی اشرف مرحوم جو نسیم دہلوی کے شاگرد تھے اور اسی دور کے یادگارون مین تھے۔ اس واقعے کو خود مجھ سے بیان کرتے تھے۔ بلکہ اُن کا بیان تھا کہ پنڈت دیا شنکر کی لکھی ہوئی اصل مثنوی کے بہت سے اوراق بھی مین نے اپنی آنکھ سے دیکھے تھے۔ جو بہت ہی عامیانہ مذاق کے تھے اور ایسے تھے کہ سوا ایک مبتدی شخص کے کسی کہنہ مشق شاعر کی جانب نہین منسوب کئے جا سکتے۔ اِس بیان کی تصدیق میر وزیر علی صبا نے بھی ہمارے بعض بزرگون کے سامنے کی تھی"

قبل اِس کے کہ حضرت شرر کے اِس بیان کی نسبت کچھ عرض کرون اتنا ضرور کہونگا کہ منشی اشرف علی مرحوم کی اِس زبانی شہادت سے مجھکو عبد الغفور خان نسّاخ کی شہادت زیادہ پُر زور معلوم ہوتی ہے

جنھون نے صاف الفاظ مین لکھدیا ہے کہ نسیم لکھنوی مشرف باسلام تھے حضرت نسّاخ بھی آخری دور کے یادگارون مین تھے اور بقول غالب شیخ ناسخ تو محض طرز کے ناسخ تھے وہ بصیغہ مبالغہ نسّاخ تھے۔ لہذا اگر ان کی شہادت پر اعتبار کیا جائے اور انہین کی تائید مین دلائل پیش کئے جائین تو گلزار نسیم کا نقاد اُن کاوشون سے نجات پا سکتا ہے جو حضرت اشرف کی زبانی شہادت کی پیروی کرنے مین پیدا ہو سکتی ہین۔ مثلاً مخالف کہہ سکتا ہے کہ یہ امر کہان تک قابل اعتبار ہے کہ حضرت اشرف نے گلزار نسیم کا مسودہ دیکھا تھا۔ کیونکہ مبتدی شعرا کا یہ عام دستور ہے کہ جب تک اُستاد سے اصلاح نہین لیتے وہ اپنی ایک معمولی غزل بھی کسی کو نہین دکھاتے اِس حالت مین نسیم مرحوم نے ایسی مثنوی کا مسودہ کسی شخص کو دکھانے کی جرأت کیونکر کی جس ہین کہ باوجود آتش کی زبردست اصلاح کے اِس قدر معائب موجود ہین کہ اِس کے دیکھنے سے "یہ خیال گذرتا ہے کہ شاید کسی اور شاعر کے کلام مین اتنی غلطیان نہ ہونگی جتنی کہ نسیم لکھنوی مرحوم کے کلام مین ہین" علاوہ اس کے یہ بھی سب جانتے ہین کہ نسیم دہلوی سے اور شعرا لکھنؤ سے عموماً معرکہ آرائیان ہوا کرتی تھین۔ اور یہ بھی سُنا ہے کہ نسیم لکھنوی اور نسیم دہلوی سے خصوصاً چوٹ چلا کرتی تھی۔ ان باتون کو ملحوظ خاطر رکھکر عقل سلیم اِس امر کو قبول نہین کرتی کہ نسیم لکھنوی نے اپنی مثنوی کا مسودہ نسیم دہلوی کے ایک شاگرد کو دکھایا ہو۔ یا اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اشرف مرحوم نے گلزار نسیم کا مسودہ دیکھا بھی تب بھی یہ امر غور طلب ہے کہ ان کی رائے نسیم لکھنوی کے کلام کی نسبت کس قدر منصفانہ ہو سکتی ہے۔ اُردو شاعرون کا یہ عام دستور رہا ہے کہ وہ اپنے اُستاد کو بیجا فروغ دینا اپنا ایمان سمجھتے ہین اور اپنے اُستاد کے مقابل کے شعرا کو مٹانا اپنا ایمان نہین تو اپنا فرض ضرور سمجھتے ہین۔ آتش و ناسخ اور انیس و دبیر کے شاگردون

کی معرکہ آرائیاں ضرب المثل ہوگئی ہین - اس صورت مین اگر اشرف مرحوم نے گلزار نسیم کے مسودے کو عام مذاق کا بتلا کر حق شاگردی ادا کیا ہو تو اُس زمانے کی روش کے لحاظ سے بہت بجا کیا۔

اِن باتون سے قطع نظر کرکے اشرف مرحوم کی تنقید کے نسبت یہ سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ خدا جانے حضرت اشرف نے " عام مذاق " سے کیا مراد لی ہے - ممکن ہے کہ حضرت اشرف کے "مذاق شاعری" کا معیار غیر معمولی طور سے بلند ہو اور گلزار نسیم کا مسودہ اِس خاص معیار کے لحاظ سے " عام مذاق " کا خیال کیا گیا ہو - اور کون جانتا ہے کہ اگر گلزار نسیم کی موجودہ حالت کی نسبت حضرت اشرف سے رائے پوچھی جاتی تو وہ اب بھی اُس کو " عام مذاق " کا نہ بتلاتے۔

غرضکہ جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے حضرت اشرف مرحوم کی زبانی شہادت ایسی مجمل ہے کہ اِس مین سیکڑون شاخسانے پیدا ہو سکتے ہین - عبد الغفور خان نساخ کی تحریری شہادت اس سے زیادہ صاف اور زیادہ قابل اعتبار ہے - مجھ کو اِس سلسلے مین ایک اور روایت یاد آئی جو کہ اِن دونون روایتون سے زیادہ دلچسپ ہے - لکھنؤ کے ایک بزرگ اور کہنہ مشق شاعر جو کہ اس آخری دَور کے یادگارون مین تھے اور اساتذہ مین شمار کیے جاتے تھے - میرے غایت فرما پنڈت بشن نراین صاحب درؔ سے یہ روایت بیان کرتے تھے کہ گلزار نسیم اصل مین حضرت پرؔوانہ کی تصنیف ہے - حضرت پرؔوانہ آتش کے ہمعصر تھے - آتش کو پرؔوانہ کی یہ تصنیف کسی طرح ہاتھ لگ گئی - انھون نے اصلاح وغیرہ دے کر نسیم سے ایک مشاعرے مین پڑھوا دی -

ان بزرگ نے بھی غالبًا یہ روایت معتبر ذرائع سے سُنی تھی - یہ مختلف روایتین سُن کر میرے دل مین یہ خیال گذرتا ہے کہ گلزار نسیم مین باوجود اِس قدر عیوب کے جن سے " زیادہ عیوب

کسی اُردو نظم مین نہین ہین" یہ عجب تاثیر ہے کہ اِس کو کوئی آتش کی طرف صاف طور پر منسوب کرتا ہے۔ کوئی کبھی روایت دبی زبان سے بیان کرتا ہے۔ کوئی اس کو حضرتِ پروانہ کے پروانۂ فکر کا نتیجہ بتاتا ہے۔ کوئی اِس مثنوی کی بدولت نسیم لکھنوی کو اسلام کی دولت سے مالامال کیے دیتا ہے۔ غرضکہ گلزار نسیم مین کتنے ہی عیب کیون نہ ہون مگر اس کے مصنف کے زورِ طبع کا یہ طرفہ اثر ہے کہ

ع ۔ بس ہمایون مرغ عقل از آشیان انداختہ

پھر سوچتا ہون کہ ممکن ہے کہ ان روایتون کے گھروندے محبت کی بنا پر قائم ہون۔ اِن روایتون کے لکھنے والون کا یا بیان کرنے والون کا یہ منشا ہو کہ پنڈت دیا شنکر نسیم کا نام ایسی مثنوی کے ساتھ نہ وابستہ رہے" جس سے زیادہ عیوب کسی اُردو نظم مین نہین ہین" اور جس سے لازمی طور پر نسیم مرحوم کی بدنامی متصوّر ہے۔ بیشک مجھکو تعجب ہے تو اِس قدر کہ مجھکو جو کچھ اِس مثنوی کی تصنیف و تالیف کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ ان روایتون کے خلاف معلوم ہوا۔ حکیم رضا حسین صاحب سُہا مرحوم میر وزیر علی صبا کے داماد تھے اور شاگرد بھی تھے اُن کی خدمت مین مجھے برسون نیاز حاصل رہا۔ اور بہت مرتبہ گلزار نسیم کا ذکر بھی آیا۔ اُنھون نے مجھ سے کبھی یہ نہ کہا کہ گلزار نسیم مین آخری تصرف و اختصار کا عمل خواجہ آتش کے قلم سے ہوا تھا۔ یا آتش نے تفنن طبع کے طور پر یہ مثنوی کہہ کر نسیم کو دیدی تھی بلکہ وہ کہتے تھے کہ میر وزیر علی صبا ہمیشہ ایسی روایتون کی تردید فرماتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ گلزار نسیم خاص پنڈت دیا شنکر نسیم کی تصنیف ہے۔ بیشک حسب دستور اس مین کہین کہین آتش کی اصلاحین موجود ہین۔ اور میر وزیر علی صبا پر کیا منحصر ہے۔ تمام سخن شناس اور انصاف پسند اہل اسلام کو اِس سے انکار نہین کہ گلزار نسیم نسیم ہی کی تصنیف ہے۔ بقول اڈیٹر اودھ پنچ" لکھنو کے

بھنگڑ خانون کے سوا اب یہ روایت کہین نہین سُنی جاتی کہ گلزار نسیم آتش کی تصنیف کی ہوئی مثنوی ہے چنانچہ یہ باتین ملحوظ خاطر رکھ کر مین نے اس روایت کی نسبت صرف اس قدر لکھ دینا کافی سمجھا تھا کہ "سخن شناس جانتے ہین کہ جس رنگ مین گلزار نسیم کہی گئی ہے آتش نے اپنی زندگی مین اس رنگ مین ایک شعر نہین کہا" اِس دلیل کی تردید مین حضرت شرر تحریر فرماتے ہین کہ "غزل اور چیز ہے اور مثنوی اور چیز۔ انسان کی طبیعت جو رنگ غزل مین دکھاتی ہے ضرور نہین کہ وہی رنگ مثنوی مین بھی دکھائے...... دیوان (آتش کے دیوان) کے رنگ کو پیش کر کے مثنوی کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا اس بات کا ثبوت دینا ہے کہ مسٹر چکبست کو اس کی خبر ہی نہین کہ شاعرانہ مذاق ہر صنف سخن مین جُدا گانہ رنگ دکھایا کرتا ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہین۔ اگر آتش نے اس دلبستگی کی بنیاد پر جو انہین نوعمر شاگرد سے تھی۔ (اس دلبستگی کی وجہ آپ نے نہ بتلائی) اس کی تحریک سے یا اس کی مشق اولین دیکھ کے اس مثنوی کو تفنن طبع کے طور پر کہا ہو۔ پھر اس مین متعدد لغزشین دیکھ کے اسے بجائے اپنے اسی کی طرف منسوب کر دیا ہو" مجھ کو افسوس ہے کہ حضرت شرر نے شاعرانہ مذاق کی رنگا رنگی کی نسبت جو سبق مجھے دیا ہے مین اس کو قبول نہین کر سکتا اور مین کیا جو شخص اصول شاعری سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے وہ میرے ہی خیال کی تائید کریگا۔ یہ یاد رہے کہ شاعر کی طبیعت کا قدرتی رنگ ایک ہی ہوتا ہے یہی رنگ مختلف پیرایون مین اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ پیرائے بدلتے رہتے ہین۔ شاعر کا کلام ایک آئینہ ہے جس مین اِس کی نورانی طبیعت کا عکس پڑتا ہے۔ آئینے کی ساخت مین تبدیلیان واقع ہو سکتی ہین مگر عکس کی ہیئت نہین بدلتی۔ غزل ہو یا مثنوی ہو یا مسدس ہو۔ ہر پیرائے مین شاعر کی طبیعت کا قدرتی رنگ نظر آتا ہے۔ مثلاً جس شاعر کی طبیعت مین روانی اور آمد ہے

وہ ہر صنف سخن مین یہی مذاق نباہیگا۔ اگر اس کے مزاج مین آورد کو دخل ہے تو اس کی غزل ہو یا مثنوی یا مسدس۔ سب مین اسی مذاق کا پتا ملیگا۔ میر کی غزلون مین جو سوز و گداز ہے وہی انکی مثنویون موجود ہے۔ داغ کی غزلون مین جو شوخی اور بیباکی کا رنگ ہے وہی ان کی مثنوی فریاد داغ کا رنگ خاص ہے۔ یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ کسی شاعر کی مثنوی اُس پائے کی نہ ہو جیسی کہ اُس کی غزلین ہین۔ لیکن دونون مین "مذاق سخن" کا رنگ ایک ہی ہوگا۔ مثلاً فریاد داغ کا پایہ داغ کی تصانیف مین ادنیٰ ہے لیکن یہ کوئی نہین کہہ سکتا کہ فریاد داغ کا مذاق شاعرانہ گلزار داغ سے جُداگانہ ہے۔

اب دیکھنا چاہئے کہ آتش کی طبیعت کا رنگ خاص کیا ہے۔ مین جانتا ہون کہ حضرت شرر کو بھی اس سے انکار نہ ہوگا کہ آتش کی طبیعت کا رنگ خاص آمد ہے۔ ان کی زبان سے شعر ایسا نکلتا ہے جیسے کمان سے تیر۔ برعکس اس کے گلزار نسیم مین ہر شعر شروع سے آخر تک آورد کے رنگ مین ڈوبا ہوا ہے۔ جس طرح سنگ تراش پتھرون کو تراش کر بُت تیار کرتے ہین اسی طرح نسیم نے اپنے تیشۂ فکر کی مدد سے مضامین کے گل بوٹے تراشے ہین جن سے گلزار نسیم کی زینت ہے۔ چاہے یہ رنگ بُرا ہو یا اچھا۔ مگر اس سے ان کی طبیعت کو خاص مناسبت ہے۔ چنانچہ یہی رنگ ان کی غزلون کی گلہائے مضامین سے بھی شبنم کی طرح ٹپکتا ہے۔ مجھ کو سخت حیرت ہے کہ حضرت شرر کے قلم سے ذیل کے الفاظ کس طرح نکلے کہ "مجھے تعجب ہے کہ مصنف (یعنی نسیم) کے دیوان کا انتخاب جو اس مثنوی (گلزار نسیم) کے آخر مین چھاپا ہے اُس مین بھی اس رنگ (یعنی گلزار نسیم کے رنگ) کا کوئی شعر نہین ہے۔" اس موقع پر مین چند شعر "انتخاب دیوان نسیم" سے تمثیلاً لکھے دیتا ہون۔ سخن شناس خود فیصلہ کرلین گے کہ حضرت شرر کا بیان مندرجہ بالا کس قدر درست ہے۔

جب ہو چکی شراب تو مین مست مر گیا — شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا

شوریدگی سے میری یہان تک وہ تنگ تھے — روٹھا جو مین تو خیر منائی، کہ شر گیا

بوے گل غنچے سے کہتی ہے نسیم — بات نکلی مُنہ سے افسانہ چلا

چمن مین دہر کے آکر مین کیا نہال ہوا — برنگ سبزۂ بیگانہ پائمال ہوا

کہانی کہہ کے سُلاتے تھے یار کو سواب — فسانہ عمر ہوئی خواب وہ خیال ہوا

کوچۂ جانان کی ملتی تھی نہ راہ — بند کین آنکھین تو رستہ کھل گیا

بلبل کے مُنہ پہ اُڑنے لگی ہین ہوائیان — صیّاد کو بتا کہین او باغبان ہوا

جلد او ماہ تو گھر سے نکلا — شکر ہے چاند کدھر سے نکلا

معنی روشن جو ہون تو سو سے بہتر ایک شعر — مطلع خورشید کافی ہے پئے دیوان صبح

جب ملے دو دل مخل پھر کون ہے — بیٹھ جاؤ خود حیا اُٹھ جائیگی

گر یہی ہے اس گلستان کی ہوا　　شاخ گل اک روز جھونکا کھائیگی
داغ سودا ایک دن دے گا بہار　　فصل اس گل کی شگوفہ لائیگی
کچھ تو ہو گا ہجر مین انجام کار　　بیقراری کچھ نہ کچھ ٹھہرائیگی
صندلی رنگون سے مانا دل ملا　　درد سر کی کس کے ماتھے جائیگی
خاکسارون سے جو رکھے گا غبار　　او فلک بدلی تری ہو جائیگی

صبر رخصت ہو تو جانے دیجیے　　بیقراری آئے تو ٹھہرائیے
دل ہی مین دکھلائیے تاثیر عشق　　ٹھنڈی سانسون سے انہین گرمائیے

گل ہوا کوئی چراغ سحری او بلبل　　ہاتھ ملتی ہوئی پتون سے صبا آتی ہے

جس کو دیکھو وہ اس زمانے مین　　اپنے نزدیک دور ہوتا ہے
خاکساری وہ ہے کہ ذرون پر　　روز باران نور ہوتا ہے

اس رنگ کے نوے فی صدی اشعار نسیم کے دیوان مین مل سکتے ہین - ان اشعار مین بھی وہی ترکیب کی چستی، وہی تناسب لفظی، وہی اور وکا رنگ چوکھا ہے جو کہ مثنوی کا رنگ خاص ہے - آتش کا مذاق شاعرانہ اس رنگ سے اعلی تر ہے لیکن اس سے بالکل جداگانہ ہے - اگر وہ "تفنن طبع" ہی کے طور پر کوئی مثنوی کہتے تو یہ ممکن تھا کہ وہ مثنوی اس پائے کی نہ ہوتی جیسی کہ ان کی غزلین ہین

لیکن اُس مثنوی مین ان کی طبیعت کے رنگ کا ضرور پتا ملتا۔ علاوہ اس کے یہ کہنا کہ شاعر نے گلزار نسیم کو محض تفنن طبع کے طور پر تصنیف کیا ہے کس قدر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ یہ تو ویسا ہی ہے جیسا کہ آج کل کوئی شخص کہے کہ جاپان روس سے "تفنن طبع" کے طور پر لڑ رہا ہے۔ قطع نظر ان سب باتون کے اس مقام پر ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے جو کہ کسی قدر غور طلب ہے یعنی حضرت شرر نے اس مضمون کے ایک حصے مین تو یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ گلزار نسیم مین محض انتخاب و اختصار کا آخری عمل و تصرف خواجہ آتش کے قلم سے ہوا۔ لیکن آپ ہی صاف الفاظ مین یہ بھی تحریر فرماتے ہین کہ کوئی تعجب کی بات نہین اگر آتش نے اس مثنوی کو تفنن طبع کے طور پر کہا ہو پھر اس مین متعدد لغزشین دیکھ کے اسے بجاے اپنے نسیم کی طرف منسوب کر دیا ہو۔ یہ دونون دعوے ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہین۔ چونکہ حضرت شرر کے اس مضمون کا رنگ خاص یہی ہے کہ ایک دعوے کی تردید دوسرے دعوے سے کی جائے۔ لہٰذا اس کی نسبت زیادہ لکھنا فضول ہے۔ حضرت شرر کا یہ مقولہ صحیح ہو یا نہ ہو کہ "شاعرانہ مذاق ہر صنف سخن مین جداگانہ رنگ دکھاتا ہے" مگر اس قدر ضرور صحیح ہے کہ حضرت موصوف کا مذاق تنقید ہر صفحے پر نیا رنگ دکھاتا ہے۔

دیباچے مین تناسب لفظی کی بحث کے سلسلے مین مین نے اس بات پر زور دیا تھا کہ صنعت مذکور کا لطافت کے ساتھ نباہنا ایک امر دشوار ہے۔ اور یہ دکھانے کے لئے کہ کس صورت پر تناسب لفظی بجاے حسن کے عیب ہو جاتا ہے مین نے مثال کے طور پر امانت رند خلیل قلق وغیرہ کا ایک ایک شعر یا مصرع لکھ دیا تھا۔ اس سلسلے مین گلزار نسیم کے بھی دو ایک شعر لکھ دیے تھے۔ اس بنا پر حضرت شرر تحریر فرماتے ہین کہ "مسٹر چکبست نے امانت رند قلق کا ایک ایک شعر یا مصرع نقل کر کے

سب کی شاعری مین دھبہ لگایا ہے"۔ مجھ کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مین ہرگز اس الزام بیجا کا مستحق نہ تھا۔ صرف ونحو کی کتابون مین یا کتب عروض مین اکثر غلطیون کی تشریح کے لئے بڑے بڑے اساتذہ کے شعر لکھے ہوے ملین گے۔ اِن اشعار کے پیش کرنے سے لکھنے والے پر یہ الزام نہین عائد کیا جا سکتا کہ اس کا منشا یہ تھا کہ ان اُستادون کی شاعری مین دھبہ لگایا جائے۔ آخر کسی کے کلام سے تو مثال دینا ہی پڑیگی۔ لہٰذا ایک صنعت خاص کا ذکر کرتے ہوے اگر مین نے رند وخلیل وقلق وغیرہ کے کلام سے ایک ایک مصرع یا شعر نقل کردیا تو میری مُراد اس سے یہ نہ تھی کہ مین ان کی شاعری کو بہ حیثیت مجموعی قابل نفرین قرار دون۔ اگر ان مثالون کے پیش کرنے سے کوئی معنی پیدا ہو سکتے ہیں تو وہ یہ تھے کہ جہان تک تناسب لفظی کی صنعت کا تعلق ہے رند وخلیل وقلق وغیرہ نسیم کا مقابلہ نہین کرسکتے۔ اگر حضرت شرر ذرا بھی غور وفکر سے کام لیتے تو میرے سر مفت کا الزام نہ دھرتے ؎

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطا ست سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجا ست

بیشک امانت کے لئے مین نے صاف الفاظ مین یہ لکھ دیا تھا کہ ان حضرت کے لئے تناسب لفظی کا شوق جنون کے درجے تک پہونچ گیا ہے۔ حضرت شرر کا یہ خیال نہین ہے۔ آپ کے نزدیک گلزار نسیم کی طرح امانت کے کلام مین بھی ایسے معیوب اشعار جن مین تناسب لفظی کے ساتھ لطافت سخن نہ قائم رہی ہو دو فی صدی سے زیادہ نہ نکلین گے۔ اور حضرت موصوف کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ تناسب لفظی کے نباہنے مین امانت ہی "سب سے زیادہ کامیاب" بھی ہوے ہین۔ مین حضرت کی اس تنقید کے نسبت زیادہ عرض کرنا نہین چاہتا۔ جس شخص نے امانت کا کلام ایک سرسری نظر سے بھی دیکھا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ حضرتِ شرر نے امانت کی مدحت سرائی مین جو کچھ تحریر فرمایا ہے

وہ ایک شاعرانہ مبالغے سے زیادہ وقعت نہین رکھتا۔ چند اشعار آمانت کے درج ذیل ہین۔ سخن شناس "تفنن طبع" کے طور پر ملاحظہ فرمائین اور دیکھین کہ آمانت نے تناسب لفظی کی صنعت کو کیا معراج دی ہے۔ ؎

چھولون جو کانپور مین وہ زلف حلقہ دار ۔۔۔ پھانسی کا حکم چھوٹتے ہی کوتوال دے
دُر دُر کرے صدف کو جو وہ گوہر مُراد ۔۔۔ موتی ہر ایک وہ انت خوشی سے نکال دے
سوراخ در کے بند کرو چھوڑو جھانکنا ۔۔۔ روزن تمہارے شرم مین خنہ ڈال دے

کھلاتا ہی ہوا اس شعلہ رو کو برف خانے کی ۔۔۔ رقیب رو سیہ کو فکر ہے نقشہ جمانے کی
ملائی اُسنے شہنا سے جو دُھن اپنے ترانے کی ۔۔۔ ندامت سے بُری نوبت ہوئی نقار خانے کی
سیہ گیسو کو اسکے سانپ پھن کہتی ہے شانے کو ۔۔۔ مری طبعِ رسا کرتی ہے باتین مار کھانے کی

خط بہت بڑھ گیا ہے بنواؤ ۔۔۔ گلشنِ حُسن ہے کہ جنگل ہے
طائرِ دل کو میرے صدقے کر ۔۔۔ بتِ بے پیر آج منگل ہے
عاشقِ زلف کیون نہ سر ٹکرائے ۔۔۔ مانگ وار اُس پری کی تُنگل ہے
نظم کرتا ہون خطِ سبز کا وصف ۔۔۔ مُرغِ مضمون جو ہے وہ ہریل ہے

اسے کہتے ہین تکلف اسے نازک طبعی ۔۔۔ گھاس کے تھان [1] پہ اس شوخ نے گھوڑا باندھا

---

[1] ایک قسم کا کپڑا۔

بند انگیا کا کم و بیش جو پایا اُس نے	ہنس کے خیاط کو چڑیا کا بنایا اُس نے

مین قدر دانانِ امانت کا مشکور ہونگا اگر وہ امانت کے دیوان مین دو فی صدی شعر بھی ایسے نکال دین جن مین تناسب لفظی کے ساتھ لطافت سخن بھی قائم رہتی ہو۔ یون دعولے بے دلیل کرنا تو بہت آسان ہے،

حضرت شرر نے مجھ کو اس بات کا بھی ملزم ٹھہرایا ہے کہ مین نے جو نسیم کے معرکے لکھے ہین اُن کے پردے مین "لکھنؤ کے بعض مشہور و معروف و مستند شعرا کے مٹانے کی کوشش" کی ہے۔ مین نے جو کچھ لکھا ہے وہ اُن بزرگون کی شہادت پر لکھا ہے جو نسیم کے ساتھ مشاعرون مین شریک تھے اور جن کے سامنے یہ معرکے پیش آئے۔ اگر حضرت شرر کو اس مین شک ہو تو یہ اُن کا حُسن ظن ہے۔ اور چونکہ اس بحث سے اور نفس مضمون سے زیادہ تعلق نہین لہذا مین اس کی نسبت زیادہ عرض کرنا نہین چاہتا۔

حضرت شرر نے مجھ غریب پر یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ بجائے مولوی حالی کے اعتراضات کا جواب دینے کے میرا فرض یہ تھا کہ گلزار نسیم کے اُن عیوب کے مٹانے کی کوشش کرتا جن پر عام اہلِ سخن معترض ہین اور جن کا اس وقت تک جواب نہین دیا گیا ہے"۔ اس اعتراض کی نسبت مین یہ عرض کرونگا کہ مولانا حالی کے اعتراضات چاہے واجب ہون یا غیر واجب اُنھون نے اُن کو نقادانِ سخن کے سامنے تحریری حیثیت مین پیش کیا ہے۔ لہذا اعتراضاتِ مذکور سے ہر شخص پورے طور سے واقف ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اعتراضات میری نظر سے بھی گذرے اور جو کچھ میری سمجھ مین آیا مین نے اُن کی نسبت لکھا بھی۔ علاوہ ان اعتراضات کے اور ایسے اعتراضات گلزار نسیم پر میری نظر سے نہین گذرے جو کسی مستند شخص کی طرف سے پیش کئے گئے ہون جو اعتراضات حضرت شرر نے اساتذہ لکھنؤ کا وکیل بن کر پیش کئے ہین اُن کی نسبت مین صرف اس قدر کہنا کافی سمجھتا ہون کہ ان اعتراضات کے اساتذہ

لکھنو کا دامن آلودہ کرنا سخت بیرحمی ہے۔ میرے خیال مین کوئی لکھنؤ کا رہنے والا جس کو شعر و سخن کا مذاق ہے اور جس نے گلزارِ نسیم کے علاوہ اور شعرائے اُردو کا کلام بھی پڑھا ہے اس کے قلم سے ایسے اعتراضات نکل ہی نہین سکتے ہین۔ چنانچہ انہین اعتراضات کے متعلق ۱۱ رمئی کے "اودھ پنچ" مین لکھنؤ کے مستند اور مسلم الثبوت زبان دان منشی سجّاد حسین صاحب تحریر فرماتے ہین کہ "ہمارے خیال مین اساتذہ لکھنؤ کی اس سے بڑھ کر ذلت نہین ہوسکتی کہ ان کی جانب یہ اعتراض (یعنی حضرت شرر کے اعتراض) منسوب کئے جائین۔ جن سے فارسی محاورون سے عموماً اور لکھنؤ کی زبان و شاعری سے خصوصاً عدم واقفیت کا اظہار ہوتا ہے"۔ اگر حضرت شرر خود غور سے کام لین تو وہ یہ دیکھ سکتے ہین کہ اساتذہ لکھنؤ کی جانب یہ اعتراض منسوب کرنا کہ نسیم نے "حیا اُٹھا کر" خلاف محاورہ نظم کیا ہے۔ "پردۂ حیا اُٹھا کر" چاہیئے ایسا فعل ہے کہ جس سے جرات کا تو ضرور اظہار ہوتا ہے مگر دوراندیشی کا نہین۔ یا یہ کہنا کہ "دو تجھ پاس" کہان کی زبان ہے اور پھر کہنا کہ یہ اعتراض اساتذہ لکھنؤ کی جانب سے ہے، لکھنؤ کو بدنام کرنا ہے۔ مجھکو خود اکثر اساتذہ لکھنؤ کی خدمت مین باریابی حاصل ہے۔ مین نے ان کی زبان سے کبھی ایسے اعتراضات نہین سنے۔ اب رہے اُن حضرات کے اعتراضات جو گلزارِ نسیم پر اعتراض کرنا ثواب سمجھتے ہین۔ وہ اکثر میرے گوش گزار ہوتے رہتے۔ مگر ان کے جواب مین مین کسی فارسی اُستاد کا یہ شعر دل ہی دل مین پڑھ لیا کرتا ہون۔ ؎

بسیار زخمہاست کہ خاک است مرہمش

نتوان بہ رشتہ دوخت دہانِ دریدہ را

یسے اعتراضات کا کسی سنجیدہ تحریر مین ذکر کرنا حماقت ہے اور ایسی حماقت ہے کہ جس کی کبھی انتہا نہین

ہوسکتی۔ اسی خیال سے مین نے محض مولانا حالی کے اعتراضات کا ذکر کرنے پر قناعت کی۔ اب چونکہ حضرت شرر نے اپنے رسالے مین چند اعتراضات پیش کئے ہین۔ ان کی نسبت آگے چل کر مین جو کچھ میری سمجھ مین آئے گا لکھونگا۔

اِس مضمون کے آخری حصّے مین حضرت شرر فرماتے ہین کہ "گلزارِ نسیم مین ایسے اشعار بہت ہین جن کی بنا پر صرف یہی نہین کہا جاتا کہ نسیم کی زبان مین غلطیان ہین بلکہ یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ پنڈت دیا شنکر نسیم زبان پر اتنی حکومت نہین رکھتے کہ ہر ایسے مضمون کو جو خیال مین آئے ادا کر جاہین"۔ اِس سلسلے مین حضرت موصوف فرماتے ہین کہ ان کا مقصد گلزارِ نسیم پر اعتراضات پیش کرنے سے یہ ہے کہ عام پبلک پر ظاہر کر دیا جائے کہ گلزارِ نسیم مین اہل لکھنؤ کے نزدیک صدہا غلطیان ہین اور اس مثنوی کی زبان اہل لکھنؤ کی زبان نہین ہے"۔ اِس اعلان کی نسبت دو امور دریافت طلب ہین۔ اولاً یہ کہ یہ اعلان حضرت شرر کے پہلے مضمون کے اس حصّے کی تردید کرتا ہے جس مین آپ نے اس امر کا اقرار کر لیا ہے کہ گلزارِ نسیم کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان ہے۔ یعنی میرے دیباچے پر رائے زنی کرتے ہوئے حضرت شرر تحریر فرماتے ہین کہ "گلزارِ نسیم کے اختصار، اس کی ترکیبون کی پختگی، کلام کی روانی اور سادگی اور پاکیزگی زبان کی نسبت جو کچھ لکھا گیا ہے بہت صحیح ہے بلکہ اس سے بڑھ کے ہے۔ (دلگداز بابت مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۱۵) اِس سے صاف ظاہر ہے کہ پاکیزگی زبان کی نسبت جو کچھ مین نے لکھا ہے اِس سے حضرت شرر کو پورا اتفاق ہے۔ بلکہ آپ لکھتے تو اس سے کچھ زیادہ ہی لکھتے۔ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ "پاکیزگی زبان" کی نسبت مین نے کیا لکھا ہے۔ دیباچے کے بارہوین صفحے پر حاشیے پر "پاکیزگی زبان" کی سُرخی قائم کر کے گلزارِ نسیم کی زبان کے متعلق صاف الفاظ مین

مین نے یہ لکھا ہے کہ نسیم کی زبان بھی نہایت سلیس و پاکیزہ ہے اور اسے لکھنؤ کی ٹکسالی زبان سمجھنا چاہیے۔" میری سمجھ مین نہین آتا کہ حضرت شرر نے پیشتر نسیم کی زباندانی کو کیون تسلیم کیا اور پھر اپنے ہی بیان کی تردید اس زور شور سے کیون کی۔ دوسرا سوال اس اعلان کی نسبت یہ پیدا ہوتا ہے کہ پیشتر حضرت شرر اپنا عقیدہ یہ ظاہر کر چکے ہین کہ گلزار نسیم کے اصلی مسودے کے ورق نہایت ہی عام مذاق کے تھے اور جو کچھ محاسن اس مثنوی مین پیدا ہوے وہ اِس سبب سے ہوے کہ انتخاب و اختصار کا آخری عمل و تصرف خواجہ آتش کے قلم سے ہوا۔ یا یہ کہ حضرت شرر کے دوسرے عقیدے کے مطابق آتش نے یہ مثنوی خود تفنن طبع کے طور پر کہی اور پھر اُس کے اشعار مین متعدد لغزشین دیکھ کر نسیم کو دیدی۔ گویا نسیم سے اور اس کی تصنیف و تالیف سے کوئی تعلق ہی نہین۔ ان دونون صورتون مین عقل سلیم یہ کیونکر قبول کر سکتی ہے کہ گلزار نسیم کی زبان اہل لکھنؤ کی مستند زبان نہین ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ چاہے خواجہ آتش نے اِس مثنوی کی اصلاح مین آخری انتخاب و تصرف کی زحمت اپنے سر لی یا حضرت شرر کے دوسرے عقیدے کی رد سے آتش نے خود یہ مثنوی "تفنن طبع" کے طور پر کہی اور پھر نسیم کو دیدی۔ ان دونون صورتون مین اس مثنوی کی ترتیب دینے مین آتش نے اِس قدر غور و فکر سے ضرور کام لیا کہ اس مین ایسے محاسن پیدا ہو گئے جن کی وجہ سے حضرت شرر بھی یہ کہنے پر مجبور ہین کہ باعتبار خوبیون کے گلزار نسیم کے مقابل کے دو ہی چار نظمین اُردو مین نکلینگی۔ اِس حالت مین گلزار نسیم مین ایسے شعر کہان سے آ گئے جن کی نسبت آج حضرتِ شرر تک کو یہ کہنے کی جرأت ہوتی ہے کہ ان کی زبان نہایت ہی مبتذل اور بازاری زبان ہے اور بازار بھی کہین اور کا لکھنؤ کا نہین۔ یہ ممکن تھا کہ آتش کے اور کلام کے مقابلے مین یہ مثنوی پھیکی ہوتی۔ مگر جہان تک زبان کا تعلق ہے یہ ضرور مستند

خیال کی جاتی۔ آتش کی بہت سی غزلیں ہیں جن میں ایک شعر بھی قابل تعریف نہیں ہے یا بہت سے شعر مہمل ہیں۔ ان غزلوں کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ آتش نے انہیں محض "تفنن طبع" کے طور پر تصنیف کیا ہوگا یعنی زیادہ غور و فکر سے کام نہ لیا ہوگا۔ مگر با این ہمہ یہ مہمل شعر بھی زبان کی بحث میں اسی وثوق کے ساتھ سند کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں جیسے کہ آتش کے اعلیٰ سے اعلیٰ شعر۔ ان اشعار میں شاعری کے اور جوہر نہوں لیکن ان کی زبان کی نسبت یہ کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ "مبتذل بازاری زبان ہے اور بازاری زبان بھی کہیں اور کی لکھنؤ کی نہیں"۔ مثلاً اگر یہ بحث درپیش ہو کہ آیا "حلال کرنا" لکھنؤ کا محاورہ ہے کہ نہیں۔ تو آتش کا ذیل کا شعر سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ؎

آتی جو عید قربان خنجر کو لال کرتے
دُنبے کے بدلے فربہ عاشق حلال کرتے

اس شعر میں چاہے اور صدہا عیوب ہوں مگر اس کی زبان مستند ہے کیونکہ یہ شعر آتش کا ہے۔ افسوس ہے کہ حضرت شرر نے اس پہلو پر غور نہیں کیا کہ کوشش تو یہ ثابت کرنے کی کر رہے ہیں کہ گلزار نسیم میں نسیم کا کلام برائے نام ہے یا برابر نہ ہونے کے ہے اور جو کچھ اس کو فروغ حاصل ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ یا تو اس پر آتش کی زبردست اصلاح ہے یا آتش نے خود اسے "تفنن طبع" کے طور پر تصنیف کیا ہو اور پھر یہ اعلان بھی شایع کرتے ہیں کہ" گلزار نسیم کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے"۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آتش نے نہ اس کی اصلاح میں غور و فکر سے کام لیا ہے نہ وہ اس کے مصنف ہو سکتے ہیں۔ حضرت شرر کی اس تنقید پر "ما چہ می سرائیم و طنبورہ ما چہ می سراید" کی مثل صادق آتی ہے۔ کیا حیرت کا مقام ہے کہ حضرت شرر کا طائر خیال ایک شاخ پر بیٹھتا ہی نہیں۔ شروع سے آخر تک کل مضمون

متضاد بیانات سے پُر ہے جن کی وجہ سے حضرت موصوف کے دلائل کا سلسلہ تارِ عنکبوت سے زیادہ مضبوط نہین نظر آتا جس وقت آپ کا خیال گلزار نسیم کے محاسن کی طرف جاتا ہے تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہین کہ اِس مثنوی کا بہترین حصہ آتش کے زورِ فکر کا نتیجہ ہے اور اپنے دعوے کی تقویت کے لئے نقادانِ سخن کے دربار مین اُن بزرگون کی شہادت پیش کرتے ہین جو موت کی میٹھی نیند سو رہے ہین اور جن کو اِس بات کی مطلق خبر نہیین کہ آج اُن کے نسبت کیا کہا جا رہا ہے۔ جب حضرت شرر کو گلزار نسیم مین معائب تلاش کرنے کی فکر ہوتی ہے تو اُس وقت آپ یہ فرض کر لیتے ہین کہ یہ نسیم کی تصنیف ہے اور اِس لئے اس کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہین ہے، اس سے صرف ایک ہی منطقی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ چالیس پچاس شعر جو حضرت شرر کے نزدیک قابل اعتراض ہین وہ تو نسیم کے ہین باقی ڈیڑھ ہزار شعر آتش کے ہین۔

اصل تو یہ ہے کہ اکثر حضرات کا خیال یہ ہے کہ پنڈت دیا شنکر نسیم ہندو تھے۔ اِس لئے ان کی زبان مستند نہین ہے۔ گو کہ حضرت شرر نے کسی مصلحت سے اِس خیال کو جلبابِ خفا مین رکھا ہے مگر آپ کے "اعلان" کے پردے مین اِس کی جھلک صاف نظر آتی ہے مگر اِس خیال کے لوگون کو اِس امر پر غور کر لینا چاہیے کہ نسیم کے وقت کا لکھنؤ وہ لکھنؤ تھا کہ جس کا ذرہ ذرہ تہذیب و تربیت کے نور سے معمور تھا۔ بقول امیر احمد صاحب بی اے کے اِس زمانے مین "لکھنؤ مین شاعری اور سخن سنجی کا وہ دریائے مواج جوش زن تھا اور زباندانی اور مضمون آفرینی کا یہ شہر ایسا مرکز ہو رہا تھا کہ اسکی دلکش سیرگاہون، اِس کے دلچسپ منظرون اور اس کے دل فریب میلون ٹھیلون کی بہار دیکھنا بھی انسان کو تہذیب سکھانے اور شاعر بنانے کے لئے کافی تھا" اور پھر نسیم کی ایک خاص حالت

تھی۔ ایک تو وہ خود ہی قدرتی طور پر غیر معمولی طور سے ذہین اور طبّاع شخص تھے۔ دوسرے ان کا تمام وقت آتش و صبا وغیرہ ایسے زباندانوں کی صحبت میں صرف ہوتا تھا جن کی زبان آج تک محاورۂ اردو کی دستور العمل سمجھی جاتی ہے۔ قطع نظر اس کے یہ سب جانتے ہیں کہ گلزار نسیم آتش کی اصلاح کے بعد ان کی زندگی میں شایع ہوئی۔ اس صورت میں یہ کہنا کہ چونکہ گلزار نسیم کا مصنف ہندو تھا اس لئے اُس کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے انصاف کی آنکھوں میں خاک ڈالنا ہے جس مشاعرے میں یہ مثنوی رات بھر پڑھی گئی وہ مشاعرہ آتش ہی کے نام سے کیا گیا تھا لہٰذا اس میں شہر کے تمام سربرآوردہ شعرا جمع تھے۔ اکثر بزرگ اب بھی زندہ ہیں جو اس مشاعرے میں شریک تھے۔ کیا ایسا مشاعرہ کرنے سے آتش کی مراد یہ تھی کہ سخن سنجان لکھنؤ کے سامنے اپنے شاگرد سے ایسی مثنوی پڑھوا کر اپنی ہنسی کرائیں جس میں اس قدر غلطیاں ہیں کہ شاید کسی اردو نظم میں نہ ہونگی۔ اور جس میں اکثر ایسے شعر موجود ہیں" جن کی زبان لکھنؤ کی بازاری زبان بھی نہیں ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کے راسخ الخیال اور منصف مزاج اہل اسلام گلزار نسیم کی زبان کو لکھنؤ کی ٹکسالی زبان سمجھتے ہیں۔ حضرت شرر نے جو یہ اعلان شایع کیا ہے کہ "گلزار نسیم کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے" وہ کسی قدر دیر سے شایع ہوا ہے۔ کیونکہ اس اعلان کی اشاعت کے قبل اساتذہ لکھنؤ اس بات کو تسلیم کر چکے ہیں کہ گلزار نسیم کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ لکھنؤ کے مشہور و معروف شاعر منشی امیر احمد صاحب مینائی نے امیر اللغات میں زبان و محاورے کی بحث میں گلزار نسیم کے سیکڑوں شعر سند کے طور پر پیش کئے ہیں۔ اب اس سے بڑھ کر گلزار نسیم کی زبان کے مستند ہونے کا ثبوت کیا ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ لغت میں اُسی شاعر کا کلام سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جس کی زبان مستند سمجھی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ حضرت شرر امیر مرحوم کو اُن "عام اساتذہ لکھنؤ" کے زمرے سے خارج نہ سمجھتے ہونگے جن کا وکیل بن کر آپ نے

یہ اعلان شایع کیا ہے کہ "گلزارنسیم کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہین ہے" علاوہ امیر مرحوم کے لکھنؤ کے سرمایۂ ناز انشا پرداز اور مسلم الثبوت زباندان منشی سجاد حسین صاحب نے حضرت شرر کے اعلان مذکور کی نسبت جو کچھ اارمئی کے اودھ پنچ مین لکھا ہے وہ شائقین سخن کی نظر سے گذرا ہی ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ گلزار نسیم کی زبان کو غیر مستند ثابت کرنے کا زمانہ گذر گیا۔ اب تو اس کے سیکڑون شعر زبان اُردو کا حصہ ہوگئے ہین اور زباندان اس کی زبان کو مستند تسلیم کر چکے ہین۔ اب اگر کسی کا دل چاہے تو وہ یہ خیال کرکے اپنا دل خوش کرلے کہ یہ مثنوی نسیم کی کہی ہوئی نہین ہے اور اگر قلم مین زور ہو تو اس دعوے کی تائید مین دلائل بھی پیش کرے۔ اور میرے خیال مین قدردانانِ نسیم کو ایسے مضامین سے ناخوش نہین ہونا چاہیئے۔ مین تو یہ مان لینے کو تیار ہون کہ نسیم لکھنوی کا اس عالم ایجاد مین وجود ہی نہین ہوا تھا۔ "پنڈت دیاشنکر نسیم" محض ایک اسم فرضی ہے۔ یہ مثنوی کسی بندۂ خدا کی تصنیف ہے جس نے اسکو اس فرضی نام سے شایع کردیا۔ اب یہ بندۂ خدا چاہے آتش ہو یا پروانہ یا مصحفی۔ (اگر منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ کے معتبر ناقل کی روایت صحیح ہے) یا کوئی اور شخص ہو جو مشرف بہ اسلام تھا۔ مجھ کو تو مثنوی گلزار نسیم سے مطلب ہے۔ نہ اس کے مصنف کے مذہب سے۔ ہان اگر "گلزار نسیم" مین لفظ نسیم کھٹکتا ہو تو اس کو "قصۂ گل بکاؤلی منظوم" کہو۔ مگر خدا کے لئے اس کے جوہرون پر تو خاک نہ ڈالو۔

خاص اعتراضات کے متعلق کچھ تحریر کرنے سے پیشتر یہ لکھدینا مناسب ہے کہ اس مضمون مین انھین شعرا[1] کے کلام سے مثالین دی گئی ہین جن کے اشعار امیر اللغات اور بہار ہند[2] مین بھی زبان اور محاورے

---

[1] آتش، ناسخ، صبا، رند، واجد علی شاہ (اختر) انیس، جان صاحب، نواب مرزا شوق، محمد حسین آزاد، (مصنف آب حیات وغیرہ)

[2] حضرت شرر کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ صاحب امیر اللغات کی طرح مؤلف بہار ہند نے بھی پنڈت دیاشنکر نسیم کے اشعار سند کے طور پر پیش کئے ہین۔

کی بحث میں سند کے طور پر پیش کئے گئے ہیں۔

حضرت شرر نے گلزار نسیم کے اکثر اشعار کو بے معنی قرار دیا ہے۔ ایسے اشعار سلسلے وار لکھے جاتے ہیں۔

۱؎ صیاد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی   بینائی کے چہرے پر نظر کی

اعتراض ہے کہ بینائی کے چہرے پر نظر کرنے سے کیا مراد ہے؟

"چہرے پر نظر کرنا" شاہی دفاتر کی اصطلاح ہے۔ "چہرہ" "نام کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ اور یہ اس لئے کہ جس شخص کا نام دفتر میں لکھا جاتا تھا اسی کے ساتھ اس کا خط و خال بھی لکھ لیا جاتا تھا۔ "نظر کرنا" دوسری اصطلاح ہے۔ اگر کسی شخص کا نام دفتر سے کاٹ دیا جاتا تھا تو اصطلاحاً یہ کہا جاتا تھا کہ اس کے چہرے پر نظر کردی گئی۔ اب

"بینائی کے چہرے پر نظر کی"

کے معنی صاف ہیں یعنی "بینائی کا چہرہ کاٹ دیا گیا" جس کا مطلب سادہ الفاظ میں یہ ہوا کہ بینائی کو کھو دیا۔

نسیم کے علاوہ مختلف شعرائے اردو نے اس اصطلاح کو نظم کیا ہے۔

خواجہ وزیر۔ نرگس پہ نظر کیجئے دوبارا کہ وہ کٹ جائے   ہو دیکھائے نظر ثانی میں اس کی نظر کی آنکھ

آتش ۔ قلم نے چہرے حسینوں کے لوح پر لکھ کر   کیونکر ہوں کو کیا خط و خال سے واقف

پھرائے رنگ فتنہ جو رخ پر عجب نہیں   اکثر ہے چہرہ نظر ہی صاد ہو گیا

صبا برطرف غم کردیا دکھلا کے اُس نے صاد چشم چہرۂ عشاق کو حکم بحالی ہو گیا

غیاث اللغات صفحۂ ۴۸۲ "نظری - انچہ بدان نظر کنند و منظور نبود - لفظ نظر برائے بطلان باشد این اصطلاح اہل دفتر است" - مجھ کو حیرت ہے کہ حضرت شرر نے ایک عام اصطلاح سے کیون ایسی بے خبری ظاہر کی اور گلزار نسیم کی ایک لاجواب فرد کو کیون نظری بنا دیا -

سے ۵ اک بلی جو جھپٹی چوہے کو بھانپ
نیولے کو بھگا دیا دکھا سانپ

اعتراض ہے کہ "سانپ کو نیولا مار ڈالتا ہے مگر یہ "دکھا سانپ" کیا - آخر نیولے نے مداری کا تماشہ کیون دکھایا" اگر بفرض محال یہ اعتراض تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی گلزار نسیم کا مصنف اس کا ذمہ دار نہین ہو سکتا - نسیم نے محض "گل بکاولی" کا قصہ نظم کر دیا ہے جو کہ پیشتر نثر مین موجود تھا - اگر یہ اعتراض ہے تو اس غریب پر جس نے قصے کے واقعات کو ترتیب دیا ہے نسیم نے تو شروع ہی مین کہہ دیا ہے -

ہر چند سُنا گیا ہے اس کو اُردو کی زبان مین سخنگو
وہ نثر ہے داد نظم دون مین اس مے کو دو آتشہ کرون مین

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو حضرت شرر کا یہ اعتراض کسی حالت مین جائز نہین ہے - کیونکہ اِس شعر کے بعد دوسرے شعر کا پہلا مصرع ع "دیکھا تو یہ ہے شگون نرالا" اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ مصنف قصہ نے اس واقعے کو خود "نرالا" یعنی حیرت انگیز مانا ہے یعنی وہ خود تسلیم کرتا ہے کہ "نیولے کا سانپ دکھانا" خلاف واقعات ہے پس اس حالت مین سیاق کلام کو

نظر انداز کر کے درمیان سے ایک شعر چُن لینا اور اس پر اعتراض کرنا آئین تنقید کے خلاف ہے اور لفظی شعبدہ پردازی سے زیادہ وقعت نہین رکھتا۔

شعر — سُن کے قیدی کے زار نالے
زنجیر کے پیچ سے نکالے

اعتراض ہے کہ "مانا کہ زنجیر کے ایسے پیچ نکال ڈالے۔ مگر اس سے یہ مطلب کیونکر نکلا کہ بکاولی کے پاؤن مین سے زنجیر نکال لی؟ سچ ہے یہ شعر یون ہے۔

سُن کے قیدی کی زار نالی — زنجیر کے پیچ سے نکالی

"زار نالی" چاہے غلط ہو مگر مصنف نے اس سے رونے دھونے کے معنے لئے ہین۔"

یاے معروف کے بدلے یاے مجہول یا اس کے برعکس لکھدینا کاتبون کی عام غلطی ہے چنانچہ یہ شعر بھی کاتب کی تیغ اصلاح کا زخمی ہے واقعی اصل شعر یون ہے

سُن کے قیدی کی زار نالی — زنجیر کے پیچ سے نکالی

چونکہ اس حالت مین حضرت شرر دبی زبان سے فرماتے ہین کہ "زار نالی چاہے غلط ہو" اس لیے حضرت موصُوف کے اطمینان کے لئے ذیل کی مثالین غالباً کافی ہونگی۔

میر — دَرد و الم ہی مین سب جاتے ہین روز و شب یان — دل اشک ریز یان ہین شب زار نالیان ہین

فقرہ۔ میر تقی میر اور خواجہ میر درد نے زار نالی۔ افسردہ دلی ...... کے مضامین کو خوب ادا کیا۔ (آب حیات مصنفہ آزاد)

شعر — وان پھانس چُبھی ہو اس کو غم کی — یان سانس نہین ہو ایک دم کی

اعتراض ہے کہ "ایک دم کی سانس نہ ہونا ایسا محاورہ ہے جس کے کوئی معنی نہین"۔

مجھ کو اس اعتراض کے معنی سمجھ مین نہین آتے۔ اِس مصرع (یان سانس نہین ہو ایک دم کی) کے معنی چشمۂ آفتاب کی طرح روشن ہین۔ اگر کسی کی سمجھ مین نہ آئین تو یہ نسیم کا گناہ نہین۔ غالباً حضرت شرر نے اِس مصرع مین "دم" سے بھی "سانس" مراد لی ہے۔ اِس صورت مین واقعی "یان سانس نہین ہے ایک سانس کی" کے کچھ معنی نہین ہوے۔ لیکن "دم" یہان "لمحے یا لحظے" کے معنون مین استعمال ہوا ہے۔ نسیم کا یہ مطلب ہے کہ "یان ایک لمحے کی سانس نہین باقی ہے" یعنی موت کا وقت قریب ہے۔ ممکن ہے حضرت شرر کہین کہ "دم" سے لمحے کے معنی لینا کہان کی زبان ہے۔ اِس لئے اشعار ذیل سنداً درج ہین۔

آتش۔ سوائے رنج کچھ حاصل نہین ہو اِس خرابے مین ۔۔۔ غنیمت جان جو آرام تو نے کوئی دم پایا

ناسخ۔ ایک دم فرصت نہین مجھکو بتون کی یاد سے ۔۔۔ کہتے ہین زاہد خدا کی یاد ہر دم چاہیئے

۵ چاہا گلچین کا امتحان لے
پوچھا کہ نگین جو لے کہان لے

اعتراض ہے کہ "جب تک کسی خاص نگین کو دکھا کے یہ نہ کہا جائے کہ اس نگین کو لے تو کہان لے اس وقت تک اِس عام سوال کے کوئی معنی نہین ہو سکتے" اِس مقام پر بھی حضرت شرر نے سیاق کلام پر غور نہین فرمایا ورنہ آپ کو اِس اعتراض کی تکلیف گوارا نہ کرنی پڑتی۔ بکاولی نے (فرخ کے بھیس مین) عمداً یہ سوال ایک مبہم طریقے پر پیش کیا تھا۔ اُس کا مطلب یہ تھا کہ اگر ان چارون شہزادون مین سے کوئی اِس کا گلچین ہوگا تو وہ اس کی انگوٹھی بھی اپنے پاس رکھتا ہوگا لہٰذا

ممکن ہے کہ اس کی زبان سے نکل جائے کہ اگر نگین لینا ہو تو بکاؤلی کی انگوٹھی کا نگین لے۔ اگر ایسا نہ ہوا یعنی ان چارون شہزادون مین کوئی اس کا گلچین نہ ہو تو اس عام سوال کا ایک عام جواب بھی مل جائے گا کہ نگین خریدے تو فلان شہر مین خریدے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ے

بتلانے لگے وہ چارون نادان

کوئی یمن اور کوئی بدخشان

اس جواب سے بکاؤلی نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان مین سے اس کا گلچین کوئی نہین ہے۔ کیونکہ

جانا کہ جو گل یہ لائے ہوتے — خاتم کے نگین بتائے ہوتے

ےہ رکنا ہوا اس پری کا مشکل

یہ دل لگی اب لگا سے کی دل

اعتراض ہے کہ "مصنف تو یہ مضمون ادا کرنا چاہتا ہے کہ اس پری (روح افزا) کے ٹھہر جانے سے دشواریان پیش آئین مگر زبان پر قدرت نہ ہونے سے مطلب یہ ہو گیا کہ اس کا ٹھہرنا مشکل ہوا۔ یعنی ٹھہر نہ سکی۔"

حضرت شرر کا غالباً یہ خیال ہے کہ "مشکل" سے صرف کسی امر کا غیر ممکن ہونا مراد لیا جاتا ہے مگر ایسا نہین ہے لفظ "مشکل" سے وہ حالت بھی مراد لی جاتی ہے جس سے بحیثیت مجموعی کوئی پیچیدگی پیدا ہو جائے۔ جیسا کہ خواجہ حافظ کے ذیل کے مصرع سے ثابت ہو۔ ع

مشکل این است کہ ہر روز بتر می بینم

ظاہر ہے کہ اس مصرع مین "ہر روز بتر دیدن" جس حالت کا اشارہ کرتا ہے وہ حالت

"مشکل" ہے یعنی باعث پیچیدگی ہے۔ اسی طرح نسیم کا مطلب ہے کہ اس پری کا رکنا باعث پیچیدگی ہوا۔ عام گفتگو مین بھی لفظ مشکل اس معنی مین استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کہتے ہین کہ "اگر وہ چلے جاتے تو سب بات بن گئی تھی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ رک گئے"۔ چونکہ زبان کا رنگ بدل گیا ہے لہذا نسیم کے مصرع کی بندش اس زمانے مین کسی قدر الجھی ہوئی نظر آتی ہے لیکن نسیم کے زمانے مین اس قسم کی ترکیب جائز سمجھی جاتی تھی۔ آتش کا شعر ہے۔ ؎

عشق نے حال کیا مردۂ بے وارث کا　　میرے اوپر ہو یقین قبضۂ سلطان ہونا

اس شعر مین "یقین" کا لفظ بالکل اسی طرح استعمال ہوا ہے جیسے کہ نسیم کے شعر مین "مشکل" کا لفظ۔ اب اس ترکیب متروک سے یہ نتیجہ نکالنا کہ آتش و نسیم کو زبان پر قدرت نہ تھی انصاف کا خون کرنا ہے۔ میر حسن کا شعر ہے۔ ؎

جو اس کے طویلے کے ادنیٰ تھے خر　　انھین نعلبندی مین ملتا تھا زر

اس شعر کا مطلب تو یہ ہے کہ نعلبندون کو اجرت مین زر ملتا تھا لیکن زبان کا رنگ بدل جانے سے اب یہ معنی نظر آتے ہین کہ خرون کو زر ملتا تھا۔ اس بنا پر اگر کوئی کہے کہ میر حسن کو زبان پر قدرت نہین تھی تو اس کا جواب سوائے خاموشی کے کیا ہے۔

ﷺ　شہزادے نے ایک دن پھر آکر
شادی کو کہا حیا اُٹھا کر

اعتراض ہے کہ "پردہ حیا اُٹھا کر" کی جگہ "اُٹھا کر" نظم تو کر دیا گیا ہے مگر کوئی معنی نہین رکھتا۔ یہ اعتراض کسی قدر تشریح طلب ہے۔ لکھنؤ اور دہلی مین تو اس قسم کے فقرے زبان زد

عام ہین کہ فلان شخص نے حیا اُٹھا دی یا فلان شخص کی حیا اُٹھ گئی ۔ چنانچہ لکھنؤ کے مستند زباندان مرزا محمد مرتضی عاشق (عرف مرزا چھو بیگ) شاگرد جناب نسیم دہلوی نے اپنے مشہور لغت بہار ہند مین صاف الفاظ مین لکھا ہے کہ "حیا اُٹھانا" بے حجابی کے معنون مین استعمال ہوتا ہے ۔ (بہار ہند مطبوعہ ۱۸۸۵ء صفحہ ۲۶۷)

"حیا اُٹھانا" پر کیا موقوف ہے ۔ "حیا اُڑا دینا"۔ "حیا اُٹھ جانا" "آنکھون سے حیا ٹپکنا" وغیرہ بولا بھی جاتا ہے اور نظم بھی ہوتا آیا ہے ۔ اس موقع پر مجھے مومن خان کا ایک شعر یاد آگیا۔

~ آنکھون سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو ہے بوالہوسون پر بھی ستم ناز تو دیکھو

حضرت شرر کے خیال کے مطابق "شیرۂ حیا ٹپکے" ہونا چاہیے ۔ محض "حیا ٹپکنا" کوئی معنی نہین رکھتا ۔

۵۸ دختر جو پسند مہ لقا ہے

اعتراض ہے کہ "حرف ترکیب کی خرابی نے مطلب خبط کر دیا ۔ کہنا یہ تھا کہ مہ لقا دختر جو پسند ہے"۔

جس شخص کی نظر سے گلزار نسیم کے علاوہ کسی اور شاعر کا کلام بھی گذرا ہے وہ اس اعتراض کی وقعت کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے ۔ ہر زبان کی شاعری مین ترتیب الفاظ مین اس قسم کا اُلٹ پھیر جائز سمجھا گیا ہے ۔ اُردو شعرا کے کلام مین بھی اِس طرز کی سیکڑون بندشین مل جائین گی ۔ چند شعر تمثیلاً لکھے جاتے ہین ۔ آتش ۔

صبح تک دیدۂ تر سے نہین آنسو تھمتے پانی کرنے کو شب ہجر لہو آتی ہے

دم اخیر تصور بندھا ترے رُخ کا   طرف کو کعبے کے کروٹ مجھے قضا نے دی

ناسخ

ہماری آنکھ سے دریائے اشک جاری ہے   خیال ہے ترے بازو کی یار مچھلی کا

ذبح وہ کرتا ہے پر یہ چاہیے اے مرغ دل
دم پھڑک جائے تڑپنا دیکھ کر صیاد کا

ان اعتراضات کے بعد حضرت شرر نے گلزار نسیم کے وہ اشعار لکھے ہین جن مین آپ کے نزدیک لفظی غلطیان ہین۔

بولا کہ چکھون گا مین یہ انسان
بیڑے چکھے پان کے مزیدار

اعتراض ہے کہ "ناسخ و آتش کے زمانے سے لے کے اس وقت تک "چکھونگا" اور "چکھے" کی جگہ "چکھونگا" اور "چکھے" غیر فصیح ہی نہین غلط ہے"

مین حضرت شرر سے نہایت ادب سے پوچھتا ہون کہ اس موقع پر آپ نے لفظ "غلط" کس معنی مین استعمال کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ سودا وغیرہ نے "چکّھا" کی جگہ "چکھا" برابر نظم کیا ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ نسیم کے طبقے کے شعرا نے "چکھا" نہین نظم کیا ہے۔ اس صورت مین نسیم پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ انھون نے ایک ایسا قدیم محاورہ نظم کیا جو اُن کے زمانے

عہ سودا۔ چکھا انھون نے جو اسے یار دوستی کا شہد   وہ تلخ کام کبھی زہر دشمنان نہ کرے
بجائے سُرمہ کرون میل گرم مین اس مین   نمک سے اشک کے جس چشم نے مزا نہ چکھا

مین غیر فصیح سمجھا جاتا تھا اور ایسا کرنا کوئی تعجب کی بات نہین۔ مثلاً شیخ ناسخ نے سودا و میر کی طرح لفظ "زور" بہت کے معنی مین استعمال کیا ہے۔ آتش نے اِس محاورۂ قدیم کو متروک قرار دیا ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناسخ نے ایک غیر فصیح محاورہ نظم کیا۔ لیکن یہ کہنا کہ لفظ "زور" کو بہت کے معنون مین استعمال کرنا غلط ہے کوئی معنی نہین رکھتا۔

خیر اس اعتراض سے زیادہ مزیدار اعتراض حضرت شرر کا پان کے بیڑے" پر ہے آپ فرماتے ہین کہ" دوسرے مصرع (بیڑے چکنے پان کے مزیدار) مین صرف بیڑے کافی تھا۔ "پان کے بیڑے" محاورے مین اچھا نہین"۔ اِس اعتراض کا انصاف بھی مین سخن شناسون پر چھوڑتا ہون۔ دو شعر درج ذیل ہین۔ ناظرین "تفنن طبع" کے طور پر ملاحظہ فرمائین۔

جان صاحب

چھنگلی مری کھائے گی ہے پان کا بیڑہ — منجھلی کا نہ سنجھلی کا نہ ہے بیاہ بڑی کا

امیر مینائی

بسملون کی دمِ رخصت ہے مدارات ضرور — یار بیڑا تری تلوار مین ہو پانون کا

علاوہ برین شرفائے لکھنؤ مین یہ فقرہ مثل کے طور پر بولا جاتا ہے کہ" ایسی شادی تھی کہ کسی کو پان کا بیڑا بھی نہ ملا"۔ غالباً حضرت شرر کو آتش کی اصلاح دیکھ کر یہ اعتراض کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ مگر آپ کو اس امر پر بھی غور کر لینا تھا کہ نسیم نے جو یہ اصلاح نہ مانی تو کچھ سمجھ کر نہ مانی ہوگی اور آتش ایسے نازک مزاج شخص نے اپنے شاگرد کا یہ اختلاف گوارا کیا تو کوئی وجہ معقول ضرور ہوگی۔

عہ ع اب تو ناسخ زور رندیلا و بابی ہوگیا

کھاتے ہی حمل کا ڈھنگ پایا (۱)

وہ بانجھ تھی جب حمل قبولی (۲)

اعتراض ہے کہ " ان مصرعوں میں " حَمل " کی جگہ " حمل " نظم کر دیا گیا ہے جو قطعاً غلط ہے "۔ یہ اعتراض اس اصول سے بے خبری ظاہر کرتا ہے کہ شاعر الفاظ اسی صورت پر نظم کرتا ہے جس صورت سے کہ وہ اہل زبان کی زبان پر جاری ہوتے ہیں۔ محض لغت کے تلفظ کی پیروی شاعر کے لئے ضروری نہیں ہوتی۔ یہ مانا کہ لغت کی رو سے حَمل درست ہے لیکن شرفائے لکھنؤ کی زبان پر اس لفظ کا یہی تلفظ جاری ہے۔

واجد علی شاہ (آخری فرمانروائے اودھ) سے ایک مثنوی موسوم بہ " دریائے تعشق " یادگار ہے۔ اس مثنوی کی تصنیف کا زمانہ " گلزار نسیم " کے زمانے سے بہت قریب ہے " دریائے تعشق " میں بھی حمل ہی نظم ہے۔ ؎

گھر میں میرے بھی لے خوش اطوار آثار حمل کے ہیں نمودار

اس مثنوی میں چاہے اور شاعرانہ محاسن نہوں لیکن جہاں تک زبان اور محاورے کا تعلق ہے اس کا ہر شعر سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں واجد علی شاہ سے بڑھ کر کس کی زبان مستند ہو سکتی تھی۔ علاوہ ازیں جان صاحب نے بھی " حمل " نظم کیا ہے جیسا کہ ذیل کے شعر سے ظاہر ہے۔ ؎

دائی یقین دل کو ہے گر جائے گا حمل ننھا سا لڑکا خواب میں کل بیٹ ڈال گیا

متقدمین کے یہاں بھی " حمل " ہی نظم ہوا ہے۔ چنانچہ سودا کہتے ہیں۔

استقاط حمل ہو تو کہین مرثیہ ایسا　　　پھر کوئی نہ پوچھے میان مسکین کہان ہین

لفظ "حمل" پر کچھ موقوف نہین ۔ متعدد الفاظ ایسے ہین جن کا تلفظ لغت[۱] کی رو سے کچھ اور ہے اور نظم عام محاورے کے مطابق کیا جاتا ہے ۔ مثلاً اصل لفظ کِلمہ ہے یعنی لام بالکسر ہے لیکن محاورے مین چونکہ بسکون لام بولتے ہین اِس لئے شعرا نے اسی طرح نظم کیا ہے[۵] ۔

۱۳ھ　　بادل سادہ بحر آسمان جوش

بجلی کی لہر سے تھا ہم آغوش

اعتراض ہے کہ "لہر" کی جگہ "لہر" یعنی ہاے متحرک کے ساتھ نظم کر دیا گیا ہے جو اُردو مین غلط ہے" اِس اعتراض کے لئے بھی ایک حد تک وہی جواب ہے جو اِس سے پیشتر کے اعتراض کے بارے مین لکھا گیا ہے اور دو شعر نسیم کی تائید مین سنداً درج ذیل ہین ۔ میر

شب نہاتا تھا جو وہ رشک قمر پانی مین　　　گیے مہتاب سے اُٹھتی ہو لہر پانی مین

نواب مرزا شوق

پھر لہر چڑھ رہی ہے کالون کی　　　بد سنگھا دو تم اپنے بالون کی

۱۴ھ　　جاگی تو سب اِس کے جوڑ کی تھین

اندر کے اکھاڑے کی پری تھین

اعتراض ہے کہ " اس مین پری کی جگہ "پریان" چاہئیے ۔ جو نہایت ہی ذلیل قسم کی غلطی

---

۵ جراًت ۔ کلمہ پھر سے ترا تجھے دیکھے جو اک نظر　　　کافر اثر ہے یہ تری کافر نگاہ مین

دبیر ۔ اے خدا کا غضب تیری جان پر ٹوٹے　　　تو کلمہ پڑھ کے رسول خدا کا گھر لوٹے

صبا　خدا کے واسطے کلمہ بتون کا پڑھ واعظ　　　زبان تری ہے ابھی اختیار باقی ہے

معلوم ہوتی ہے"۔ بیشک اِس زمانے مین یہ ترکیب کانون کو غیر مانوس معلوم ہوتی ہے لیکن نسیم کے وقت مین اس کا رواج ضرور تھا۔

آتش

کیا کیا پری اُتاری ہین شیشے مین آہ نے — جن کون ہے جو نالے سے اپنے نہین جلا

کس کے چار ابرو کے نظارے نے دم ٹھہرا دیا — درمیان پاتا ہون دل کو چار سو تلوار کو

(بھی تلوارون کی)

ناسخ

شراب کیون نہ چلے فصل گل مین اے زاہد — کہ نہر جاری ہوئین موسم بہار آیا

۵

خوش لہجہ بہت بکاؤلی تھی

گانی اور ناچنی بڑی تھیعہ

پہلے مصرعہ پر یہ اعتراض ہے کہ "خوش گلو یا خوش آواز کی جگہ غلطی سے خوش لہجہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے"۔

"خوش لہجہ" خوش گلو اور خوش آواز کے معنون مین برابر استعمال ہوتا ہے۔

حافظ

دلم از پردہ بشد حافظِ خوش لہجہ کجاست — تا بقول و غزلش ساز و نوائے بہ کنیم

عہ یہ مصرعہ گلزار نسیم کے اس نئے ایڈیشن مین غلط چھپ گیا ہے یعنی کاتب نے "گانی" کے بدلے "گاتی" اور "ناچنی" کے بدلے "ناچتی" بنا دیا ہے۔ گو کہ ایک نقطے کا بڑھا دینا یا گھٹا دینا کاتبون کی معمولی سی غلطی ہے۔ مگر حضرت شرر نے اِس قرین قیاس بات کو نظر انداز کر کے مجھ کو تصرف بیجا کا ملزم ٹھہرایا ہے۔ خیر اس کا جواب اس مضمون کے آخری حصے مین دیا جائے گا۔

گل و گلچین کا گلہ بلبلِ خوش لہجہ نہ کر — تو گرفتار ہوئی اپنی نوا کے باعث

دوسرے مصرع کی نسبت حضرت شرر کا اعتراض ہے کہ "گائن" کی جگہ "گانی" اور "ناچنے والی" کی جگہ "ناچنی" غلط ہے۔

اِس موقع پر پھر حضرت شرر نے ایک قدیم محاورے کو "غلط" ٹھہرانے میں تکلّف نہیں کیا ہے۔ گلزارِ نسیم کی زبان وہ زبان ہے جو کہ لکھنؤ میں چھیاسٹھ سال پیشتر مروّج تھی۔ گانی اور ناچنی کی ترکیب اس زمانے میں ضرور غیر فصیح معلوم ہوتی ہے مگر نسیم کے زمانے کے شعرا کے کلام میں اِس کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ مثلاً انیس فرماتے ہیں۔

دُنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی — ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی

جو آکے نہ جائے وہ بُڑھاپا دیکھا — جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

اِس رباعی کے دوسرے مصرع میں "آنے والی" کی جگہ "آنی" اور "جانے والی" کی جگہ "جانی" نظم کیا گیا ہے۔ یہ ویسا ہی ہے جیسا کہ "گانے والی" اور "ناچنے والی" کے بدلے "گانی" اور "ناچنی" استعمال کرنا دونوں کی ترکیب میں سرمو فرق نہیں ہے۔

حضرت شرر کا ایک اعتراض یہ ہے کہ گلزارِ نسیم میں چنگل اور چنگال کا لفظ تین جگہ استعمال ہوا ہے اور تینوں جگہ بے موقع اور غلط۔ اِس اعتراض کی تشریح کے لئے ذیل کے تین مصرع لکھے گئے ہیں

(۱) پہونچا لبِ حوض سے نہ چنگل

(۲) شہزادے پہ اس نے مار چنگال

(۳) پیاری یہ نہیں حنائی چنگال

پہلے مصرع کے معنی حضرت شرر نے لکھدیے ہین یعنی "ہاتھ نہین پہونچا"۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہین تحریر فرمایا ہے۔ دوسرے مصرع کی نسبت یہ لکھا گیا ہے کہ "یہان اگر یہ کہا جائے کہ پرون کی طرح پری کے پیچھے بھی تھے تو شاید صحیح ہو جائے"۔ تیسرے مصرع پر یہ اعتراض ہے کہ "مہندی لگے ہاتھون کو حنائی چنگال کہنا لکھنؤ کی زبان نہین ہے"۔ ان اعتراضات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت شرر کا یہ خیال ہے کہ چنگل اور چنگال محض پنجۂ جانور کے معنون مین استعمال ہوتے ہین۔ مگر ایسا نہین ہے۔ جس شخص نے فارسی کی درسی کتابین بھی پڑھی ہین وہ جانتا ہے کہ فارسی شعرا نے "چنگال" ہاتھ کے معنون مین برابر استعمال کیا ہے۔ شیخ سعدی بوستان مین لکھتے ہین۔

مرا در صفاہان یکے یار بود | کہ جنگ آور و شوخ و عیار بود
پلنگا نش از زور و سرپنجہ زیر | فرو بردہ چنگال در مغز شیر

تیسرے مصرع پر جو اعتراض ہے وہ بالکل خارج از آہنگ ہے۔ "حنائی چنگال" فارسی کا محاورہ ہے۔ اس کی نسبت یہ کہنا کہ یہ لکھنؤ کی زبان نہین ہے کوئی معنی نہین رکھتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ "دست حنائی" کے بدلے "حنائی چنگال" کہنا درست نہین تو اعتراض کے کچھ معنی ہو بھی سکتے ہین۔ مگر یہ اعتراض بھی بیجا ہے۔ ملا شیدی فرماتے ہین ۔ ؎

بستۂ رنگِ حنا بر چنگلِ خود دلے نگار | یا بخونِ عاشقان ترکردۂ چنگال را

غیاث اللغات صفحہ ۱۳۶ "چنگل و چنگال۔ پنجۂ آدمی وغیرہ از موید و بہار عجم و جہانگیری وغیرہ"۔

بیجا وہ ہوا کہا کہ جا جا ع۵
کیسی رانی کہاں کا راجا

اعتراض ہے کہ "برہم ہوا" کی جگہ پر "بیجا ہوا" کہنا بہت ہی مبتذل بازاری زبان ہے۔ میں نے دیباچے میں خود تسلیم کرلیا ہے کہ نسیم سے بھی اکثر موقعوں پر تناسب لفظی لطافت کے ساتھ نہیں نبھ سکا ہے اور تمثیلاً دو تین شعر بھی لکھدیے ہیں چنانچہ یہ شعر بھی اسی طرز کا ہے۔ اس میں "جاجا" کے لئے "بیجا" نظم کردیا ہے۔ حالانکہ برہم نہایت آسانی سے نظم ہو سکتا تھا۔ اب رہا یہ کہ "بیجا" بازاری زبان ہے۔ اس کی نسبت میں صرف اس قدر کہونگا کہ بیشک اس زمانے کے لحاظ سے حضرت شرر کا کہنا بیجا نہیں ہے۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا نسیم کے زمانے میں بھی "بیجا" بازاری زبان میں داخل سمجھا جاتا تھا کہ نہیں۔

میر تقی میر کا شعر ہے

جنگ زمانہ میں تو بحث ہی عشق ہی کا   بیجا ہوا دل اپنا جب وہ مقام نکلا

(کلیات میر صفحہ ۴۳۳ - دیوان چہارم)

بیجا کے علاوہ اکثر الفاظ ایسے ہیں جو زمانہ گذشتہ میں ضرور فصیح سمجھے جاتے ہونگے۔ مگر فی الحال وہ بازاری زبان میں داخل ہو گئے ہیں۔ مثلاً میر انیس نے "جگہ" کے بالعوض "جاگہ"[ع۶] نظم کیا ہے جس کی مثال ان کے معاصرین کے کلام میں مشکل سے ملیگی۔ اور اس زمانے میں تو "جاگہ" بالکل مبتذل بازاری زبان میں داخل ہے۔ جس کا استعمال قصباتی لوگ بھی معیوب سمجھتے ہیں۔ اس

ع۶ "وہ اس کا مقام ہے جاگہ خلق کی ہے   پہچانتی ہوں میں یہ صدا شیر حق کی ہے" (جلد اول صفحہ ۹۸ بند ۱۱۲)

بنا پر یہ کہنا کہ میر انیس نے بازاری اور مبتذل زبان نظم کی ہی بالکل بیجا ہے۔

جھنجھلا کے ڈرا کے غل مچا کے   سلہ

سمجھا کے بجھا کے دست پا کے

اعتراض ہے کہ "اُردو مین دسترس پانا کہہ سکتے ہین مگر" دست پانا" "قابو پانا" کی جگہہ ہرگز جائز نہین ہے"۔ حضرت شرر کو غالبًا معلوم ہوگا کہ "دست یافتن" فارسی کا محاورہ[عہ] ہے اور قابو پانے کے معنی مین استعمال ہوتا ہے نسیم نے اِس محاورے کا ترجمہ کردیا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہین ہے نسیم کے زمانے مین اِس صورت پر فارسی محاورون کا ترجمہ کردینا جائز سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً "دوش دادن[عہ]" فارسی کا محاورہ ہے۔ رند نے اِس محاورے کا ترجمہ بالکل نسیم کی طرح کیا ہے۔

تیرے کوچے سے نہ بڑھیگا نہ جنازہ میرا   بعد مُردن نہ دیا تو نے اگر دوش مجھے

ظاہر ہے کہ جس طرح آج کل کوئی قابو پانے کے بدلے "دست پانا" نہین کہتا۔ اسی طرح "کاندھا دینے" کی جگہہ "دوش دینا" نہین استعمال کرتا۔ اسی طرح کی اور بہت سی مثالین مل سکتی ہین۔ اُردو مین "انعام دینا" محاورہ ہے۔ مگر چونکہ "انعام کردن" فارسی کا محاورہ ہے۔ لہٰذا آتش نے یہ کہنے مین تکلف نہ کیا کہ ؎

باغبان خیر چمن کا بھی کوئی کام کرین   سرو قمری کو عنادل کو گل انعام کرین

عہ ظہیر فاریابی۔ شبے کہ وسوسۂ عقل دست یافت ظہیر   بنوش بادہ کہ این رفع آن ملال کند

سعدی   چو اقبالش از دوستی سرتافت   بناکام دشمن برو دست یافت

عہ ناصر علی   وضع تمکینِ خرد محرم این راہ نبود   لغزش پا مددے کرد کہ دوشم دادند

علاوہ بریں سوداؔ وغیرہ نے تو "دست" قدرت کے معنی میں اکثر استعمال کیا ہے۔ سوداؔ

کون ایسا ہی جیسے دستِ ہوس سازی میں　　　شیشہ ٹوٹے تو کریں لاکھ ہنر سے پیدا

۱۹　　　تجھ پاس تو اک عصا ہو جانی

اس مصرع پر دو اعتراض ہیں۔ اوّل یہ کہ "اردو میں "جانی" کا لفظ سوائے معشوقہ کے اور کسی کی شان میں اور وہ بھی خلوت کے سوا دیگر موقعوں پر استعمال کرنا بدتمیزی ہی نہیں غلطی ہے مگر گلزارِ نسیم میں تاج الملوک اپنی معشوقہ نہیں بلکہ "روح افزا" سے پہلی ہی ملاقات میں کہتا ہے "جی بجھا نہ جانی" اور وہ جواب دیتی ہے کہ "تجھ پاس تو اک عصا ہے جانی"۔

اس نیم اخلاقی اور نیم شاعرانہ اعتراض کے جواب میں میں صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت شررؔ نے اس کلمۂ شفقت (جانی) کے استعمال کے لئے جو حدود قائم کئے ہیں ممکن ہے کہ ان کی پیروی آیندہ نسلیں کریں لیکن نسیمؔ کے زمانے میں شرفائے لکھنؤ "جانی" کا لفظ سوائے معشوقہ کے دوسروں کی شان میں بھی استعمال کرتے تھے اور محض خلوت میں نہیں بلکہ دو چار کے سامنے۔ اور اب بھی جو بزرگ اس زمانے کے یادگار باقی ہیں ان کا یہی دستور ہے "جانی" کا لفظ بلا کسی رکیک خیال کے محض پیار اور محبت کے اظہار کے لئے بولا جاتا تھا ذیل کی مثالیں سنداً درج ہیں۔

"دریائے تعشق" میں ماں لڑکی سے کہتی ہے۔ ؎

یہ تم سے امید تھی نہ جانی　　　دے جاؤ گے داغِ دل نشانی

طلسم الفت (قلق) میں جب شہزادہ سفر کو جاتا ہے تو ماں کہتی ہے۔ ؎

کیا یہی دل مین ٹھان لی جانی ۔۔۔ ماں کی ہوتی ہے خانہ ویرانی

پھر آخری رخصت کے وقت دعا دیتی ہے۔ ؎

جانی اللہ کی پناہ تمہین ۔۔۔ ہو نہ زنہار رنج راہ تمہین

"زہر عشق" مین بھی ماں لڑکے سے کہتی ہے۔ ؎

پا لا کس کس طرح تمہین جانی ۔۔۔ کون منّت تھی جو نہین مانی

علاوہ برین اگر اس زمانے مین "جانی" کا مفہوم کسی قدر بھی غیر مہذب سمجھا جاتا تو یہ لفظ مرثیون مین ہرگز استعمال نہ ہوتا۔ مگر ایسا نہین ہے۔ انیس :

عباس نے رو کر کہا کیا چاہیئے جانی ۔۔۔ شرما کے سکینہ نے یہ کی عرض کہ پانی

(جلد اوّل صفحہ ۲۱۳ بند ۵۳)

دبیر۔ اکبر نے یہ کی عرض بصد اشک فشانی ۔۔۔ نرغے مین گھرا ہے وہ ید اللہ کا جانی

جلد دوم صفحہ ۱۹ بند ۵۷

یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ مندرجۂ بالا مثالین اُن موقعون کی ہین جہان ہجوم عام تھا اور خلوت کا ذکر نہ تھا۔ مجھکو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ حضرت شرر نے اِس محاورے کے استعمال پر "بدتمیزی" کا الزام لگا کر کتنے بزرگون کی روح کو صدمہ پہونچایا۔

اِس مصرع (تجھ پاس تو اک عصا ہے جانی) پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "تجھ پاس" کا لفظ بھی "تیرے پاس" کی جگہ کہان کی زبان ہے۔ "تیرے" کے بدلے "تجھ" اور "میرے" کے بدلے "مجھ" استعمال کرنا آج کل ضرور نا جائز سمجھا جاتا ہے لیکن سودا و میر کے زمانے تک

یہ محاورہ عام تھا۔

میر — اب اشک حنائی ہے جو تر نکرے نکھتین — وہ تجھ کف رنگین کا مارا نہوا ہوگا

سودا — نگر آباد ہین بسے ہین گاؤن — تجھ بن اُجڑی پڑی ہے اپنی ٹھاؤن

آتش — شام سے تا صبح نیند آئے نہ اک دم تجھ بغیر — آگ نا اون نے لگائی اشک نے طوفان کیا

رند — آنکھ تجھ بن جو کسی پر بُتِ عیار پڑے — عوضِ سبحہ گلے مین مرے زنار پڑے

عاشق روے حسینان ہون مین بیمار اجل — بن کے صورت حور کی مجھ پاس آیا چاہیے

پھر یہ مُنہ لے کے کے آئے ہو مجھ پاس — دُور ہو سامنے سے نفرت ہے

نواب مرزا شوق۔ جیتے دل کو نہ آئے گا تجھ بن — اب کے بچھڑے ملین گے حشر کے دن

کیا افسوس کا مقام ہے کہ "تجھ پاس" کی ایسی عام ترکیب پر حرف رکھا جاتا ہے اور ایسے اعتراض سے اساتذہ لکھنؤ کا دامن آلودہ کیا جاتا ہے۔

نمبر ۲۰ — نکلا جیسے ہے مٹھ کے باہر
پتھرا گئی چشم حلقۂ در

اعتراض ہے کہ "فارسی مین "حلقہ در" کنڈی کو کہتے ہین۔ اور یہان جب ہی معنی صحیح ہوسکتے ہین کہ "حلقہ در" سے دروازے کا پورا چوکھٹا مراد لیا جاے" غالباً حضرت شرر نے ہندؤن کا وہ قدیم ساخت کا شوالہ نہین دیکھا ہے جسے "مٹھ" کہتے ہین۔ ورنہ آپ ایسا اعتراض نہ کرتے۔ "مٹھ" کی ساخت گنبد نما ہوتی ہے۔ اِس مین دروازے کے چوکھٹے وغیرہ یا کنڈی کو مطلق دخل نہین ہوتا۔ اِس کے تین جانب ایک گول دیوار ہوتی ہے اور ایک جانب

ایک محراب دار در ہوتا ہے۔ نسیم نے حلقہ در سے محراب در مراد لی ہے۔ فارسی شعرا نے بھی حلقہ در کو محراب در کے معنون مین استعمال کیا ہے۔ چنانچہ بدر چاچ نے قلعۂ دہلی کی تعریف مین جو قصیدہ لکھا ہے اِس کا ایک شعر محراب در کی تعریف مین درج ذیل ہے۔ ؎

چہ قلعہ الیست کہ قوسے ز حلقۂ در او　　　محیط نہ ربض ہفت طارم اعلیٰ ست

یہ بھی خیال رہے کہ فارسی شعرا نے "کنڈی" کے لئے "حلقہ بیرون در" زیادہ تر استعمال کیا ہے اور حلقۂ در سے عموماً محراب در مراد لی ہے۔

۱۲ ؎ اک دن پنجرہ اُڑا کے لائی
حسن آرا کو وہ کل سجھائی

حضرت شرر نے پیشتر اِس شعر کی تشریح اس طرح کی ہے کہ "یہ تدبیر بتائی کہ آدمی کیونکر قمری بنایا گیا ہے"۔ مگر باوجود اصلی مطلب سمجھ جانے کے آپ نے ایک ایسا اعتراض کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اِس شعر کا مفہوم نہین سمجھے ہین۔ آپ فرماتے ہین کہ "اُردو مین صرف مادّی مشینون کی نسبت کل کا لفظ مستعمل ہے طلسم اور جادو اور عمل کی نسبت اس کا استعمال ہرگز جائز نہین ہے"۔ گو کہ حضرت شرر نے یہ کلیہ قائم کر دیا ہے کہ اُردو مین کل کا لفظ صرف مادّی مشینون کی نسبت استعمال ہو سکتا ہے مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ کل کا لفظ اُردو مین مختلف معنون مین استعمال ہوتا ہے ؎۔ چنانچہ "ترکیب" کے معنی مین بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ نسیم نے اِس شعر مین "کل" سے "ترکیب" مراد لی ہے۔ یعنی حسن آرا کو وہ ترکیب بتائی"۔ اور

؎ جیسا کہ ذیل کے فقرون سے ثابت ہے۔ "مین کل جانا بُلگا"۔ "اونٹ کس کل بیٹھتا ہے"۔ "اُن کو کسی طرح کل نہین پڑتی"۔ وغیرہ وغیرہ

چونکہ نیچر ڑے مین بھی کل ہوتی ہے لہذا تناسب لفظی کا بھی لطف پیدا ہو گیا ہے۔ اس سلسلے مین یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ حضرت شرر کا یہ دعوی کہ جادو اور عمل کی نسبت "مشین" کے معنی مین کل کا استعمال جائز نہین ہے۔ بالکل بے دلیل ہے۔ میر حسن کی "پہلی اعلی او رمقبول عام اُردو مثنوی ہین بدرمنیر جب بینظیر کو جادو کا گھوڑا پرستان مین دیتی ہے تو کہتی ہے۔

یہ گھوڑا مین دیتی ہون کل کا تجھے ولیکن یہ دے تو محلکا مجھے

یا دوسرے موقع پر کہتی ہے۔

جو اُترے تو کل اس کی یون جوڑیو جو برعکس چاہے تو وون موڑیو

۵۲۲ دن بھر تو وہ فاختہ پڑھاتی
شب کو اُسے آدمی بناتی

حضرت شرر کا طوطی فکر اس شعر کی نسبت یون نغمہ زن ہے۔" طوطا پڑھایا جاتا ہے مینا پڑھائی جاتی ہے۔فاختہ کا پڑھایا جانا ایک بالکل نئی بات ہے" حضرت شرر کو معلوم ہوگا کہ یہ "طلسمی فاختہ" تھی اور اس کو پڑھانے والی ایک پری تھی جو کہ جادو کے زور سے بہت سی ایسی "نئی باتین" کرسکتی تھی جو حضرت شرر کے خیال کے مطابق قابل اعتراض تصور کی جاسکتی ہین۔علاوہ برین فقیر اکثر فاختہ پالتے ہین اور اُسے پڑھاتے بھی ہین۔ اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت شرر کا اعتراض صحیح ہے تب بھی اس کا الزام اُس شخص کے سر ہے جس نے قصے کے واقعات کو ترتیب دیا ہے نہ کہ نسیم کے سر آخر مین مین یہ عرض کرون گا کہ کسی "نئی بات" کو قابل اعتراض قرار دینا واجب نہین ہے۔عام طور سے کبوتر اُڑائے جاتے ہین مگر خلیل خان فاختہ اُڑا گئے

یہ "بالکل نئی بات ہے" خدا جانے یہ اعتراض "اساتذہ لکھنؤ" میں سے کن صاحب کی پرواز فکر کا نتیجہ ہے۔ مجھ کو تعجب ہے تو اس قدر کہ اس زمرے میں حضرت شرر نے گلزار نسیم کی اس حکایت پر کیوں نہ اعتراض کیا جس میں یہ ذکر ہے کہ ایک طائر نے اپنے صیاد سے جواب و سوال کئے۔ یہ "بالکل نئی بات ہے"۔

۲۳ سونچا جو نہ تھا صلاح اُلجھنا
دانائی تھی بات کا سمجھنا

اِس شعر پر ایک بہت مختصر سا اعتراض ہے کہ "دانائی تھی" کتنا بُرا اور بھونڈا معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ اس اعتراض کی زیادہ تشریح نہیں کی گئی ہے۔ لہذا چند اشعار "اساتذہ لکھنو" کے کلام سے لکھے جاتے ہیں۔ جن کی بندش اس مصرع (دانائی تھی بات کا سمجھنا) کی بندش کے مطابق ہے۔

طلسم اُلفت (قلق) شب نہ تھی دود آہ عاشق تھا
جلوۂ نور صبح صادق تھا

آتش

عمر بھر مضمون طلائی رنگ کے بندھتے رہے	سرنوشت اپنی بھی نسخہ تھا کوئی اکسیر کا
مسجد سے میکدے میں مجھے نشہ لیگیا	موجِ شراب جادہ تھی راہِ صواب کا

امیر مینائی

وادیِ ایمن میں تھی برقِ تجلی بے حجاب	حیرتِ موسیٰ تھی پردہ جلوۂ دیدار کا

اب اس عام بندش کو کس طرح بھونڈا کہئے۔

مین نے گلزار نسیم کے دیباچے مین یہ خود تسلیم کرلیا ہے کہ نسیم سے بھی اکثر تناسب لفظی لطافت کے ساتھ نہین نبھہ سکا ہے اور تمثیلاً دو تین شعر بھی لکھ دیے ہین لیکن حضرت شرر نے غالباً اعتراضات کی تعداد بڑھانے کے لئے اس قسم کے شعر بھی اپنے مضمون مین لکھے ہین جن مین آپ کے نزدیک نسیم سے تناسب لفظی اچھی طرح نہین نبھہ سکا ہے۔ مگر جن اشعار پر آپ نے اس پہلو سے اعتراضات کئے ہین۔ وہ ایسے اعتراضات سے بری ہین۔ اب اس رنگ کے اعتراضات ملاحظہ ہون۔

۲۴ص داغا تو چلے تفنگ سے وہ
چھوٹے قید فرنگ سے وہ

اعتراض ہے کہ "تفنگ کی چال سے انسان کی چال کو کیا علاقہ؟" اوّل تو مین عرض کرونگا کہ "تفنگ چلنے" سے "گولی کا چلنا" مراد لیا جاتا ہے۔ لہذا انسان کی چال کو تیزی کے لحاظ سے گولی کی "چال" سے تشبیہ دی ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ "تفنگ چلنا" گولی کے چلنے کے معنون مین نہین استعمال کیا جاتا۔ تب بھی حضرت شرر کے اعتراض کا جادو چلتا نہین نظر آتا۔ ذومعنی الفاظ کو اس طرح استعمال کرنا جس طرح نسیم نے اس شعر مین "چلے" کو نظم کیا ہے نزاکت شاعرانہ مین داخل ہے۔ اور شعرائے لکھنؤ نے اس قسم کے تکلفات کو بہت رواج دیا ہے۔ چند مثالین درج ہین۔ آتش۔

ایسی وحشت نہین دل کو کہ سنبھل جاؤنگا
صورت پیرہن تنگ نکل جاؤنگا

ظاہر ہے کہ پیرہن کے نکل جانے سے آدمی کے نکل جانے کو منطقی طور پر کوئی علاقہ نہین ہے مگر شاعری مین ایسا کرنا جائز ہے - اِس رنگ کی اور مثالین بھی ہدیۂ ناظرین ہین - وزیر

ضعف سے جانکنی کیا خون کی چھینٹین اُڑکر — آستین کا ہے ترے کوس انہین منزل قاتل

ساقی ہوا ہے عشق کسی خانہ جنگ کا — مانگونگا میکشی کو پیالہ تفنگ کا

(حضرت شرر کہین گے کہ میکشی کے پیالے سے اور تفنگ کے پیالے سے کیا علاقہ)

قلق - اس کی تلوار کے رومال کا پھاہا تو نہین — آبِ شمشیر کی تاثیر جو تیزاب مین ہے

ایسا کانٹا ہے خار مژگان کا — وزن کرلیتا ہے زرِ جان کا (طلسم الفت)

رند - دور ہوتا روح طائر سے کثافت جسم کی — گھاٹ پر اس کی سروہی کے نہانا چاہیے

۴۵ وہ پوربی کرکے جوگیا بھیس
جنگلے کی راہ سے چلا دیس

اعتراض ہے کہ "سب راستے چھوڑ کر تاج الملوک جنگلے کی راہ محض اس لئے بھیجا گیا کہ مصنف گلزار نسیم کو اس لفظ کی ضرورت تھی" حضرت شرر نے اِس مقام پر بھی سیاق کلام سے چشم پوشی کی ہے - یہ شعر اُس موقع کا ہے کہ جب کہ تاج الملوک گل لیکر وطن کی طرف کشتی پر چلا ہے اور جب وطن کے متصل آگیا ہے تو اِس مقام پر یہ صورت درپیش آئی ہے -

سوچا کہ مین خود ہون خانہ برباد — کیا جانیے کیا پڑے گی اُفتاد

لازم ہے گل اپنا ہاتھ رکھیے — موقع نہین بھیڑ ساتھ رکھیے

لنگر کا انھین کیا اشارہ — خود کشتی سے کر گیا کنارا

وہ پوربی کر کے جو گیا بھیس　　جنگلے کی راہ سے چلا دیس

اِس سلسلے میں آخری شعر کے پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ چونکہ تاج الملوک کو بھیڑ ساتھ رکھنا منظور نہ تھی اِس لئے وہ دریا کی راہ چھوڑ کر فقیروں کے لباس میں جنگل کے راستے سے وطن کی طرف چلا۔ نیز چونکہ وہ بھیس بدل کر چلا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اسے کوئی پہچانے۔ اِس لیے وہ بھی شاہراہ سے کنارہ کشی کر کے جنگلوں میں ہوتا ہوا وطن کی طرف سدھارا۔

ص ۲۶　　نقش اس کو ہوا کہ بس وہی ہے

ان سادوں سے کنارہ کیجئے

اس شعر پر دو اعتراض ہیں اولاً یہ کہ "اُس کے دل پر نقش ہوا" کے بدلے "نقش اس کو ہوا" کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا"۔ اِس زمانے کے لحاظ سے حضرت شرر کا اعتراض بہت بجا ہے لیکن نسیم کے وقت میں ایسا اختصار جائز سمجھا جاتا تھا۔ شیخ ناسخ فرماتے ہیں۔

نقش ہیں نقش و نگارِ لکھنؤ　　سارے نقشے سامنے آنکھوں کے ہیں

(یعنی دل پر نقش ہیں ہمارے)

دوسرا اعتراض حضرت شرر نے "سادوں" پر جڑا ہے۔ آپ فرماتے ہیں" اصل تو سادہ مزاج"، "سادہ لوح" ہے۔ "سادے آدمی" اور سادے لوگ بھی سہی، مگر محض "سادوں کا" لفظ تو ٹھیک نہیں معلوم ہوتا"۔ اِس اعتراض کے لئے وہی جواب ہے جو اِس کے پیشتر کے اعتراض کے لئے لکھا گیا ہے اور دو شعر سنداً پیش ہیں۔ ناسخ

ترک کرواتا ہے عشق سادہ رو　　زاہد بے دین بھی کتنا سادہ ہے

(یعنی "سادہ لوح" ہے۔ یا سادہ آدمی ہے)

کتنی سادہ ہو کہ جب مانگتی میناسے ہو

جان صاحب

مین بھبو کا لعل منگوادون تمھین دو چار رخ

جس زمانے مین محض "سادہ" "سادہ لوح" کے بدلے بولا جاتا تھا تو اُس کی جمع "سادون" بھی ضرور فصیح سمجھی جاتی ہوگی۔ ص

ص ۲۷ دیودن نے ادھر محل بنایا

کشتی سے وہ دخت رز کو پایا

اعتراض ہے کہ "نسیم نے محمودہ کو بغیر خیال کئے دخت رز کہا، یا اور یہ یاد نہین رہا کہ دخت رز شراب کو کہتے ہین"۔ حضرت شرر کا غالباً یہ خیال ہے کہ "دخت رز" سے کوئی معشوقہ عورت مراد لینا جائز نہین ہے لیکن ایسا نہین ہے۔ آتش کا شعر ہے۔

دختر رز مری مونس ہو مری ہمدم ہے مین جہانگیر ہون یہ نورجہان بیگم ہے

یا قلق کہتے ہین۔ ص

لبالب بادۂ گلرنگ سے دل کا پیالا ہے وہ میکش ہون کہ مین نے دخت رز کو گھر مین ڈالا ہے

ظاہر ہے کہ نہ آتش محض "شراب" کو نورجہان بیگم کہہ سکتے تھے۔ نہ قلق یہ کہہ سکتے تھے کہ "مین نے شراب کو گھر مین ڈالا ہے لیکن "دخت رز" مین لفظ "دخت" کی وجہ سے شاعر کو "شراب" عیش و عشرت کی ایک "مجسم تصویر" نظر آتی ہے اس لئے وہ اِس کو کسی معشوقہ عورت سے تشبیہ دینے مین تکلف نہین کرتا۔ اِس صورت مین اگر "دخت رز" نورجہان بیگم بن سکتی ہے تو محمودہ کیون نہین بن سکتی۔ اور چونکہ محمودہ کشتی پر تھی اور کشتی دخت رز سے بھی خاص تعلق رکھتی ہے اس لئے تشبیہ اور زیادہ

ہوگئی جس شخص کو شعر و سخن کا کچھ بھی مذاق ہے وہ اِس قسم کی شاعرانہ نزاکتین بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

شعر ۲۸ — وہ گندم گوں نما تھی بالی

حضرت شرر اِس مصرع کی نسبت فرماتے ہین کہ " رعایت لفظی نے مضمون کی کیا مٹی خراب کی ہے "۔ میری سمجھ مین نہین آتا کہ اس مصرع مین کیا عیب ہے بہتر ہو گا اگر حضرت موصوف کسی آئندہ موقع پر اپنے اِس مختصر مگر نا موزون اعتراض کی تشریح فرمائین۔

شعر ۲۹ — فوارہ تو گم خزانہ باقی

اِس شعر کی نسبت حضرت شرر نہایت حیرت سے فرماتے ہین کہ " بھلا فحش و ابتذال کی کوئی حد ہے "۔ جس طرح حضرت شرر نے گلزار نسیم کی زبان پر بحث کرتے ہوئے تمام قدیم محاورون کو جو کہ اب متروک ہو گئے۔ غلط کہنے مین تکلف نہین کیا ہے اسی طرح اِس موقع پر بھی تنقید سخن کے اِس اصول اولین سے بے خبری ظاہر کی ہے کہ کسی شاعر کے کلام کے اخلاقی پہلو پر اِس زمانے کی تہذیب کا معیار پیش نظر رکھ کر بحث کرنی چاہیئے جس زمانے مین کہ وہ شاعر پیدا ہوا تھا۔ نسیم کے زمانے مین اِن فحش محاورون کا نظم کرنا ناروا نہین سمجھا جاتا تھا جن کا زبان پر لانا اب خلاف تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ شاعر کا کلام اِس کے زمانے کی تہذیب کا آئینہ ہوتا ہے اس لئے گلزار نسیم بھی فحش کے کانٹون سے پاک نہین ہے۔ نسیم اِس حالت مین ضرور قصور وار تھے جب کہ ان کے کلام مین فحش محاورے ملتے اور ان کے معاصرین کا کلام ایسے محاورون سے پاک ہوتا مگر ایسا نہین۔ اس زمانے کے اکثر شعرا کے کلام مین فحش محاورے موجود ہین۔

شعر ۳۰ — باہم زن و مرد نے کیا میل — دریا سے ملا وہ قطرہ زن سیل

اعتراض ۔ ہے کہ " یہان سیل کے معنی ہی کچھ نہین باقی رہے "۔ غالبًا حضرت شرر " قطرہ زن " کے معنی " قطرہ بار " سمجھے ہین ۔ جبھی آپ فرماتے ہین کہ " یہان سیل کے کچھ معنی باقی نہین رہے "۔ مگر ایسا نہین ہے ۔ " قطرہ زن " فارسی کی ایک خاص اصطلاح ہے جس کے معنی " شتابندہ " کے ہین ۔ یہان قطرہ زن سیل سے " شتابندہ سیل " مراد ہے جو کسی صورت مین بے معنی نہین ہے " قطرہ زن " کے معنون کی نسبت حضرت شرر کوئی لغت دیکھکر اپنا اطمینان کر سکتے ہین ۔

۵۳۱ غربت مین وطن کی دھن سمائی

اِس فیل کو یاد ہند آئی

اعتراض ہے کہ " فیل سے تشبیہ صرف ہند کی ضرورت سے دی گئی ہے ۔ مگر کس قدر بُرا معلوم ہوتا ہے "۔ حضرت شرر کا اِس مصرع کی نسبت کچھ ہی خیال کیون نہ ہو مگر اس کو قبول عام کی سند مدت ہوئی مل چکی ہے ۔ یہ مصرع ضرب المثل ہو گیا ہے ۔ کہ ع اِس فیل کو یاد ہند آئی ؂

۵۳۲ خواہش جو بلائے جان ہوئی وہ

ہلکا ہوا وہ گران ہوئی وہ

اعتراض ہے کہ " خیر بکاولی تو چونکہ آدھی پتھر کی ہو گئی تھی اِس لئے گران ہوئی مگر ایسی حالت مین تاج الملوک صاحب کیونکر ہلکے ہوے "۔ تعجب ہے کہ حضرت شرر لکھنؤ کے اِس معمولی محاورے سے واقفیت نہین رکھتے کہ " ہلکا ہونا " ذلیل ہونے کے معنون مین بولا جاتا ہے ۔ نسیم نے " ہلکا ہوا " سے یہ مراد لی ہے کہ وہ بھری محفل مین ذلیل ہوا اور شعرائے اُردو نے بھی یہ محاورہ نظم کیا ہے ۔ قلق

بیتابیِ اُلفت نے کیا ہے سبک ایسا خاطر پہ گران یار کی نظرون مین ہون ہلکا

جان صاحب

جان صاحب کی دوگانا بچپائی کیا کہوں
کر دیا ہلکا مجھے منجھلی بُوا کے سامنے

حضرت آثر اِس شعر میں "گران ہوئی" کے معنی بھی غلط سمجھے ہیں۔ "گران ہوئی" کے معنی اس مقام پر یہ ہیں کہ "بکاؤلی اہل محفل کی طبیعت پر گران ہوئی"

حضرت آثر یہ بھی فرماتے ہیں کہ "گلزار نسیم کے بہت سے اشعار میں افعال کا استعمال ایسی بُری طرح سے ہُوا ہے کہ جو نہ لکھنؤ والوں کے نزدیک جائز ہے۔ نہ دہلی والوں کے نزدیک"۔ اِس اعتراض کی تائید میں حضرت موصوف اِس قسم کے مصرعے پیش کرتے ہیں۔

ع۔ خاتم کے نگین بتائے ہوتے۔ ("خاتم کے نگین اُنہوں نے بتائے ہوتے"۔ یا خاتم کے نگین کو بتایا ہوتا۔)

ع۔ حیلہ کر کے چھپائی یاں چندے (بجائے "اس کو چھپایا")

ع۔ اِس شب کو بغل میں آکے جاگا (یعنی "اس رات جب وہ آئی تب جاگا")

ع۔ بائیں دیکھا کہیں نہ پائی (یعنی "کہیں نہ پایا")

ع۔ بیدار کیا وہ ماہ پیکر (یعنی اس ماہ پیکر کو بیدار کیا)

وغیرہ وغیرہ

بیشک آج کل جو زبان کا رنگ ہے اِس کے لحاظ سے افعال کا استعمال اس صورت پر غیر فصیح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن نسیم کے معاصرین کے کلام میں اِس قسم کی ترکیبیں عام نظر آتی ہیں۔ ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ناسخ   کیا اتحاد ہی کہ وہ پیٹیا جو گاڑ کر   مدفن مین ہو گیا ہے ہمارا بدن سفید

(یعنی اُس نے اپنے تئین "پیٹیا" کے بدلے "وہ پیٹیا" استعمال ہوا ہے)

"   کیون نہو وہ نوجوان برسات مین رنگین لباس   پیر گردون تک شفق کا لال جوڑا چاہیے

(یعنی پیر گردون تک کو شفق کا الخ)

"   گھر مین تیرے پاس سے جاتا نہین   اب تو سیکھا ہے مرے ڈھنگ آئینہ

(یعنی اب تو آئینے نے میرے ڈھنگ سیکھے ہین)

"   بوسہ مانگا مین نے وہ کہنے لگے گھر سے نکل   جو کہ سائل ہے وہ دروازے کے باہر چاہیے

(یعنی اس کو دروازے کے باہر ہونا چاہیے)

آتش۔ جوشِ وحشت مین جو لی زندان سے مین نے راہِ دشت   کو و کان مجھ کو خدا حافظ پکارے شہر سے

(یعنی کو و کان نے مجھ کو خدا حافظ پکار کر کہا)

"   باغِ عالم مین یہی میری دعا ہی روز و شب   خار خارِ عشق گل رخسار توڑا چاہیے

(خار خارِ عشق گل رخسار کو توڑا چاہیے)

"   ہو گیا ہے ایک مدت سے دلِ نالان خموش   باغ مین جا کر اسے بلبل سنانا چاہیے

(اسے نغمۂ بلبل سنوانا چاہیے)

رند۔ حاضر اگر ہی دن کو تو غائب ہے رات کو   غمزہ یہ کس حسین سے سیکھا ہی آفتاب

(یعنی آفتاب نے یہ غمزہ کس حسین سے سیکھا ہے)

"   ہجر بت مین بھی جب ہوے ہین تنگ   اپنے اللہ کو پکارے ہین

(یعنی ہم نے اپنے اللہ کو پکارا ہے)

(دریائے تعشق (واجد علی شاہ)

پایا نہ مگر وہ ماہ طلعت
پوشیدہ رہا برنگ نکہت

یعنی "اُس ماہ طلعت کو نہ پایا" یہ بعینہ ویسی ہی ہے جیسے کہ "بیدار کیا وہ ماہ پیکر"

قلق خواہشِ جستجوے یار جسے بھی کچھ ہی بیشمار بعدِ فنا مرا غبار ڈھونڈھ پھرا گلی گلی

(یعنی "اسے ڈھونڈھتا پھرا گلی گلی)

اُس زمانے میں نظم کے علاوہ نثر میں بھی افعال کا استعمال اس صورت پر جائز سمجھا جاتا تھا۔ فسانہ عجائب سے ذیل کا اقتباس تمثیلاً درج ہے۔" دولھا نے سہرا سر سے لپیٹ دُلہن گود مین اُٹھائی الخ" (یعنی دلہن کو گود مین اُٹھایا)

حضرت شرر نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ "شتر گربہ کے عیب سے بھی یہ مثنوی خالی نہین"۔ اور اِس اعتراض کی تائید مین ایک شعر پیش کیا ہے جو کہ درج ذیل ہے۔

۳۴ ہے پاک نہین خطا تمہاری
فرمائیے کیا سزا تمہاری

افسوس ہے کہ حضرت شرر اس شعر کی نزاکت کو نہین سمجھے - ورنہ یہ اعتراض نہ کرتے۔ یہ شعر اس موقع کا ہے جب کہ بکاؤلی تاجُ الملوک پر اپنے غصّے کا اظہار کر رہی ہے - اور یہ سب پر روشن ہے کہ جس وقت کوئی شخص عالمِ غیض مین کسی کو خطاب کرتا ہے تو وہ یہ نہین سوچتا کہ میری تقریر اِس وقت "شتر گربہ" کے عیب سے پاک رہے - وہ کبھی "تم" کہتا ہے - کبھی طنزاً "آپ" کہتا ہے - چنانچہ اس شعر مین نسیم نے بکاؤلی کے غصّے کی تصویر کھینچی ہے - وہ کبھی "تم" کہتی ہے

کبھی طنزاً " فرمائیے " کہتی ہے۔ الفاظ سے اِس قسم کی مصوری کرنا کمال شاعری مین داخل ہے اگر اس شاعرانہ نزاکت کے خیال کو بالائے طاق رکھ کر اس شعر کو محض ایک مُلّائے مکتبی کی نگاہ سے دیکھیے۔ تب بھی حضرت شرر کا اعتراض بیجا نظر آتا ہے۔ کیونکہ نہ تو فارسی شعرا نے " شتر گربہ " سے پرہیز کیا ہے نہ قدیم اساتذہ اُردو نے۔ بعض طبقۂ حال کے شعرا نے " شتر گربہ " کو ناجائز قرار دیا ہے؎۔ نسیم کے معاصرین کے کلام مین " شتر گربہ " کی بچاسون مثالین مل سکتی ہین۔ طوالت مضمون کے خیال سے ہر شاعر کے کلام سے دو ایک مثالین دینے پر اکتفا کیا ہے۔

حافظ۔ اگر آن تُرک شیرازی بدست آرد دلِ ما را   بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را
"   بسرت گر ہمہ عالم بسرم بخروشند   نتوان برد ہوائے تو برون از سر ما
آتش۔ ہر لباس آپ کو ہے زیبندہ   جامہ زیبی کے بادشاہ ہو تم
"   تم تو غریب خانے مین آئے نہ ایک روز   فرمائیے تو شب کو کسی وقت آؤن مین
ناسخ۔ مین جان بلب ہون گلا کاٹو یا گلے سے ملو   جو اس مین آپ کو منظور ہو سو جھٹ پٹ ہو
رند۔ ہاتھ سے رند کو کھوتے ہو عبث   کہین ایسا نہ ہو پچھتائیے آپ
قلق   تیزدستی کی پائیے گا سزا   شامت آجائیگی تمہاری بچا

؎ گو کہ فصحائے دہلی و لکھنؤ نے " شتر گربہ " کو اب ترک کر دیا ہے۔ مگر اکثر زمانۂ حال کے مصنفین کے یہان بھی اس طرز قدیم کی پیروی کا پتا ملتا ہے۔ نظم تو درکنار۔ نثر مین ایک ناول کے مکالمے مین " شتر گربہ " کی مثال درج ذیل ہے۔

مریم۔ آخر بیان تو کرو کیا ہوا۔

طلح۔ غلام آج دوپہر کو ذرا سو گیا تھا۔ ناگہان کیا دیکھتا ہون کہ ایک نورانی صورت سامنے ہے۔

(ایام عرب حصۂ دوم مصنفۂ جناب عبدالحلیم صاحب شرر صفحہ ۱۲۰)

قلق - آپ کو کچھ نہین خیال اپنا دیکھو آئینے مین تو حال اپنا (طلسم الفت)
نواب مرزا شوق شکل دکھلاؤ کبریا کے لئے بام پر آؤ ذرا خدا کے لئے (زہر عشق)

پڑی ہین سر مین جوئین اب ایسی کہ زچ ہی جینے سے دل ہمارا
جان صاحب
"امانی اماں مین سر مین ڈالون منگادو تھوڑا سا مجھ کو پارا

اِس اعتراض کے بعد حضرت شرر فرماتے ہین کہ" دو ایک جگہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا سے چھپنے مین غلطی ہوگئی اور وہ اب تک چلی آتی ہے۔ مسٹر چکبست نے ان غلطیون کی طرف بھی توجہ نہین کی۔ اِس دعوے کی تائید مین آپ ذیل کے دو شعر پیش کرتے ہین۔

ص۳۵ (۱) رہرو کو دیا یہ لطف و اکرام آتے آرام جاتے پیغام
ص۳۶ (۲) دیکھا تو تمام دشت گلزار دائین بائین دو رستہ بازار

پہلے شعر کی نسبت آپ فرماتے ہین کہ" صاف ظاہر ہے کہ "پیغام" کی جگہ اصل مین "انعام" کا لفظ ہوگا"۔ میری سمجھ مین نہین آتا کہ "پیغام" کی جگہ "انعام" کا لفظ کیون ہوگا۔ سرا مین جو مسافر ٹھہرتے ہین اُن کو سرا کا مالک کسی قسم کا پیغام تو دے سکتا ہے مگر وہ انعام کیون دینے لگا۔ کیا اچھا ہوتا کہ اِس اعتراض کی تشریح کردی جاتی۔

دوسرے شعر کی نسبت تحریر ہے کہ" دو رستہ کی جگہ "دو دستہ" ہوگا"۔ ممکن ہے کہ اہل عرفان اِس اصلاح کا اصل منشا سمجھ لین۔ میرا فہم تو اس تصرف کا مطلب سمجھنے مین قاصر ہے۔ شاید حضرت شرر کا یہ خیال ہو کہ "دو رستہ" لکھنؤ یا دہلی کا محاورہ نہین۔ اِس شبہے کے مٹانے کے لئے دو شعر مثیلاً درج ذیل ہین۔

سب دوکانین دورستہ ہون رنگین
طلسم الفت (قلق) حد سے افزون ہو شہر کی تزئین

گھر سے نوشہ کے تا مکان عروس
یون دورستہ تھے جھاڑ اور فانوس

دو رستہ جو روشن چراغان ہوے
(میر حسن) تیلنگے خوشی سے غزلخوان ہوے

مضمون کے آخری حصے مین حضرت شرر کا اشہب قلم بالکل بے قابو ہوگیا ہے چنانچہ بلا وجہ آپ نے اکثر ذاتی حملے مجھ پر کیے ہین۔ مثلاً متعدد جگہ آپ نے مجھے تصرف بیجا کا ملزم ٹھہرایا ہے اور اس رنگ کے فقرے لکھے ہین۔

"ہمارے دوست نے بہت سی اور نئی غلطیان پیدا کر دین"

"اہل زبان سے پوچھیے کہ اس اصلاح سے شعر بنا، یا بگڑا"

"اس اصلاح نے شعر کی مٹی خراب کر دی۔"

"غرض اس اصلاح مین بھی ناسمجھی سے مثنوی پر ظلم ہوا ہے۔"

"بے تکلفی کو خاک مین ملانے کے بعد شعر کو کیا غارت کر دیا۔"

"افسوس ان اصلاحون سے مثنوی کو کیسے گہرے اور بڑے زخم لگے ہین"

اور جس بنیاد پر آپ نے ان ہوائی تیرون کا مجھے نشانہ بنانا چاہا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔ آپ فرماتے ہین کہ "مسٹر چکبست صاحب نے اس نئے ایڈیشن کو خود مصنف صاحب کے اصلی ایڈیشن (یعنی وہ ایڈیشن جو نسیم کی زندگی مین مطبع حسینی مین ۱۸۴۳ء شایع ہوا تھا) کے مطابق درست کر کے شایع کیا ہے

مین نے اس کا اندازہ کرنے کے لئے مطبع نامی کی آخر ۱۹۳۰ء کی چھپی ہوئی گلزار نسیم منگوائی اور اُس سے مقابلہ کرکے دیکھا" واقعی تحقیق و تنقید کے معنی یہی ہین مین کہتا ہون کہ اگر حضرت شرر منشی نولکشور کے مطبع کی چھپی ہوئی مثنوی سے اس نئے ایڈیشن کا مقابلہ کرتے تو آپ کو بہت سے اور "اصلاحین" اور تصرفات مل جاتے۔ خیر جو کچھ حضرت شرر نے میری نسبت تحریر فرمایا ہے اس کا ترکی بہ ترکی جواب دینا مین تہذیب مضمون نگاری کے خلاف سمجھتا ہون۔ میرا جواب صرف اس قدر ہے۔ ع

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی

جن اشعار مین حضرت شرر کو تصرف بیجا کا شک پیدا ہے۔ اُن مین سے اکثر مین واقعی کتابت کی غلطیاں موجود ہین۔

غلط	صحیح
بولی وہ جمیلہ کہہ کرون کیا	بولی وہ جمیلہ پھر کرون کیا
پو پھٹتی ہے جگ اُٹھون کا ٹوٹا	پَو پھٹتے ہی جگ اُن کا ٹوٹا

ے جس حالت مین کہ حضرت شرر نے ایک نقطے یا شوشے کے گھٹ جانے یا بڑھ جانے کو تصرف بیجا قرار دیا ہو اس حالت مین آپ سے یہ امید نہین ہوسکتی کہ آپ کسی لفظی تغیر کو کتابت کی غلطی تسلیم کرین لیکن کاتبون کے لئے ایسی غلطی کرنا کوئی نئی بات نہین ہے۔ حضرت شرر کے اسی اعتراضات والے مضمون مین گلزار نسیم کا ایک مصرع اس طرح چھپا ہے۔ ع داخا تو چلے تو تفنگ سے وہ پا جہل و تعصب کا اشارہ تو یہی ہے کہ مین یہی کہون کہ حضرت شرر نے "تو" بڑھا کر نا سمجھی سے مصرع کی بے تکلفی اور سادگی کو خاک مین ملا دیا ہے۔ یا ناموزون کر دیا لیکن عقل سلیم کہتی ہے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے نہ کہ مضمون نگار کی۔ مراد اس سے یہ ہے کہ ایسی کتابت کی غلطی ہو جانا "فاختہ کے پڑھنے" کی طرح ناممکن نہین ہے۔

صحیح	غلط
جِننی تھی ہمیشہ دُخترِ اس کو	جِننی تھی ہمیشہ دُختر اسکو
قاصد نے جو رُخ پری دکھایا	قاصد نے رُخ پری دکھایا
قسمت سے مفر ہے اب نہ ۔ مامن	قسمت سے مقر ہے اب[۵] یہ مامن
صیّادنی لائے پھانس کر صید	صیاد تھی لائی پھانس کر صید
چلیے گا تو ساتھ ہین بلا عذر	چلیے گا تو ساتھ ہین بلا عذر

اِن مصرعون کے علاوہ اور جن اشعار پر حضرت شرر کو "اصلاح" یا "تصرف" کا شک ہوا ہوا ہے وہ اسی حالت پر ہین جس حالت مین کہ وہ اصلی اڈیشن مین پاے گئے تھے۔ اِن مین اصلی اڈیشن پر اگر کہین تصرف کیا ہے تو وہ صرف اِس قدر کہ یاے معروف کے بدلے یاے مجہول، یا اکثر یاے مجہول کے بدلے یاے معروف بنا دی ہے۔ کیونکہ پُرانے زمانے کے کاتب یاے معروف اور یاے مجہول کا فرق نہین مانتے تھے۔ "نامی پریس" کی مثنوی کو جس شخص نے ترتیب دیا ہے اُس نے اکثر قدیم محاورون کے بدلے اس زمانے کے محاورے لکھدیے ہین۔ غالبًا اسی بنا پر حضرت شرر فرماتے ہین کہ "بازاری پریس نے مثنوی کو بگاڑا نہین بلکہ بنا دیا۔" میری راے مین اِس قسم کا تصرف کرنا طالبانِ فن زبان کے حق مین ظلم کرنا ہے۔ چاہے عامیانہ مذاق کے لوگ ایسے تصرفات کو پسند کرین۔ کیونکہ ان کی نظر وسیع نہین ہوتی ہے۔ مگر نقادانِ سخن جانتے ہین کہ مرتب کا فرض یہ ہے کہ وہ کسی گنجینۂ دار معانی کی چھوڑی ہوئی امانت مین کسی طرح کی خیانت کرین

---

۵ اِس مصرع مین "نہ" کے بدلے "یہ" چھپ گیا ہے۔ حضرت شرر نے "مقر" پر بدگمانی ظاہر کی ہے لیکن خدا جانے کس مصلحت سے "یہ" کو چھوڑ دیا۔

آخر مین حضرت شررا اپنے مضمون کی نسبت فرماتے ہین کہ ''بعض حضرات کو یقیناً یہ تحریر ناگوار گذرے گی اور مین بھی خدا سے چاہتا ہون کہ انہین سخت ناگوار گزرے۔ کیونکہ ایسی صورت مین وہ شاید زیادہ جوش سے جواب لکھین گے'' مجھ کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ علمی مباحثون مین اِس جوش بیجا کا اظہار جس کے حضرت شرر طالب ہین اصل مطلب کو خبط کر دیتا ہے اور صرف سخن پروری پر آمادہ کر دیتا ہے۔ اگر حضرت شرر کے مضمون کے جواب لکھنے مین کوئی صاحب اِس قسم کا جوش صرف کرین گے جس سے کہ مضمون مذکور کا ایک ایک حرف معمور رہے تو سوا اس کے کہ انصاف کا خون ہو اور کچھ نہ حاصل ہو گا۔ نقاد سخن کا فرض یہ ہے کہ وہ اس بات کے لئے دست بدعا نہ رہے کہ دوسرون کو اس کی تحریر ناگوار گزرے بلکہ اس بات کی کوشش کرے کہ اس کے مخالف اُس کے دلائل پوری طور سے سمجھ جائین۔

ایک یادگار مشاعرہ

(ماخوذ از "ادیب" اپریل سنہ ۱۹۱۱ء)

تیرہ چودہ سال کا عرصہ ہوا کہ لکھنؤ مین پنڈت للتا پرشاد صاحب وثیقہ دار کے یہان ایک معرکہ آرا مشاعرہ ہوا تھا۔ مصرع طرح یہ تھا۔

"اُگتی ہے جا بجا سبزہ کنگھی مرے چمن مین"

لکھنؤ کے قریب قریب تمام اساتذہ جمع تھے لیکن جلال مرحوم نہین تشریف لائے تھے قریب ۴ بجے شام کے مشاعرہ شروع ہوا اور تقریباً دو بجے شب کو ختم ہوا تمام اساتذہ نے اپنے اپنے رنگ مین پُرزور غزلین کہی تھین اور پُرزور غزلین کس طرح نہون۔ اِس زمین مین آتش کی یادگار غزل کا نغمہ سب کے کانون مین سمایا ہوا تھا۔ سبحان اللہ کیا کیا شعر فرمائے ہین۔ معلوم ہوتا ہے بزم خیال مین نور خداداد کی شمعین روشن ہین۔ میرے دوستو ذیل کے اشعار پر نظر ڈالو اور فصیح لکھنؤ کی روح پر دُرود پڑھو۔ ؎

شیرین زبان ہوئی ہے فرہاد کے دہن مین
لیلی پکارتی ہے مجنون کے پیرہن مین

دو روز ہے یہ لطفِ عیش و نشاطِ دُنیا
بوئے شبِ عروسی مہمان ہے چمن مین

بازار مصر مین چل یوسف کا سامنا کر | کھوٹے کھرے کا پردہ کھل جائیگا چلن مین
اک تختہ ہفت کشور دہلی کا ہے ہماری | تو آسمان ہین اپنے اکبر کے نورتن مین
آیا تھا بلبلون کی تدبیر مین گلون نے | ہنس ہنس کے مار ڈالا صیاد کو چمن مین
یاد فقیر آ گئے اُس بُت کے بھولتا ہے | اکی گرہ مین دو نگا زُنار برہمن مین
صحرا کو بھی نہ پایا بغض و حسد سے خالی | کیا کیا جلا ہے سا کھو پھولا جو ڈھاک بن مین

آخری شعر تو ایسا ہے کہ اِس کا جواب اُردو شاعری مین ملنا مشکل ہے۔ آتش کے بعد اساتذہ قدیم مین اسیر مرحوم نے دو ایک شعر اس زمین مین خوب کہے ہین۔ فرماتے ہین۔

تم رنگ ہو سخن مین تم پھول ہو چمن مین | تم روح ہو بدن مین تم شمع انجمن مین
گھر کر سحاب آیا نہرون مین آب آیا | دورِ شراب آیا مستو چلو چمن مین
آفت مین جان خستہ پابستہ امید بستہ | دل کشتی شکستہ دریاے موجزن مین

امیر و داغ کی بھی غزلین اسی طرح مین موجود ہین اور دونون نے ایک ایک شعر خوب کہا ہے

داغ۔ کیا کیا کدورتین ہین اس و انعدا دل کی | آتی ہے خاک لینے آندھی اسی چمن مین
امیر۔ کیا جانیے کہ چھوڑا پھولون نے کیا شگوفہ | بلبل پکارتا ہے صیاد کو چمن مین

قدر بلگرامی کا بھی ایک شعر یاد آ گیا۔ ؎

لب پر ہنسی جو آئی دندان کھلے دہن مین | چمکی مین مین بجلی جا کر گری عدن مین

خیر کجا بود مرکب کجا تاختم۔ کہان حال کا مشاعرہ کہان آتش و اسیر لیکن زمین ایک ہی ہے گو کہ گلکاریان مختلف ہین۔ پس نگاہِ شوق کا ایک تختے کی سیر کرتے ہوے دوسرے تختے کی

جانب بھٹک جانا قابل معافی ہے۔ افسوس ہے کہ میرے پاس اس وقت مشاعرہ مذکور کی تمام غزلین موجود نہین جو کچھ قلیل سرمایہ اشعار کا حافظہ کی امانت مین موجود ہے۔ اُسے قلم کاغذ کے سپرد کرتا ہون۔ آرزومند دل لطف اُٹھائین اور داد دین۔ میر رضا حسین تنہا لکھنؤ کے ایک پُرانے شاعر تھے۔ میر وزیر علی صبا کے داماد تھے اور شاگرد بھی۔ اُن کو فخر تھا کہ آتش کے رنگ مین کہنے والا اُن کے سوا کوئی نہ تھا۔ آدمی کم استعداد تھے مگر قدیم اساتذہ کے فیضانِ صحبت نے زبان کو صاف اور طبیعت کو برق کر دیا تھا۔ اُنھون نے اِس مشاعرے مین جو غزل پڑھی تھی اُس کے چند شعر لکھتا ہون۔ ؎

فصلِ خزان کے آتے کیسی ہوا چلی یہ — شمع مراد بلبل گل ہو گئی چمن مین
پہونچی یہان تلک ہے اب لاغری ہماری — بنتی ہین دو قبائین مجنون کے پیرہن مین
آتش کی یہ زمین ہے جل جائینگی زبانین — آہو نہ چر سکین گے اِس شیر کے بن مین

آغا مظہر صاحب تخلص مظہر ایک آزاد اور رنگین مزاج بزرگ تھے۔ ہر وقت چہرے پر مسکراہٹ رہتی تھی اور زبان ظرافت کے چٹخارے سے کامیاب تھی۔ ان کی استعداد علمی معقول تھی اور مضمون آفرینی کی طرف طبیعت خاص طور سے مائل تھی۔ غالب کے بڑے مداح تھے اور جدت کے عاشق تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ جو شعر کہتا ہون اُسے اپنا کر لیتا ہون۔ اِس زمین مین بھی اچھے اچھے شعر کہے تھے۔ دو تین شعر یاد رہ گئے۔

؎ کیون حُسن بے ادب ہے یون عشق سے چمن مین — منقار بلبلون کی غنچون کے ہے دہن مین
اشکون نے عطر کھینچا گلہائے داغِ دل کا — تسخیر شمس شبنم کرتی ہے اِس چمن مین

ہم بھی چلیں چمن میں تم بھی چلو چمن میں ناز و نیاز دیکھیں بلبل کے اور گل کے

سید غضنفر علی خان صاحب حکیم منشی آسیر کے بڑے صاحبزادے لکھنؤ کے گرانمایہ شاعرون مین تصور کئے جاتے تھے۔ عربی و فارسی کی استعداد کمال تک پہونچی ہوئی تھی اور علم عروض کے زبردست ماہر تھے۔ مضمون آفرینی اور جدت پسندی کا یہ عالم تھا کہ اپنے نامور باپ آسیر مرحوم کی مشکل پسندی کے رنگ کو بھی دو آتشہ کر دیا تھا۔ غزل مین بھرتی کا ایک شعر پڑھنا اُن کے لئے کسر شان تھا۔ اپنے نزدیک وہ ہر ایک شعر مین کوئی نہ کوئی جدت اور اُستادی کا پہلو رکھتے تھے۔ اب یہ کہ اس کوشش مین کامیابی کہان تک ہوتی تھی اس کا انصاف قدر دانون پر تھا۔ عموماً اُن کے اشعار سادگی کے جوہر سے معرا ہوتے تھے اور اکثر مغلق ہوتے تھے لیکن ان کا کلام دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک اُستاد جید کا کلام ہے جو شعر صاف نکل جاتا تھا وہ قیامت کرتا تھا۔ مشاعرون کی طرح پر وہ غزل بہت کم کہتے تھے کیونکہ شاعری کا منصب مقدمہ بازی نے چھین لیا تھا لیکن اِس مشاعرہ کے لئے اُنھون نے بھی غزل کہی تھی اور خوب کہی تھی۔ چند اشعار جو اس وقت یاد ہین ہدیۂ ناظرین ہین۔

پھر غیر غیر ہی ہے گو ہے اُس انجمن مین بیگانگی ہے سبزہ جاتی نہین چمن مین

چھڑ کا نمک اُسی جا موے سفید نے بھی زخم غم جوانی جس جس جگہ تھے تن مین

تنہا گئے لحد کو کب صاحبانِ دولت دزدِ کفن کی نیت لپٹی رہی کفن مین

فصلِ بہار کتنی باتین کرینگی تم سے ہے یاد کی گرہ وہ غنچہ ہے جو چمن مین

بُلبُل نے سر جو کچلا گل نے دکھائی آنکھین کس سرکشی پہ سبزہ دب کر رہا چمن مین

نالون سے بلبلاون کے گل تنگ آکے بولے | یا یہ رہین چمن مین یا ہم رہین چمن مین

نواب یوسف حسین خان صاحب یوسف شرفا لکھنؤ مین سے تھے اور قدیم تہذیب کے جو جوہر اور اوصاف ہونا چاہئیں وہ اُن مین سب موجود تھے۔ اُن کی زیارت کرنے سے روح کو بالیدگی حاصل ہوتی تھی۔ شاعری مین منشی اسیر کے شاگرد تھے اور اپنے اُستاد کو ہمیشہ محبت سے یاد فرمایا کرتے تھے لیکن اُن کی شاعری کے رنگ اور اسیر کے رنگ سخن مین اندھیرے اُجالے کا فرق نظر آتا تھا۔ زبان آب کوثر مین دھوئی ہوئی۔ بندشین نورانی اور پاکیزہ۔ شعر کیا ہوتا تھا گویا نور کا دریا بہتا نظر آتا تھا۔ پڑھنے کا یہ عالم تھا کہ جس مضمون کا شعر پڑھتے تھے اُس کی تصویر محض آواز کے اُتار چڑھاؤ اور آنکھ کی گردش سے کھینچ دیتے تھے۔ معمولی سا شعر بھی اُن کی زبان سے بھلا معلوم ہوتا تھا۔ میرے خیال مین ان کی زبان خاص لکھنؤ کی ٹکسالی زبان تھی اور شاعری کے رنگ مین ڈوبی ہوئی تھی۔ فصاحت اُن کے لئے پیدا ہوئی تھی اور وہ فصاحت کے لئے۔ ؎

اللہ رے صفائے بیان حدیث دوست | دم بند ہے فصاحتِ اہلِ حجاز کا

اُنھون نے جو غزل مشاعرے کے لئے فرمائی تھی اُس کا رنگ تمام غزلون سے جُدا گانہ تھا اور خاص اُن کے مذاق سخن کا نشان دیتی تھی۔ چند اشعار لکھتا ہون۔ ؎

بوتل کے کاگ اُڑ اُڑ کر نکلی ہوئے چمن مین | ٹوپی اُچھل رہی ہے مستون کی انجمن مین

ساغر بھرے دھرے ہین ساقی کی انجمن مین | لہرا رہا ہے کوثر فردوس کے چمن مین

صیاد کا ہو دھڑکا پھولون کی انجمن مین | ہاتھون اُچھل رہا ہے بلبل کا دل چمن مین

کس نے کہا کہ بیٹھو پھولون کی انجمن مین | حسرت بھری نگاہین کس کی ہین چمن مین

سـ؎ پتون سے نخل گلشن دستک جو دے رہے ہین — چوری گیا ہی شاید بلبل کا دل چمن مین

وہ کون سا حسین ہی تم پر نہین جو مرتا — بھرتا ہی حُسن یوسف پانی چہ ذقن مین

مرنے کے بعد ایسے ہم کچھ ہوے متبرک — بوسیدگی نے چوما ہر استخوان کفن مین

ہر رنگ کے گلون نے ڈالا جو عکس یوسف — طاؤس بن گئی ہے بادِ صبا چمن مین

مجھ کو اچھی طرح یاد ہے کہ جب یوسف حسین خان صاحب نے یہ شعر پڑھا کہ ؎

مرنے کے بعد ایسے الخ

تو حکیم صاحب نے بہت تعریف کی۔ وجہ یہ تھی کہ یہ شعر خاص اُن کے رنگ کا تھا مگر باوجود اس کے حضرت یوسف کی زبان کی جلا اس مین بھی موجود ہے۔

پنڈت بشن نراین صاحب دَر کی ابتدائی شاعری کا یہ زمانہ تھا۔ ان کا بھی ایک شعر یاد رہ گیا۔

گل کے جو کان اُڑائے یک یک کے بلبلون نے — بولی کلی چٹاک کر کیا شور ہے چمن مین

ایک پُرانی وضع کے بزرگ موجود تھے اور غالبًا منشی اسیر مرحوم کے شاگرد تھے اُنہون نے ایک رنگ قدیم کا شعر کہا تھا۔ ؎

دریاے خونِ عاشق لہرین جو لے رہا ہے — بیتاب مچھلیان ہین بازوے تیغ زن مین

مگر جو شعر حاصل مشاعرہ ثابت ہوا اور جس کی دھوم دوسرے روز تمام شہر مین ہوگئی وہ شعر حضرت بدر کا تھا۔ حضرت بدر کا نام مجھے اس وقت یاد نہین۔ اتنا ضرور جانتا ہون کہ جناب حکیم کے شاگرد تھے اور لکھنؤ کے پُرانے نوابزادون مین تھے اور دولت کثیر رکھتے تھے۔ شعر بھی تفنن طبع کے طور پہ کہہ لیا کرتے تھے۔ اِس مشاعرہ مین اُنہون نے یہ شعر پڑھ کر قیامت کر دی۔ ؎

سگہ دامن کو چاک کرکے رُسوا ہوئی ہر کیا کیا ——— تھی عصمتِ زلیخا یوسف کے پیرہن میں

اِس شعر کے علاوہ تمام غزل پھیکی ہے۔ اور اِس شعر کا مضمون بھی آتش کے ایک شعر سے لڑتا نظر آتا ہے۔ ؎

سہ نہ پھاڑنا تھا زلیخا کو دامن یوسف ——— یہ اس کا پردۂ عصمت دریدہ ہونا تھا

لیکن حق یہ ہے کہ بدر کا شعر صفائی بندش کے لحاظ سے آتش کے شعر پر فوقیت رکھتا ہے اور یہی اِس کے مقبول ہونے کا باعث ہوا۔

نواب ہادی علی خان یکتا ایک آزاد منش بزرگ ہیں۔ غزل کم کہتے ہیں لیکن تخمیس کے بادشاہ ہیں۔ اور اس رنگ میں ان کا جواب لکھنؤ میں نہیں ہے۔ غالبًا اسی وجہ سے تخلص یکتا رکھا ہے۔ اِس مشاعرے میں آتش کی غزل پر اُنہوں نے مصرع لگائے تھے۔ جو کچھ یاد ہے لکھتا ہوں۔ ؎

"تو من شدی" کا غل ہر ہر سُو ہر ایک بن میں ——— "من تو شدم" رچا ہر فرہاد کوہکن میں

یہ اتفاق باہم کمتر ہے مرد و زن میں ——— شیریں زبان ہوئی ہو فرہاد کے دہن میں

لیلیٰ پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں

سامانِ ظاہری ہے یہ اختلاطِ دُنیا ——— کس پھیر میں پڑا ہے چھوڑ ارتباطِ دُنیا

جب ایک دن فنا ہی پھر کیا بساطِ دُنیا ——— دو روز ہی یہ لطفِ عیش و نشاطِ دُنیا

ہے شبِ عروسی مہمان ہی پیرہن میں

مشاعرے کے بعد حضرت یکتا ایک روز ملے اور حضرت بدر کے شعر پر جو مصرع لگائے تھے وہ سنائے۔ وہ بھی لکھتا ہوں۔

عاشق ہوئی ہو کیا کیا شیدا ہوئی ہو کیا کیا | بیدل ہوئی ہو کیا کیا جوا ہوئی ہو کیا کیا
در پردہ یہ قیامت برپا ہوئی ہو کیا کیا | دامن کو چاک کرکے رُسوا ہوئی ہو کیا کیا

تھی عصمتِ زلیخا یوسف کے پیرہن مین

علاوہ اِن حضرات کے جن کے اشعار مین نے لکھے ہین بہت سے شعرا جمع تھے اور غزلین بھی پڑھی تھین مگر مجھے اسی قدر اشعار یاد رہ گئے۔ اب تک میری نگاہون کے سامنے اِس مشاعرے کی تصویر ہے۔ کم سے کم ڈیڑھ سو حضرات نے غزلین پڑھی تھین جس مین اساتذہ بھی تھے، شاعر بھی تھے، خوشگو بھی تھے اور محض تخلص کے گنہگار بھی تھے۔ اور سامعین کی تعداد دو سو تین سو سے کم نہ تھی۔ جب اچھا شعر پڑھا جاتا تھا تو قدردانون کی تعریف اور واہ واہ کے نعرون سے یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ چھت اُڑ جائے گی۔ ایک طرف مظہر مرحوم کے چٹکلے رونے کو ہنساتے تھے۔ دوسری جانب جناب حکیم مرحوم کی مولویانہ اور ادب آمیز ظرافت اپنے رنگ مین مزہ دے جاتی تھی۔ نواب یوسف حسین خان کی نورانی صورت سے تمام محفل نورانی ہو رہی تھی۔ ہادی علی خان صاحب یکتا کا انداز تعریف قیامت تک نہ بھولیگا۔ افسوس ہے تو یہ ہے کہ اب یہ رنگ دیکھنا نہ نصیب ہوگا۔ پانچ چھ سال کا عرصہ ہوا جناب حکیم نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ حضرت مظہر کے مرنے سے بزم احباب سونی ہوگئی۔ نواب بنّے صاحب مشتاق بھی اس مشاعرے مین موجود تھے مگر غزل طرح پر نہین پڑھی تھی۔ موت نے جوانی ہی کے عالم مین ان کا بھی خاتمہ کر دیا۔ ایک نواب یوسف حسین خان باقی رہے تھے افسوس ہے کہ پارسال طاعون کی ہوا سے وہ چراغ بھی گل ہوگیا۔ جناب جلال کا زخم ابھی تازہ ہے۔

اُٹھ گئی ہین سامنے سے کیسی کیسی صورتین

روئیے کس کس کو اور کس کس کا ماتم کیجئے

اب مشاعرے ہون توکیونکر ہون ۔ خیر خدا عزیز و محشر کو سلامت رکھے کہ اُنھون نے مشاعرون سے علمی مذاق کا سلسلہ قائم کیا ہے ورنہ زمانۂ حال کے نوجوانون کی طبیعتین تمام سنجیدہ مشاغل سے پھری ہوئی ہین اسی مین شعر و سخن کے مذاق کا خون بھی شامل ہے ۔ رسّا کھینچنا ۔ ہاکی یعنی ولایتی گلی ڈنڈا کھیلنا ۔ ٹینس کے دام مین اسیر رہنا اب تہذیب و شائستگی کا معراج خیال کیا جاتا ہے لیکن عقیدتمند دل مشاعرے کے بدلے مشاعرے کی یاد ہی سے طبیعت کو تازہ کر لیتے ہین ورنہ یہ چمن اب کہان ۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

نوٹ :۔ چونکہ تمام اشعار محض حافظے کی مدد سے لکھے گئے ہین اس لئے اگر کسی مصرع یا شعر مین تغیر و تبدل ہو گیا ہو تو اہل تنقید معاف فرمائین ۔ (چکبست)

اَوَدھ پنچ

(ماخوذاز "گلدستۂ پنچ" ۱۹۱۵ء)

ہندوستان کے جس جس گوشہ مین اُردو زبان کا نغمہ سنائی دیتا ہے وہان شاید کوئی ایسا شخص ہو کہ جس کے کان "اودھ پنچ" مرحوم کے ذکرِ خیر سے آشنا نہ ہون۔ "اودھ پنچ" نے تین پینتیس سال تک اپنی عالمگیر شہرت و وقار کے پردے مین اخبارون کی دُنیا مین سلطنت کی ہے اور اس کی پُرانی جلدون کے گورِ غریبان مین اکثر ایسے اہل کمال وفن ہین جن کے قلم کی دھاک دلون مین لرزہ پیدا کرنے کے لیئے کافی تھی۔

جس وقت "اودھ پنچ" نے دُنیا مین جنم لیا اُس وقت اخبار نویسی کا فن ہندوستان مین تخمیناً چالیس سال کے نشیب و فراز دیکھ چکا تھا۔ ۱۸۳۶ء مین پہلے پہل سرکار کی جانب سے ہندوستان کی بے زبان رعایا کو اخبار نکالنے کی نعمت عطا ہوئی اور ۱۸۷۷ء مین "اودھ پنچ" نے زبان اور ظرافت کے چہرے سے نقاب اُٹھائی۔ اِس چالیس[1] سال کے عرصے مین اُردو کے بہت سے اخبار جاری ہو چکے تھے۔ مثلاً لاہور مین "اخبار عام" اور "کوہ نور" کا دور تھا

---

[1] ان اخبارون کے اکثر حالات منشی بالمکند گپتا مرحوم کے اُردو اخبارون کے تذکرہ سے اخذ کیے گئے ہین۔ جو "بھارت متر" اور "زمانہ" مین شایع ہوا تھا۔

یہ اپنے وقت کے نامور اخبار تھے ۔ دہلی مین "اشرف الاخبار" کی آواز سنائی دیتی تھی۔ "وکٹوریہ پیپر" سیالکوٹ سے جاری تھا۔ "کشف الاخبار" بمبئی مین اور "جریدۂ روزگار" مدراس مین اُردو کا نقارہ بجا رہا تھا۔ "کارنامہ" اور "اودھ اخبار" لکھنؤ سے شایع ہوتے تھے۔ عرصہ ہوا کہ "کارنامہ" کا کام تمام ہوگیا۔ "اودھ اخبار" ابھی تک اپنے بڑھاپے کی شرم رکھے ہوے ہے مگر اس کا جو رنگ اب ہے وہی جب تھا۔ اِن کے علاوہ "اودھ پنچ" کی اشاعت کے قبل بہت سے اُردو اخبار اپنی پیدایش اور موت کی منزلین طے کر چکے تھے۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ یہ اخبار محض خبرون کی تجارت کرتے تھے۔ بجز "لارنس گزٹ" کے جو کہ میرٹھ سے شایع ہوتا تھا اور جس کی نظر رعایا کے حقوق پر رہتی تھی۔ عام طور سے ان اخبارون کا نہ کوئی خاص پولیٹکل یا سوشل مسلک تھا نہ یہ کسی دستور العمل کے پابند تھے۔ اُردو اخبار نویسی کی تاریخ مین "اودھ پنچ" اور "ہندوستانی" پہلے دو اخبار ہین جنہون نے اخبار کو محض تجارت کا ذریعہ نہ سمجھا بلکہ مغربی اصولون پر اخبار نویسی کی شان پیدا کی اور اپنا خاص مسلک قائم کیا۔ "ہندوستانی" کا دور "اودھ پنچ" کے چھ سال بعد شروع ہوا اور جس پولیٹکل رشی کے دماغ کا یہ اخبار کرشمہ تھا اس نے اسے بھی اپنی ذات کی طرح پولیٹکل خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اودھ پنچ گو کہ ظرافت کا پرچہ تھا، مگر پولیٹکل اور سوشل معرکہ آرائیون سے بے خبر نہ تھا۔ اِس کا مستقل سوشل اور پولیٹکل مسلک تھا۔ اِس صوبے مین "ہندوستانی" کانگرس کا چراغ سمجھا جاتا تھا مگر جن گوشون مین اس چراغ کی روشنی کا گذر نہ تھا وہان "اودھ پنچ" کی بجلی چکا چوند پیدا کرتی تھی۔ سوشل اصلاح کے معاملہ مین اودھ پنچ لکیر کا فقیر تھا۔ نئی روشنی کے نادان دوستون کی حماقت کا پردہ فاش کرنے کے علاوہ

اِس کی ذات سے اِس تحریک کو کوئی نفع نہین پہونچا۔ ظرافت کے اعتبار سے یہ اپنے رنگ کا پہلا پرچہ تھا۔ اکثر ظریفانہ اخبار مثلاً "انڈین پنچ" "بمبئی پنچ" "بانکی پور پنچ" وغیرہ اس کی تقلید مین نکلے مگر وہ دُنیا کی ٹھوکرین کھا کر ختم ہو گئے۔ زمانہ سے کسی کو شہرت و ناموری کی سند نہین ملی۔ اودھ پنچ کا جادو اُردو زبان پر عرصے تک چلتا رہا اور اس طولانی زمانہ مین جو خدمات اودھ پنچ سے ظہور مین آئین اُن پر نظر ڈالنے سے اُردو نویسی کے دربار مین ہم اس کا صحیح مرتبہ قائم کر سکتے ہین۔ اودھ پنچ ظرافت کا سرچشمہ تھا اور عام طور سے لوگ اس کے فقرون اور لطیفون پر لوٹ رہتے تھے۔ جو پھبتی اِس مین نکل جاتی تھی وہ مہینون زبان پر رہتی تھی اور دور دور مشہور ہو جاتی تھی مگر قومون کے مذاق سلیم نے جو ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اس کو دیکھتے ہوے ہم اودھ پنچ کی ظرافت کو بہ حیثیت مجموعی اعلیٰ درجے کی ظرافت نہین کہہ سکتے۔ لطیف ظرافت اور بذلہ سنجی و تمسخر مین بہت فرق ہے۔ اگر لطیف و پاکیزہ ظرافت کا رنگ دیکھنا ہے تو اُردو زبان کے عاشق کو غالب کے خطون پر نظر ڈالنا چاہیئے۔ اُردو نثر کے ان جواہرات مین جہان اور بہت سی لطافت و رنگینی کے جوہر موجود ہین وہان ظرافت کی جھلک بھی کم دلکش نہین ہے۔ نہ پھبتیان ہین نہ طعن و تشنیع کے جگر خراش فقرے ہین محض روزمرہ کی باتین ہین۔ مگر طبیعت کی شوخی متین الفاظ کے پردے سے جھلکتی ہے اور پڑھنے والے کے چہرے پر مسکراہٹ کا نور پیدا کر دیتی ہے۔ باریک اور لطیف مذاق کی رنگینی اور بے ساختہ پن پر جس قدر غور کرو اتنا ہی زیادہ لطف آتا ہے۔ اودھ پنچ کے ظریفون کی شوخ و طرار طبیعت کا رنگ دوسرا ہے ان کے قلم سے پھبتیان اس طرح نکلتی ہین جیسے کمان سے تیر۔ جو مظلوم ان تیرون کا نشانہ ہوتا

کہ وہ اودھ پنچ کی زندگی کو اپنی زندگی سمجھتے تھے۔ لکھتے ہین۔

"مکرمی۔ تسلیم۔

خط پہونچا۔ بہت بجا ہے۔ اودھ پنچ مردہ ہاتھون سے اس لئے نکلتا ہے کہ کوئی اُٹھانے والا نہین۔ دو ایک سطرون کے سوا نہ ہاتھ سے لکھ سکتا ہون نہ مُنہ سے بول سکتا ہون۔ کچھ تو کر ہمت کر کے نکال دیتے ہین۔ دس سال سے فالج مین گرفتار لبِ گور ہون۔ جب کسی طرف سے اطمینان نہین تو کیا انتظام ہو سکے۔ اخبار صرف اس لئے نکالتا ہون کہ جیتے جی مر نہین سکتا۔ ورنہ اس عارضے کے ہاتھون۔ ع

مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اودھ پنچ زندہ اخبارون مین نہین کہ اس کا ذکر ہو۔ ہان گذشتہ زمانہ مین کچھ تھا۔"

مگر یہ حالت کب تک قائم رہتی۔ آخر کار مرنے سے دو سال پیشتر شکستہ دل اڈیٹر کو اودھ پنچ کا جنازہ اپنے مردہ ہاتھون سے اُٹھانا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ضعیف جسم مین خون کے دس بیس قطرے ضرور باقی تھے مگر گرہ مین ایک پیسہ نہ تھا۔ اودھ پنچ چلتا تو کس طرح چلتا۔ گو کہ باوضع اڈیٹر کی باوجود لب گور ہونے کے یہ تمنا ضرور تھی کہ۔ ؎

گو ہاتھ مین جنبش نہین آنکھون مین تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

خیر، اودھ پنچ کا جاری رہنا تو درکنار۔ یہ وہ نازک زمانہ تھا کہ اگر اودھ کا ایک عالی ظرف رئیس

جس کی فیاضی ضرب المثل ہے دستگیری نہ کرتا اور وہ ایک پُرانے دوستون کی محبت شریک حال نہ ہوتی تو شاید اودھ پنچ کا اڈیٹر نان شبینہ کا محتاج رہ کر دُنیا سے سدھارتا۔

غرضکہ چھتیس سال تک زبان اور قوم کی خدمت کرکے اودھ پنچ نے دُنیا کو خیرباد کہا اِس وقت اُردو زبان مین بہت سے قابل قدر اخبار موجود ہین مگر اودھ پنچ کی جگہ خالی ہے اور زمانے کا رنگ کہہ رہا ہے کہ عرصے تک یہ جگہ خالی رہیگی۔ مگر اُردو زبان کی تاریخ مین یہ زندہ دلی کا افسانہ ایک یادگار افسانہ ہے اور اس کی یاد قدردانون کے دلون سے آسانی سے فراموش نہین ہوسکتی۔ آج اودھ پنچ ہماری نگاہون کے سامنے نہین۔ مگر اس کے تذکرے سے سخن سنجون کی محفل خالی نہین۔

پھر گئے آنکھون مین مشتاقِ گذشتہ نشہ مین
دَورِ جامِ مے مین اکثر ذکر جیبر جسم ہُوا

منشی سیّد محمد سجّاد حسین

(ماخوذ از "گلدستہ پنچ" ۱۹۱۵ء)

ایک خوشحال و عالی خاندان سے تھے۔ آپ کے والد منشی منصور علی صاحب عہدۂ ڈپٹی کلکٹری پر معمور تھے اور بعد پنشن کے ایک عرصے تک حیدرآباد مین سول جج رہے۔ آپ کے ماموں نواب فدا حسین خان صاحب جو لکھنؤ کے ایک معزز وکیل تھے حیدرآباد مین بعہدۂ چیف جسٹس ممتاز تھے اور ریاست مین آپ کا بہت اچھا رسوخ تھا۔ منشی سجّاد حسین کاکوری مین ۱۸۵۶ء مین پیدا ہوے۔ اوائل عمر مین زیر نگرانی نواب فدا حسین صاحب لکھنؤ مین تعلیم پاتے رہے ۱۸۷۳ء مین انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور کچھ دنون تک کیننگ کالج مین ایف اے۔ کی تعلیم بھی پائی لیکن طبیعت انگریزی سے اُچاٹ ہو گئی اور ایف۔ اے۔ کے امتحان مین شریک نہ ہوے۔ کالج چھوڑ کر تلاش معاش مین فیض آباد پہونچے اور وہان فوج مین اُردو پڑھانے پر منشی مقرر ہوے لیکن طبیعت کو اِس شغل سے کیا مناسبت ہو سکتی تھی سال بھر کے اندر ہی اس کو خیرباد کہہ کر اودھ پنچ کے شایع کرنے کا ارادہ کیا۔ منشی محفوظ علی صاحب جو بعد مین ڈپٹی کلکٹر ہوئے اور جن کی عنایت اور توجہ سے ہم کو یہ حالات معلوم ہوے ہین اِس کام مین آپ کے شریک تھے اور

انھین کے مشورے و شرکت سے سنہ ۱۸۷۷ء مین اودھ پنچ کی بنا پڑی۔ منشی صاحب نے پنچ کے لئے پہلے ہی سال مین ایسے ایسے سحرالبیان وجادو قلم نامہ نگار ڈھونڈھ نکالے کہ جو اُردو وعلم ادب کے آسمان پر چاند و سورج ہو کر چمکے۔ ان مین سے پنڈت تربھون ناتھ ہجرؔ، مرزا مچھو بیگ ستم ظریفؔ، نواب سیّد محمد خان صاحب آزادؔ، سیّد اکبر حسین صاحب اکبرؔ، منشی احمد علی صاحب شوقؔ، منشی جوالا پرشاد برقؔ، منشی احمد علی کسمنڈوی کے نام نامی خاص طور سے قابل ذکر ہین۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار بھی اول دو سال تک اپنے قلم جادو رقم سے اودھ پنچ کو سرفراز کرتے رہے لیکن بعد مین آپس مین کچھ اُلجھن پیدا ہو گئی اور وہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ منشی صاحب علی گڑھ کی تحریک و سرسیّد کی پالیسی کے اوّل روز سے مخالف تھے۔ نظام معاشرت مین قدامت پرستی کے قائل اور مغربی تہذیب کے دشمن تھے۔ سنہ ۱۸۸۷ء مین نیشنل کانگرس مین شریک ہوے اور مرتے دم تک اُس کے حامی رہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء مین پہلی مرتبہ فالج گرا لیکن چند ماہ بیمار رہ کر اچھے ہو گئے۔ سنہ ۱۹۰۴ء مین فالج کا دوسرا دورہ ہوا کہ جس نے تندرستی ہمیشہ کے لئے تباہ کر دی۔ اُس وقت سے بولنے کی قوت قریب قریب بالکل جاتی رہی تھی۔ گو گفتگو کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن بات سمجھ مین نہین آتی تھی۔ مگر چل پھر سکتے تھے اور دماغ اپنا کام برابر کرتا تھا۔ متواتر علالت، ضعف و دیگر مکروہات زندگی کی وجہ سے آخری زمانہ نہایت مصیبت و پریشانی کا گذرا۔ بالآخر سنہ ۱۹۱۲ء مین اودھ پنچ بند کرنا پڑا۔ اِس کے بعد حالت روز بروز بُری ہوتی گئی اور ۲۲ جنوری سنہ ۱۹۱۵ء کو اس دارالمحن سے کوچ کیا۔ ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیان تھین مرنے والے مین

منشی محمد سجاد حسین صاحب اُردو اخبار نویسی مین طرز مذاق و ظرافت کے موجد لکھنؤ کی

زبان کے ماہر اور اپنے رنگ کے اُستاد تھے۔ اودھ پنچ کے ذریعے سے جو خدمات اُردو لٹریچر کی آپ نے کین اور جو قابل قدر اضافہ اس زبان مین آپ کی کوششون کی بدولت ہوا اس قابل نہین کہ آسانی سے بھُلادیا جائے۔ آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ نے اپنا دامن شہرت مذہبی تعصب سے خواہ پولیٹکس ہو یا لٹریچر ہمیشہ صاف و پاک رکھا اور آزادی و ایمانداری کو کبھی بھولے سے بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا جو وضع اختیار کی اُس کو مرتے دم تک نبھایا کسی حالت مین اصول سے مُنہ نہ موڑا۔ بلا کی شوخ طبیعت پائی تھی۔ بذلہ سنجی و ظرافت تو گویا مزاج کا خمیر تھی۔ نہایت پریشانی و تنگی کی حالت مین بھی حتی المقدور خندہ پیشانی رہتے اور مذاق سے باز نہ آتے تھے۔ منشی جوالا پرشاد برق مرحوم سے نہایت درجے کی خصوصیت تھی۔ آپ کے قدر دانون مین پنڈت بشن نراین در۔ آنریبل راجہ سر محمد علی محمد خان صاحب بہادر والی ریاست محمود آباد۔ اور بابو گنگا پرشاد ورما مرحوم کے نام نامی خاص طور سے قابل ذکر ہین

مرزا مچھو بیگ ستم ظریف

(ماخوذ از "گلدستۂ پنچ" ۱۹۱۵ء)

مرزا محمد مرتضیٰ نام عاشق تخلص عرف مچھو بیگ پنچ کے نامہ نگاروں مین ستم ظریف کے نام سے مشہور تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ مرزا عطاء اللہ بیگ معروف بہ نواب حسین علیخان بہادر اٹاک سے لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ آپ کے نانا مرزا اسد علی بیگ پادشاہ اودھ کی فوج مین کمیدان تھے۔ مرزا صاحب بچپن سے بائیس سال کی عمر تک نانا کے ہمراہ رہے اور اس وقت تک بجز سپہ گری اور کوئی مشغلہ نہ تھا لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد بطور خود کافی علمی لیاقت پیدا کر کے مشغلہ شعر و سخن کی جانب بھی توجہ شروع کی اور رفتہ رفتہ اس فن شریف مین بھی اس قدر قدرت بہم پہونچائی کہ آپ کی زندگی ہی مین آپ کا نام اردو زبان کے اساتذہ اور محققین کی فہرست مین داخل ہوگیا تھا۔ آپ مرزا نسیم کے شاگردون مین تھے۔

دراز قامت فربہ اندام صحیح و شدید القویٰ جسم و قوت کے اعتبار سے (بقول حضرت حسرت موہانی) شاعرون مین ناسخ ثانی کے نام کے مستحق بنے۔ رنگ البتہ ناسخ کے خلاف گندمی کھلتا ہوا تھا۔ دوپلی ٹوپی انگرکھا گھٹنا لکھنؤ کی معمولی وضع آپ کو بھی مرغوب تھی۔ لیکن آخر عمر مین کبھی کبھی کوٹ پتلون بھی پہن لیتے تھے۔ لطیف و ظریف خوش بیان

خوش گفتار اپنے چھوٹون سے بھی ظرافت کو دریغ نہ کرتے تھے۔ آپ کے ملنے والون مین پُرانی وضع کے لوگون مین اشرف علی صاحب اشرف مرحوم۔ منشی امیراللہ تسلیم وغیرہ اور نئی تہذیب کے لوگون مین منشی جوالا پرشاد برق۔ مسٹر حامد علی خان بیرسٹر اور منشی محمد سجاد حسین صاحب تھے۔ صلح کل و مرنجان مرنج کی یہ کیفیت تھی کہ مرتے دم تک بلکہ مرنے کے بعد بھی لوگون کو آپ کے اصلی مذہب کی کیفیت نہ معلوم ہوئی کہ سُنّی تھے کہ شیعہ۔ آپ کے شاگردون مین منشی بالمکند گپتا مرحوم اڈیٹر اخبار "بھارت متر کلکتہ" خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہین کہ جس سے آپ کی ہر دلعزیزی و بے تعصبی کا ثبوت ملتا ہے۔ حضرت حسرت موہانی کہ جن کے لطف و کرم سے یہ حالات زندگی مرزا صاحب کے ہم تک پہونچے ہین فرماتے ہین۔

"آپ کے نظم و نثر کے تمام کارنامے ہنگامہ ۵۷ء کے بعد کے ہین۔ مرزا نسیم مرحوم بھی اسی زمانے مین دہلی سے لکھنؤ تشریف لائے تھے ان کی صحبت اور شاگردی نے سمندِ ناز پر تازیانے کا کام کیا۔ اور آپ کے ادبی مذاق کی خوبیون نے روز افزون ترقی کے ساتھ پایان کار وہ مرتبہ حاصل کیا کہ آپ نثر نگاری مین یکتائے روزگار اور سخن سنجی مین اُستاد قرار پائے۔ لکھنؤ کے مشہور ظریف اخبار اودھ پنچ مین اس کی ابتدا سے لیکر اپنی آخر عمر تک ۳۳ سال برابر "ستم ظریف" کے فرضی نام سے ایسے دلچسپ مضامین لکھتے رہے جن کا ادبی اور تنقیدی حیثیت سے بے مثل و نظیر ہونا آج تک اہل قلم کے حلقے مین مسلم سمجھا جاتا ہے۔ تذکرۂ شعرا کے مانند جب کبھی اُردو زبان کے نثر نگارون کے حالات بھی مرتب کیے جائین گے اُس وقت حضرت عاشق کا نام یقیناً طبقۂ اول کے انشا پردازون کی فہرست مین ممتاز نظر آئے گا۔ لکھنؤ کی زبان اور محاورون کی جتنی تحقیق مرزائے مرحوم کو تھی اس کا

اندازہ اُن کی مشہور تالیف "بہار ہند" کے دیکھنے سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ملک نے اِس لغت کی کافی قدر نہ کی ورنہ اگر اس کے باقی تین حصّے بھی چھپ جاتے تو اُردو زبان کی اصطلاحوں اور محاوروں کا ایک لاجواب مجموعہ مرتب ہو جاتا۔ مولوی حکیم الدین وکیل اکولا نے علم ادب کے متعلق آودھ پنچ سے آپ کے بعض مضامین کو نقل کر کے "چشمۂ بصیرت" نام ایک کتاب کی صورت میں چھپوا دیا تھا مگر اب وہ کمیاب ہے۔ گلزار نجات میلاد شریف نظم اور مثنوی نیرنگ خیال معروف کے علاوہ آپ کا ایک ضخیم دیوان مشتمل بہ جملہ اصناف سخن آپ کے خلف رشید مرزا محمد صدیق صاحب صادق کے پاس موجود ہے۔"

نواب سیّد محمد آزاد

۔ ماخوذ از "گلدستۂ پنج" ۱۹۱۵ء

مشرقی بنگال کے ایک سربرآوردہ اور دولتمند خاندان سے ہین۔ ۱۸۴۶ء مین ڈھاکہ مین پیدا ہوے اور اوائل عمر مین تعلیم بھی وہین پائی۔ فارسی و اُردو کی تعلیم ایک نامی اُستاد یعنی آغا احمد علی[٥٧] اصفہانی مصنّف "موید برہان" کے زیر نگرانی پائی۔ آپ اُستاد کے نہایت رشید شاگردون مین سے تھے۔ اُس زمانہ مین اوّل تو انگریزی تعلیم کا چرچہ ویسے ہی بہت کم تھا۔ پھر بنگالے کے مسلمانون مین تو صرف شاذ ونادر اصحاب اِس طرف توجہ کرتے تھے۔ چنانچہ آپ اپنے خط مین فرماتے ہین۔

"انگریزی مین مجھے انٹرنس فیل ہونے کی عزّت بھی حاصل نہین ہے۔ ہمارے وقت مین ہمارے شہر کے مسلمانون کو انگریزی خوانی سے مطلق رغبت نہ تھی۔ مین نے تفنّناً چند روز انگریزی پڑھی تھی اور ۲-۳ سال کالج بھی گیا تھا۔ اُس کے بعد پھر اپنے خسر معظم نواب عبداللطیف صاحب بہادر مرحوم کی صحبت بابرکت مین کلکتہ مین رہ کر کتب بینی سے کسی قدر انگریزی حاصل کی اور پھر نوکری اختیار کرنے کے بعد بشرط ضرورت

---

٥٧ غالب مرحوم نے برہان قاطع لغت کی رد مین ایک کتاب موسوم بہ قاطع برہان لکھی تھی۔ اس کے جواب مین آغا احمد علی صاحب نے "موید برہان" لکھی تھی جس کا جواب مرزا صاحب نے تیغ تیز سے دیا تھا اور پھر اس کا جواب الجواب آغا صاحب نے شمشیر تیز تر سے دیا تھا۔ اِس علمی معرکے کا پورا قصّہ مولانا حالی نے یادگار غالب مین بیان کیا ہے۔

اپنی انگریزی کی تکمیل کرتا رہا"

سرکار انگریزی کی ملازمت عہدہ سب رجسٹراری سے شروع کی لیکن رفتہ رفتہ مختلف مدارج طے کرتے ہوئے کلکتہ کے پریسیڈنسی مجسٹریٹ اور آخر میں انسپکٹر جنرل آف رجسٹریشن ہوئے۔ دو دفعہ بنگال کونسل کے ممبر منجانب گورنمنٹ نامزد ہوئے۔ اور "آئی، ایس، او" کا خطاب پایا ۱۹۱۲ء میں اپنے فرائض سرکاری سے سبکدوش ہو کر پنشن لی اور اب کلکتہ میں تشریف فرما ہیں۔

اخبار بینی و مضامین نگاری کا شوق شروع ہی سے تھا۔ سب سے پہلے فارسی اخبار دوربین میں کہ جو "مسلم لٹریری سوسائٹی" کا پرچہ تھا مضمون لکھنے شروع کئے۔ یہ نہایت نومشقی کا زمانہ تھا رفتہ رفتہ اردو میں مضمون نگاری کا شوق ہوا۔ سب سے پہلے اودھ اخبار میں لکھنا شروع کیا اور ۱۸۷۴ء سے یہ سلسلہ برابر قائم رہا۔ اکثر مضامین آپ کے "اکمل اخبار دہلی" "آگرہ اخبار" سفیر لودھیانہ، اخبار الاخبار میں بھی نکلے مگر آپ کی شہرت بھی اودھ پنچ کی شہرت کے ساتھ ہی ہوئی خاص کر آپ کا نوابی دربار کہ جو ۱۸۷۶ء میں بطور ناول کے پنچ میں شائع ہوا تھا نہایت ہی مقبول ہوا۔ علاوہ بریں آپکی ڈکشنری مہذب نامہ و پیام اور سوانح عمری مولانا آزاد ایسے مضامین تھے کہ جنہوں نے کافی شہرت حاصل کی۔ اکثر مضامین آپکے ایک جگہ ترتیب دیکر ایک جلد میں کہ جس کا نام "خیالات آزاد" ہے شائع ہوئے ہیں جن کی قدر بڑے بڑے لوگوں نے کی اور دور دور سے آپکے پاس مبارکباد کے خط آئے۔ انگریزی زبان میں بھی آپنے مضامین نگاری کی اچھی خاصی مشق حاصل کی اور بابو شمبھو چندر ڈے کی صحبت سے اس بارے میں بہت ہی نفع اٹھایا۔ آپ اخبار رئیس و رعیت میں اکثر ایڈیٹوریل مضامین لکھا کرتے تھے کہ جو سرکار اور رعایا دونوں کی نگاہ میں قابل قدر سمجھے گئے۔ غالباً پنچ کے نامہ نگاروں میں یہ فخر صرف آپ ہی کو حاصل ہے کہ تادم آخر آپنے حق دوستی نبھایا اور برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔

منشی جوالا پرشاد برق

(ماخوذ از "گلدستۂ پنچ" ۱۹۱۵ء)

منشی جوالا پرشاد صاحب برق ضلع سیتاپور قصبۂ محمدی مین پیدا ہوے۔ ۲۱ اکتوبر ۱۸۶۲ء تاریخ ولادت ہے۔ اسکول کی ابتدائی تعلیم کا زمانہ محمدی مین گذرا۔ ۱۸۷۸ء مین ضلع کھیری سے انٹرنس کا امتحان درجۂ اوّل مین پاس کیا اور وظیفہ پایا۔ ۱۸۷۹ء سے کیننگ کالج مین تعلیم پاکر ۱۸۸۲ء مین بی' اے' کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۸۳ء مین وکالت کی ڈگری حاصل کی اور فداے قوم منشی کالی پرشاد مرحوم کے دامن عاطفت کے سایے مین کچھ عرصے تک وکالت کا مشغلہ جاری رکھا۔ ۱۸۸۵ء کے آخری حصے مین وکالت کا سلسلہ ترک کر کے منصفی کا عہدہ قبول کر لیا اور اس صیغے مین خاطر خواہ نام آوری اور ترقی حاصل کی۔ اکسٹرا ڈیشنل سشن جج اور سشن جج کے عہدے پر بھی قائم مقامی کی حیثیت سے ممتاز رہے۔ اور ۱۹۰۹ء مین گورنمنٹ کی جانب سے گروین کمیٹی کے ممبر بھی مقرر ہوے۔ مگر جب ۲۶ مارچ ۱۹۱۱ء کو لکھنؤ مین بعارضۂ طاعون انتقال کیا تو اس وقت ان کا مستقل عہدہ جج خفیفہ کا تھا۔ ان کے انتقال پر شیمیر صاحب جوڈیشل کمشنر نے کرسی عدالت سے

فرمایا کہ قابلیت کے اعتبار سے اودھ کے سب ججون مین بابو جوالا پرشاد اپنا ثانی نہین رکھتے تھے

بابو جوالا پرشاد مرحوم خلقی طور سے نہایت ذہین اور طباع شخص تھے اور واقعی اسم باسمی برق تھے۔ اُردو زبان اور شاعری کا شوق زمانۂ طالبعلمی سے تھا۔ پہلا اُردو کا مضمون تیرہ برس کے سن مین "کایستھ سماچار" مین لکھا تھا۔ مرحوم کے بھتیجے بابو کرشن کمار صاحب فرماتے تھے کہ جس زمانے مین فسانۂ آزاد نکلتا تھا بابو جوالا پرشاد لکھنؤ کی زبان حاصل کرنے کی غرض سے اِس کا مطالعہ اس طرح کرتے تھے جس طرح کوئی طالبعلم اسکول کالج کی کتاب پڑھتا ہے۔ لکھنؤ مین آکر منشی جوالا پرشاد سے منشی سجاد حسین پنڈت تربھون ناتھ ہجر منشی احمد علی شوق سے ملاقات ہوئی اور اودھ پنچ مین لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ منشی صاحب موصوف ان معدودے چند لوگون مین تھے جنھون نے ابتدا سے اودھ پنچ کے پودھے کو سینچا۔ ان کی ذہانت اور طباعی ضرب المثل تھی اور زبان دانی اور شاعری کے اعتبار سے لکھنؤ کے سخن سنجون مین ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ علاوہ چھوٹی چھوٹی نظمون کے جو اودھ پنچ مین اکثر شایع ہوئین مثنوی بہار اور معشوقۂ فرنگ جو کہ رومیو جولیٹ کا ترجمہ ہے ان کی شاعری کے بہترین نمونے ہین۔ مثنوی بہار کی دلچسپی اور اختصار کو دیکھ کر سر سید احمد خان مرحوم نے یہ فرمایا تھا کہ

"روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد"

یہ ایسی سند تھی جس پر ہر شخص کو ناز ہو سکتا تھا۔

بابو جوالا پرشاد نے بنکم چندر چٹرجی کے بنگالی ناولون کا ترجمہ اس صفائی سے اور ایسی سلیس عبارت مین کیا ہے کہ اکثر بنگالی حضرات کو یہ کہتے سنا کہ ترجمے مین اصل قصے کی تازگی

موجود ہے۔ بنگالی دُلھن، پرتاب، مارآستین، روہنی۔ اصل مین بنگالی زبان کے قصے ہین۔ جن کی تصویر اُردو زبان مین اُتاری گئی۔ علاوہ ان ترجمون کے منشی صاحب مرحوم نے انگریزی زبان کے خداے سخن شیکسپیر کے نو یا دس ناٹکون کا ہو بہو لفظی ترجمہ نہایت سلیس نثر مین کیا ہے اور اگر زندگی وفا کرتی تو ان کا یہ ارادہ تھا کہ اسی عنوان سے شیکسپیر کے تمام ناٹکون کا ترجمہ کر ڈالتے مگر ۱۹۰۵ء مین اِس کام کی ابتدا ہوئی اور ۱۹۱۱ء مین ان کی زندگی کا افسانہ ختم ہو گیا۔

علاوہ منشی سجاد حسین اور منشی احمد علی شوق کے پنڈت تربھون ناتھ ہجر مرحوم، بابو جوالا پرشاد کے بڑے گہرے دوستون مین تھے۔ اودھ پنچ مین دونون کے مضامین کا کثیر حصہ اُس وقت کا لکھا ہوا ہے جب کہ قیصر گنج مین پنڈت تربھون ناتھ وکالت کرتے تھے اور بابو جوالا پرشاد منصف تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ دونون رنگین مزاج دوستون کے لئے ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات تھی۔

بھارت درپن

(ماخوذ از "کشمیر درپن" مارچ ۱۹۰۶ء)

حضرت کیفی کے نام سے کشمیر درپن کے پڑھنے والے بخوبی واقف ہین۔ حال ہین آپ نے ایک مسدس تحریر فرمایا ہے جس کا نام "بھارت درپن" رکھا ہے۔ اس طولانی مسدس ہین اپنے پیشتر ہندوستان کی قدیم عظمت و شوکت کی داستان بیان فرمائی ہے پھر موجودہ حالت کی ابتری کی طرف ناظرین کی توجہ دلائی ہے اور آخر مین وہ تدبیرین بتلائی ہین جن پر عمل کرنے سے اہل ہند اپنی بداعمالیون سے نجات پاکر پھر ترقی و تہذیب کی شاہراہ پر قدم رکھ سکتے ہین۔ چنانچہ مسدس کا ایک تمہیدی بند انھین مضامین کا اشارہ کرتا ہے۔

دکھاؤن گا پہلے بزرگون کی عظمت | وہ بھارت کا اوج آریون کی وہ شوکت
تمھاری تم کھاؤن گا پستی کی حالت | بتاؤن گا پھر تم کو تدبیر و حکمت
کروگے عمل تم جو ذیہوش ہوگے
نہین تو فنا کے ہم آغوش ہوگے

جو لوگ تاریخ ماضیہ سے واقف ہین وہ جانتے ہین کہ جب تقریباً تمام عالم مین جہل کی

ﮯ۵ یعنی مسدس کیفی مصنفہ پنڈت برج موہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی مقیم جالندھر مطبوعہ مفید عام پریس لاہور۔

تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اُس وقت وادی انڈس مین تہذیب و ترقی کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ جس کی شعاعین چین و عرب وغیرہ تک پہونچین۔ یہ وہ مُبارک زمانہ تھا جبکہ ہندوستان کی سرزمین سے علم و حکمت کے وہ سرچشمے جاری ہوے جن سے اب تک ہزارون پیاسے سیراب ہوتے چلے آتے ہین۔ اُسی زمانے مین سنسکرت کی تکمیل ہوئی جس کی نسبت انگریزی مورخون نے یہ لکھا ہے کہ یہ متبرک زبان یونانی زبان سے زیادہ "مکمّل" لاطینی سے زیادہ وسیع اور دونون سے زیادہ پاکیزہ ہے۔ اسی عہد مین وہ نیک نفس بزرگ پیدا ہوے جنھون نے مسائل حیات و ممات کی گتھیان سلجھانے کے لیئے محض تحریر و تقریر تک اپنی تحقیقات محدود نہ رکھی بلکہ اپنا تمام وقت اسی علمی خدمت کے لئے وقف کر دیا اور دُنیا کے مصنوعی اعزاز و وقار کو خیرباد کہہ کر اپنی زندگی فلسفہ و حکمت کے سانچے مین ڈھال دی۔ اِسی قابل فخر عہد مین ایسے ایسے منطقی، ریاضی دان، شاعر اور علم ہیئت کے ماہر پیدا ہوے جن کی توصیف مین علمائے یورپ تک تر زبان ہین۔ قصّہ مختصر یہ وہ پاک اور متبرک زمانہ تھا جس پر اب تک ہم محبّت و اعزاز کی نگاہون سے دیکھتے ہین اور جس کی یاد ہماری آنکھون مین اشک محبت بھر لاتی ہے کیفی صاحب نے تفصیل کے ساتھ انھین واقعات کا ذکر کیا ہے۔ چند بند تمثیلاً درج ذیل ہین۔

زمانے مین جب جہل چھایا تھا یکسر
تمدّن تھا جب فہم عالم سے باہر
بنا تھا نہ جب غرب تہذیب کا گھر
ادّویا کا تھا جب زمانے مین چکّر

یہان علم کی گرم بازاریان تھین
پھلی پھولی تہذیب کی کیاریان تھین

زبان سنسکرت ایسی اعلیٰ نکالی　　زبانوں سے ہو جو جہان کے نرالی
اسی روکھ کی کل زبانیں ہیں ڈالی　　ہے لٹریچر اس کی بلیغ اور عالی
زبان اہل یونان ڈیلٹیٹس کی
بتاتی ہے تاریخ بچہ ہے اس کی

وہ حکمت چکت جس سے مغرب ہے سارا　　نئے جس کے چیلے بنے ہیں نصارا
زمانے کا ہے ذہن جس نے سنوارا　　وہ اس اگن کی جوت کا ہے شرارا
ہے کیلاس پر جس کا ملجا و مسکن
ہمالہ کے غاروں میں ہو جس کا مخزن

اُپنشد کا انمول ہے وہ خزانا　　زمانے نے اب جس کی قیمت کو جانا
انھیں مانتے ہیں حکیم اور دانا　　فدا اُن پہ ہے آج سارا زمانا
نہیں یاد کیا فلسفہ وہ کپل کا
ہے دم بند جس سے سپنسر کامل کا

یہ تدلیل کی راہ کس نے نکالی　　یہ منطق کی بنیاد ہو کس نے ڈالی
یہ انسان کی عقل کس نے اُجالی　　ہوئی کس سے حکمت جلا پانے والی
ریاضی کے یہ علم یہ ہند سے کے
زمانے نے ہیں ہند ہی سے تو سیکھے

دمِ جنگ تھی تیغ کی وہ روانی　　جگر جس سے شیروں کے تھے پانی پانی

وہ برقِ فنا تھی سپے زندگانی — امان جس سے دشوار تھی بچ کے پانی

شجاعت کا جوہر جو پہچانتے تھے

وہ لوہا اسی تیغ کا مانتے تھے

قدیم ہندوستان کے اعزاز کا افسانہ سنانے کے بعد کیفی صاحب نے اُن بدعنوانیوں کا پوست کندہ حال بیان کیا ہے جو موجودہ ہندوؤن کے لئے باعث ننگ ہین مثلاً برہمنون کی خودپسندی اور لاعلمی پرستشگاہون کی قابل افسوس حالت، عورتون کی کم وقعتی، ضعیف الاعتقادی، نئی روشنی سے نفرت، بیواؤن کی دردناک کیفیت وغیرہ پر نہایت آزادی کے ساتھ اظہار نفرین کیا ہے۔ اور مصنوعی مذہب کا پردہ فاش کرنے مین کوئی دقیقہ نہین اُٹھا رکھا ہے اور واقعی کیفی صاحب کا یہ کہنا بہت بجا ہے کہ۔ ؎

کسی نے بھی دیکھی ہے ایسی تباہی — تنزل سا ہے یہ تنزل الٰہی

نہ یون کوئی صابر لٹا کر ہو شاہی — نہ ایسی کسی کی بھی ہو روسیاہی

نہین گنگا جمنا کا بہتا یہ سوتا

ہمالہ ہے بھارت کی بپتا پہ روتا

چڑھی وہ تنزل کی سر کو خماری — اُلٹ ہی گئی بزم کی بزم ساری

عوض قہقہون کے ہے اب آہ و زاری — نہ ساقی ہے باقی نہ سنگت ہماری

جو ہے کوئی باقی تو شمع سحر ہے

کہ جو بزم کی یاد مین چشم تر ہے

کبھی یون نہ اجڑا تھا مسکن کسی کا — نہ یون جل گیا ہوگا خرمن کسی کا
زمانہ نہ ایسا تھا دشمن کسی کا — لٹا یون خزان سے نہ گلشن کسی کا

رہی ایک بلبل بھی جس مین نہ باقی
بتھا جو اس اُجڑے چمن کی سناتی

مگر اس افسوسناک حالت کو دیکھ کر کیفی صاحب آئندہ ترقی کے متعلق مایوس نہین ہین اکثر حضرات کا یہ عقیدہ ہے کہ موجودہ پستی کی حالت سے اُبھرنا ہندوستان کے لئے ایک امر محال ہے اور تمام ترقی و اصلاح کی کوششین فضول اور بیکار ہین۔ کیفی صاحب اس کے برعکس اُمید ترقی دلا کر آئندہ بہبودی کی بشارت سناتے ہین۔ آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر تعلیم نسوان، تجارت و حرفت اور باہمی اتفاق کو ترقی ہو تو قوم کا ادبار دور ہو سکتا ہے۔ آپ فرماتے ہین۔

نہین گرچہ اب وہ حرارت دلون مین — مگر خون تو ہے وہ ہی اپنی رگون مین
نہین جوش وہ گرچہ اپنے سرون مین — مگر آب و گل ہے وہی ہڈیون مین

لٹے بھی تو ہاتھی لٹے گا کہان تک
سمندر گھٹے تو گھٹے گا کہان تک

جو دل جام غیرت سے سرشار ہوگا — تو یہ بخت خفتہ بھی بیدار ہوگا
خزان کا جدا گل سے ہر خار ہوگا — ترقی کا پھر گرم بازار ہوگا

اگر مانتے ہو تم آواگون کو
تو نکلے گی کیسے خزان اس چمن کو

بنو سلطنت کی تم اعلےٰ رعایا   تجارت مین صنعت مین اونچا ہو پایا
ہو اقبال و دولت کا بھارت پہ سایا   ثنا خوان تمھارا ہو اپنا پرایا

یہی سنگرام اب ہے اور یہ ہو ساکھا
یہی جوہر اب تم کو ہے کر دکھانا

جب اس طرح کی قوم تم بن چکو گے   مسلح ان آلات سے جبکہ ہو گے
تو اغیار کے دل مین بھی گھر کرو گے   شہنشاہ کے لاڈلے تم بنو گے

نہ بھولو اسے قول یہ مستند ہے
خدا اہل ہمّت کی کرتا مدد ہے

مسدس کے آخر مین چند مختصر نوٹ درج ہین جن مین مستند مصنفین کی سندین ان بیانات کی تائید مین پیش کی گئی ہین جو کہ جابجا نظم کئے گئے ہین۔ ان سندون اور شہادتون کے دیکھنے سے حضرت کیفی کی تاریخی تحقیقات کا پتہ چلتا ہے اور نیز یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس مسدس کی تصنیف مین آپ نے کس قدر جانفشانی سے کام لیا ہے یعنی بجائے شاعرانہ مبالغے کے تقریبًا تمام نظم شدہ واقعات تاریخ پر مبنی ہین۔ حضرت کیفی نے اس پند و نصائح کے منظوم اور عبرت خیز دفتر مین جو تنزل کے اسباب بتلائے ہین اور اُن کی اصلاح کی جو تدبیرین پیش کی ہین ان سے بحیثیت مجموعی کسی بھی خواہ قوم کو اختلاف نہین ہو سکتا۔ ورنہ یون تو ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است ۔

ہمدردانِ قوم اِس مسدس کو ملاحظہ فرمائین اور مصنف کی قومی ہمدردی اور تاریخی تحقیقات کی داد دین ۔

اُردو شاعری

(مذاقِ سخن کی اصلاح)

(ماخوذ از "صبح اُمید" نومبر ۱۹۱۸ء)

کسی اُستاد کا شعر ہے۔ ؎

اسیر اے دوست تیرے عاشق و معشوق دونوں ہیں
گرفتار آہنی زنجیر کا یہ وہ طلائی کا (آتش مرحوم ہیں)

ہمارے عزیزان وطن نے جب غیر قوم کی اطاعت قبول کی تو اُنھیں بھی دو قسم کی زنجیریں پہننا پڑیں ۔ فرمانروا قوم کے قانون کے پردے میں جو پابندیاں اُنھیں برداشت کرنا پڑیں اُنھیں لوہے کی زنجیر سمجھنا چاہیے ۔ زبان و قلم کی کامل آزادی سے محروم رہنا انتظام حکومت میں شریک نہ ہونا قومی آرام و آسایش کے کافی ذریعوں کی فکر میں گرفتار رہنا ان قانونی پابندیوں کا نتیجہ تھا یہ ایسی گرفتاری تھی جو ہمارے اہل وطن ہمیشہ کم و بیش محسوس کرتے رہے اور اپنی قومی آزادی کے لئے دعا و فریاد کے نعرے بلند کیا کئے ۔ پولیٹیکل بحث و تحریک کے کارنامے ان لوہے کی زنجیروں سے آزاد ہونے کی کوشش کے افسانے ہیں ۔ مگر ان ظاہری پابندیوں سے بہت زیادہ قابل عبرت خیالات کی غلامی تھی جس نے غیر قوم کی حکومت کا سکہ ہمارے دل و دماغ پر جاری کر دیا۔ ہمارے

جذبات و خیالات مغربی تہذیب کے مصنوعی اور نمایشی رنگ مین گرفتار ہو گئے اور ہم اپنے قومی حفظ مراتب سے بیخبر ہو گئے۔ مین اس خیالات کی غلامی کے سلسلے کو سونے کی زنجیر کہونگا جسے ہم نے خوشی سے پہن لیا اور اپنی گرفتاری پر ناز کرنے لگے۔

اِس دماغی اور روحانی غلامی نے طبیعتون کا رنگ کچھ ایسا پلٹ دیا کہ ہم حکمران قوم کے انداز معاشرت کی تقلید کو تہذیب و تربیت کا جوہر سمجھنے لگے۔ قومی وقار کا سَودا ہمارے سَرون سے رخصت ہو گیا۔ اکثر صورتون مین ہمین اپنے اخلاق و مذہب سے بھی شرم آنے لگی۔ اس قومی بیخبری کے عالم مین ہمین اپنے قدیم اَدَب یا لٹریچر سے بھی حجاب آنے لگا۔ انگریزی زبان مین کمال پیدا کرنا تعلیم و تربیت کا معیار ہو گیا۔ اُردو یا ہندی کی زباندانی کی یاد تک دل سے فراموش ہونے لگی۔ ایسے اہل قلم و اہل زبان پیدا ہو گئے جو انگریزی مین فصاحت کے دریا بہا سکتے تھے مگر اپنی مادری زبان کو جنت نصیب بزرگون کی ناواقفیت و کم نصیبی کا ورثہ سمجھتے تھے جیسا کہ لازمی تھا۔ اُردو زبان اور اُردو شاعری کا سفینہ بھی ڈگمگانے لگا۔ یہ صدائین عام ہو گئین کہ قدیم رنگ کی اُردو شاعری مین سوائے گل و بلبل اور کنگھی چوٹی کے مضامین کے کیا رکھا ہے۔ اکثر انگریزی مصنفین نے اُردو زبان یا شاعری کے بارے مین جو خامہ فرسائی کی ہے اس کا لفظ لفظ ہمارے ناواقف نوجوانون کے لئے قرآن و حدیث ہو گیا اور اُنھون نے اپنے مغربی اُستادون کے خیالات کی غلامی بلا تکلف قبول کر لی۔ جس طرح زندگی کے اکثر صیغون مین مغربی تہذیب کا نمایشی پہلو ہماری نظرون مین سما گیا تھا اور اصلی جوہرون سے نگاہین آشنا نہ تھین۔ اسی طرح انگریزی نظم کے ظاہری رنگ و روپ کو ہم حسن سخن کا معیار سمجھنے لگے اور چونکہ اُردو شاعری

اِس معیار کے کانٹے مین تُل نہ سکی لہٰذا وہ قابلِ نفرین قرار دی گئی۔

اُردو شاعری کے فروغ کا آغاز اسلامی تہذیب کے آخری دور مین ہوا جب کہ عیش پرستی وکاہلی نے ہمارے ہموطنون کے خیالات وجذبات کی روحانی آگ کو قریب ٹھنڈا کر دیا قومی زندگی کی نبض سُست ہو چکی تھی۔ جو کچھ بلند خیالی وضعداری اور عالی حوصلگی کے جوہر باقی رہ گئے تھے اُن کی ہستی بجھتے ہوے چراغون کی روشنی سے زیادہ نہ تھی۔ تاہم اِس بدنصیبی کے دور مین اُردو زبان کی خوش قسمتی سے چند ایسے باکمال پیدا ہو گئے جو شاعری اور زباندانی کے جوہر اپنے ساتھ لائے تھے اور جن کے دلون مین اس قومی زوال کے زمانے مین بھی اپنے بزرگون کی قدیم حمیت وتہذیب کا اثر باقی تھا۔ میر وسودا آتش وغالب وانیس نے اپنی شاعری سے جو چراغ روشن کئے اُنھین زمانے کی ہوا ابھی پورے طور سے گل نہین کر سکی ہے۔ مگر باوجود ان قدرتی جوہرون کے زمانے کا رنگ ان کے کمال کا دشمن تھا جس دُنیا مین وہ رہتے تھے اس کے عام پسند خیالات وجذبات کے حلقون مین اُن کے دل ودماغ جکڑے ہوے تھے۔ اکثر وہ ان پابندیون سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہے تھے مگر اپنی قومی تہذیب وتربیت کے محدود دائرے سے مجبور ہو جاتے تھے۔ شاید یہی خیال غالب کے دل کو ستا رہا تھا جب اُس نے یہ شعر کہا۔

بقدرِ شوق نہین اپنے تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیان کے لئے

یا میر انیس نے انھین پابندیون سے عاجز آ کر مرثیے کا وسیع میدان تلاش کیا لیکن باوجود اُن اُمنگون کے ہمارے قدیم شاعرون کے مذاقِ سخن کے آئینے پر بہت کچھ مصنوعی شاعری کا گرد وغبار جم گیا او

اُن کا دامن اکثر غیر پاکیزہ خیالات وجذبات کے کانٹون سے اُلجھ کر رہ گیا اگر زمانہ کروٹ لیتا اور قومی زندگی مین شاعرانہ مذاق کی ترقی کا پہلو قائم رہتا تو بعد کی نسل قدیم شعرا کے جوہرون کو اپنی نگاہون کے سامنے رکھتی اور جو عیب اُن کے کلام مین موجود تھے اُن سے زبان وشاعری کو پاک کر دیتی۔ مگر دُنیا دوسرے رنگ پر جارہی تھی۔ نئی تہذیب کی اشاعت نے طبیعتون کا رنگ کچھ اس طرح بدل دیا تھا کہ صحیح مذاق سخن کا قائم ہونا دشوار تھا۔

انگریزی تعلیم نے ملک مین رفتہ رفتہ جو بیداری پیدا کی ہے اُسے بھول جانا قومی احسان فراموشی ہے۔ مگر اس تعلیم کا ایک صریحی اثر ہمارے قومی اخلاق پر بہت خراب پڑا۔ وہ یہ تھا کہ تعلیم محض ذریعہ معاش ہوگئی۔ علم وادب کی تحصیل سے جو روحانی سرور کا سرمایہ دلون کو حاصل ہوتا ہے وہ بالکل نظر انداز ہوگیا۔ اس زمانے مین کثرت سے ایسے تعلیم یافتہ بزرگ ملین گے جنھین اُردو فارسی ہندی یا انگریزی کے مذاق سخن سے ذرا بھی حس نہین ہے۔ اُن کی زندگی شاعرانہ لطافت کے اثر سے بالکل خالی ہے۔ تعلیم نے اُن کی آنکھین صرف اِس قدر روشن کر دی ہین کہ وہ کھوٹے کھرے روپیہ کو پرکھ سکین۔ قومی مفلسی نے تعلیم کے اِس تجارتی شوق پر اور تازیانے کا کام کیا ہے۔ وہ لطیف جذبات وخیالات جن کا تازہ کرنا تعلیم کا اصل منشا ہے اور جن کی نشوونما سے انسان دنیا کے گرد وغبار سے ہٹ کر روحانی لطافتون کا حظ اُٹھا سکتا ہے روز بروز سرد ہوجاتے ہین۔ اِس تجارتی تعلیم کے طوفان مین جب کہ شاعرانہ جذبات کی ترتیب کی اصلاح کا راستہ ہی بند ہو رہا ہے مذاق سخن کی صحت کی اُمید رکھنا فضول ہے۔

ان تمام اسباب کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا مذاق سخن صحیح ودرست نہین ہے۔ ہمارے تعلیم یافتہ

حضرات عموماً اُردو فارسی ہندی یا سنسکرت کی شاعری سے ناآشنا ہین۔ اُنھون نے اپنا مذاق سخن انگریزی نظم کے مطالعے سے قائم کیا ہے لیکن اُن کے معیار سخن کا دارومدار بہت کچھ انگریزی شاعری کی غلط تعبیر پر ہے۔ انگریزی نظم کے جس پہلو کا اثر اُن کے دماغ پر ہوتا ہے اس کا تعلق محض خیالات سے ہے اُن کے دل انگریزی نظم کے اِس لطیف پہلو سے پورے طور پر آشنا نہین ہین جس کی بنیاد جذبات کے لطافت و نزاکت پر ہے اور جو اصلی جزو شاعری ہے انگریزی نظم اُن کے دماغ کو ضرور روشن کر دیتی ہے مگر اُن کے دلون مین جذبات کی آگ نہین بھڑکاتی۔ چنانچہ نئی تعلیم کے معصوم بندے یہ خیال کرنے لگے ہین کہ شاعری کی وقعت کا دارومدار محض خیالات کی بلندی و پاکیزگی پر ہے۔ انگریزی نظمون مین آزادی و حب الوطنی کے خیالات دیکھتے ہین اور خوش ہوتے ہین۔ اُردو شاعری مین انھین اِس قسم کے خیالات کا پتہ نہین ملتا لہذا اس کے مطالعے کا بار اُن کی نگاہین نہین اُٹھا سکتین۔

نفس شاعری کے جوہر لطیف کا زبان یا قلم کی مدد سے خاکہ کھینچنا دشوار ہے۔ یہ ویسا ہے کہ سُریلی آواز کے سُننے سے یا دریا کی لہرون پر چاند کی روشنی دیکھنے سے انسان کے دل پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کے بیان کرنے کی کوشش کی جائے حقیقت یہ ہے کہ شاعری و زبان کے جادو کی تشریح و تعریف زبان و قلم کے اختیار سے باہر ہے۔ بقول شاعر ؎

بیان درد محبت جو ہو تو کیونکر ہو
زبان دل کے لیئے ہو نہ دل زبان کے لیئے

مگر بادی النظر مین شاعری کے دو پہلو ہین۔ ایک کا تعلق خیالات سے ہے۔ دوسرے کا زبان سے

ہے۔ جس کو خیالات کا پیرہن یا لباس سمجھنا چاہیے۔ خیالات کا اظہار پاکیزہ اور سلیس نثر مین بھی لطافت کے ساتھ ہو سکتا ہے مگر شاعر کے خیالات دلی جذبات کے رنگ مین ڈوبے ہوے نکلتے ہین اور زبان مین خاص تاثیر پیدا کر دیتے ہین۔ شاعرانہ خیالات کے پھولون کی نشو و نما محض دماغ کی پھلواری تک محدود نہین رہتی ہے۔ شاعر کے دلی جذبات کی برقی حرارت اِن پھولون کا عطر کھینچ لیتی ہے۔ اسی کا نام شاعرانہ تاثیر و لطافت ہے۔ اس شاعرانہ لطافت و تاثیر کے عام کرنے کا ذریعہ شاعرانہ زبان ہے۔ شاعر بھی وہی الفاظ استعمال کرتا ہے جو اُس کے ہموطنون کی زبان پر ہوتے ہین مگر انھین الفاظ کی اُلٹ پھیر سے وہ اپنے بیان مین عالم تصویر پیدا کر دیتا ہے اور محض عالم تصویر ہی نہین پیدا کر دیتا ہے بلکہ اس کے الفاظ مین ایک اگ کی تاثیر نمایان ہو جاتی ہے جو فن موسیقی کی راگ راگنی سے الگ ہے۔ اگر انگریزی شاعری کو اس نظر سے دیکھا جائے تو یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات مغربی نظم کے پڑھنے سے دماغی حظ ضرور حاصل کر لیتے ہین لیکن نہ انداز کلام کی شاعرانہ لطافت اُن کے دلون مین برقی حرارت پیدا کرتی ہے نہ زبان کی مصوری کا انھین حس ہوتا ہے نہ الفاظ کا راگ اُن کے کانون کی فضا مین سماتا ہے۔ اُن کا دماغ یہ خوب پہچان لیتا ہے کہ کس قسم کے خیالات نظم کیے گئے ہین مگر ان کا دل جسے جذبات کا ذخیرہ خیال کرنا چاہیے یہ محسوس نہین کرتا کہ ان خیالات کے ادا کرنے کا شاعرانہ انداز کیا ہے۔ ان کے یہ کان یہ اندازہ نہین کر سکتے کہ شاعر نے معمولی الفاظ مین کیا جادو بھر دیا ہے۔

ایسا ہونا ایک حد تک لازمی ہے جس زبان مین انگریزی شاعری ہے اس زبان کے الفاظ سے ہمارے کان قدرتی طور سے غیر مانوس ہین۔ ان کا قدرتی نغمہ ہمارے لیے خلق نہین ہوا تھا جس

تہذیب کے عالم مین مغربی شاعرون کے رنج وراحت کے جذبات نے نشو ونما پائی۔ ہماری سوسائٹی کی دُنیا اُس سے دُور اور الگ ہے۔ مغربی دُنیا کے قدیم مذہبی اور قومی کارنامے جو وہان کے سورماؤن اور پیمبران دین کی ذات کے ساتھ وابستہ ہین اور جن کی بدولت وہان کے اکثر دریا یا پہاڑ یا اکثر قدرتی منظر قومی شاعری کے سرمایۂ ناز ہوگئے ہین۔ ہمارے دلون مین تاثیر کی گرمی نہین پیدا کرسکتے۔ ایسی حالت مین مغربی نظم کے اصلی شاعرانہ پہلو کا اندازہ کرنا جس کا تعلق خاص جذبات سے ہے اگر ناممکن نہین تو دشوار ضرور ہے۔

ممکن ہے چند ایسے ارباب وطن ہون جنھون نے انگلستان کی بود وباش کی وجہ سے اور قدرتی ذہانت کے صدقے مین مغربی سوسائٹی کے قومی و مذہبی خیالات و جذبات کا رنگ پورے طور سے پہچان لیا ہوا اور جنھون نے انگریزی زبان پر ایسا عبور حاصل کرلیا ہو کہ انھین اس ساز کے تمام پردون سے واقفیت حاصل ہوگئی ہو ایسے حضرات انگریزی نظم کی شاعرانہ لطافت سے ضرور حظ اُٹھا سکتے ہین مگر عام طور سے شیکسپیر و ملٹن کی جو ثنا و صفت انگریزی دان نوجوانون کی زبان سے سُننے مین آتی ہے وہ بہت کچھ فرہنگون کی بدولت ہوا کرتی ہے۔ میر تقی میر جب دہلی سے لکھنؤ آئے تو یہان کے چند بزرگ اُن سے ملنے گئے اور کلام سنانے کی فرمائش کی۔ میر صاحب نے کہا کہ آپ حضرات میرا کلام سمجھ نہین سکتے۔ بیچارے اپنا طیش ضبط نہ کرسکے اور کہہ اُٹھے کہ جناب ہم فردوسی و نظامی کا کلام سمجھ سکتے ہین مگر آپ کا کلام ایسا ہے کہ اس کی قدر دانی ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ میر صاحب نے جواب دیا کہ فردوسی و نظامی کے کلام کی فرہنگین چھپ گئی ہین مگر میرے کلام کی ابھی کوئی فرہنگ نہین چھپی ہے اس لئے آپ اُس کی خوبی کا اندازہ نہین کرسکتے۔ عام طور سے

انگریزی نظم کے قدر دانوں کی حالت اس سے زیادہ اچھی نہیں ہے۔ وہ فرہنگ کے مطالعے سے شیکسپیر کے کلام پر وجد کرنا سیکھ لیں مگر وہ اُس قدر دانی کے جذبے کا اندازہ نہیں کر سکتے جس نے کارلائل کو یہ لکھنے پر مجبور کیا کہ اگر اُس سے پوچھا جائے کہ اُسے ہندوستان کی سلطنت زیادہ عزیز ہے کہ شیکسپیر تو اُس کا جواب یہ ہوگا کہ چاہے ہندوستان کی سلطنت نکل جائے مگر انگریزی قوم شیکسپیر کا دامن نہیں چھوڑ سکتی۔

یہ خامی ہمارے لئے باعث شرم نہیں ہے۔ کوئی انگریز کتنا ہی ہندی زبان سے واقف کیوں نہ ہو مگر تلسی داس کی شاعری کا اثر و نغمہ اس کے دل میں وہ کیفیت نہیں پیدا کر سکتا جس کا لطف اَن پڑھ ہندو رامائن کے طفیل میں روزمرہ اُٹھاتے ہیں۔ غیر ملک کا باشندہ تلسی داس کے خیالات کی بلندی و پاکیزگی کی داد دے سکتا ہے مگر زبان و شاعری کے جوہروں کو نہیں پرکھ سکتا نہ ان جذبات کی تاثیر قبول کر سکتا ہے جو ہندوؤں کی قومی تہذیب کے ٹکسالی سکے ہیں۔ اس قدر خامی کے علاوہ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جس حالت میں ہم اپنی مادری زبان کی شاعری سے حظ نہیں اُٹھا سکتے ہمارے لئے کسی غیر زبان کے مذاق سخن کی قدر شناسی سخت دشوار ہے۔ شاعری سے حظ اُٹھانے کے لئے دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو انسان کے دل میں قدرتی طور سے شاعرانہ مذاق کا جوہر موجود ہو یا اُس کے جذبات کی ترتیب و اصلاح سے اس کی طبیعت میں سخن فہمی کا سلیقہ پیدا ہو گیا ہو۔ شاعرانہ نزاکت و لطافت کا حظ حاصل کرنے کے لئے محض دماغی تربیت کافی نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ انسان کا دماغ فلسفہ و منطق کے نور سے آئینہ ہو مگر شاعرانہ مذاق کے جوہر سے خالی ہو۔ خیالات و زبان کی شاعرانہ لطافت کا اثر قبول کرنے کے لئے انسان کی ہستی

کہ اس جزو لطیف کے نشو و نما کی ضرورت ہے جس کا تعلق خدمات سے ہے جس طرح فلسفہ و ریاضی کی باریکیون کے سمجھنے کے لئے خاص قسم کی دماغی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح طبیعت مین شاعرانہ مذاق سے دلچسپی پیدا کرنے کے لئے فطرتی جذبات کی اصلاح و تربیت لازمی ہے۔ اپنی زبان کی شاعری کے مطالعہ سے اس قسم کی اصلاح و تربیت کا سرانجام آسانی سے ہوسکتا ہے۔ مادری زبان کے الفاظ کا نغمہ کانون مین بلا تکلف گھر کر لیتا ہے اور قومی شاعرون کے کلام مین جو رنج و راحت کے جذبات کے نشتر موجود ہین وہ دل مین چُبھ جاتے ہین اور دبی ہوئی اُمنگون کو بیدار کر دیتے ہین اسی کا شاعرانہ تربیت ہے۔ اگر کوئی شخص چاہے کہ بغیر اس تربیت کے محض غیر زبان کی فرہنگون مین نفس شاعری کے متعلق مضامین پڑھ کر صحیح مذاق سخن قائم کرلے تو یہ اس کی خوش قسمتی ہے۔

افسوس ہے تو اس قدر کہ یہ خوش قسمتی ہمارے حصے مین نہین آئی۔ ہمارے تعلیم یافتہ عزیزان وطن نے اپنی زبان و شاعری سے بےخبر رہ کر انگریزی شاعری کا جو غیر صحیح اندازہ کیا اس کا نتیجہ یہ یہ ہوا کہ ہمارا مذاق سخن بگڑ گیا۔ ہمین اپنی قدیم شاعری کے قابل قدر ذخیرے سے شرم آنے لگی اور نئی شاعری کے لقب سے جس طرز کلام کی بنیاد پڑی اُس کی وقعت نثر نظم نما سے زیادہ نہ تھی۔ یہ خیال عالمگیر ہوگیا کہ محض بلند و پاکیزہ خیالات کا بُرے بھلے الفاظ مین نظم کر لینا معراج شاعری ہے جذبات کی لطافت کا خیال نظرانداز ہوگیا۔ زبان کے نغمے سے کان ناآشنا ہوگئے۔ محض ننگے وچے خیالات کی تصویرین کاغذ کے صفحون پر نظر آنے لگین۔

اُردو زبان پر مولانا حالی کا جو احسان ہے اُس کی یاد دلون مین ہمیشہ تازہ رہیگی۔ مولانا مرحوم غالباً پہلے شخص تھے جنھون نے یہ آواز بلند کی کہ زمانے کے ساتھ اُردو شاعری کو بھی نیا

لباس بدلنا چاہیے اور یہ معمولی بات نہ تھی۔ مگر اپنے انگریزی دان احباب کی مدد سے انگریزی شاعری کا جو معیار مولانا موصوف نے قائم کیا اور جس کے سانچے میں اُردو شاعری کو ڈھالنا چاہا وہ اِس عیب سے خالی نہ تھا جس کا ابھی ذکر ہو چکا ہے۔ اِس عیب کا اثر مولانا کے نئے رنگ کے کلام میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ مولانا کی ایک رباعی اس وقت تمثیلاً یاد آگئی ہے

دھونے کی ہے اے رفارمر جا باقی	کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبّا باقی
دھو شوق سے کپڑے کو پہ اتنا نہ رگڑ	دھبّا رہے کپڑے پہ، نہ کپڑا باقی

جو خیال ان دو شعروں میں نظم کیا گیا ہے وہ نہایت اعلیٰ درجے کا اصول اصلاح ظاہر کرتا ہے مگر اظہار خیال کا طریقہ شاعرانہ نہیں ہے۔ اگر پاکیزہ و سلیس نثر میں یہ خیال ادا کیا جائے تو اس نظم سے زیادہ دلکش ثابت ہوگا۔ ہمیں افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ مولانا حالی نے اُردو شاعری کی اصلاح میں اپنے اصول اصلاح کو مدنظر نہیں رکھا۔ اُردو شاعری کے دامن پر جو داغ اور دھبے تھے انھیں اس طرح صاف کرنے کی کوشش کی کہ نہ داغ دھبے باقی رہے نہ دامن کا ایک تار باقی رہا۔

قدیم اُردو شعرا کے کلام میں بہتیرے ایسے خیالات ملیں گے جنھیں موجودہ زمانے کا مذاق قبول نہیں کر سکتا یا جو موجودہ معیار کے مطابق پایۂ تہذیب سے گرے ہوئے ہیں۔ مگر محض خیالات کی پستی سے تنگ آکر ہمیں اُن کے شاعرانہ جوہر کو نہ بھول جانا چاہیے اور یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ محض پند و نصائح نظم کرنے کا نام شاعری ہے۔ قدیم اُردو شاعروں کے خیالات بلند نہ ہوں مگر ان کا انداز سخن شاعرانہ ہے۔ اُن کی زبان شاعرانہ تاثیر کا ذخیرہ ہے۔ جو مضامین وہ نظم کرتے ہیں اُن میں اُن کے دلی جذبات کا پرتو نظر آتا ہے یہی شاعری ہے۔

اگر آتش و انیس و غالب کی شاعرانہ وقعت کا صحیح اندازہ ہم سے نہ ہو سکا تو اُن کی شاعری کا قصور نہ تھا۔ بلکہ اپنی قومی بیخبری کے عالم مین جہان ہم نے زندگی کے بہت سے معاملات مین مغربی تہذیب کے اکثر اصولون کی غلط تعبیر کی وہان انگریزی شاعری کے غیر صحیح اندازے سے ہم نے اپنا مذاق سخن بھی اُلٹا سیدھا قائم کر لیا۔ زبان و شاعری کی آیندہ اصلاح و ترقی کے لئے قدیم شعرا کے انداز سخن اور رنگ بیان کا صحیح اندازہ کرنا ہمارے لئے نہایت ضروری ہے کیونکہ جس غیر صحیح مذاق سخن کی بنیاد پر ہم قدیم رنگ سخن کی قدر نہ کر سکے اُس کی مدد سے ہم زبان و شاعری مین نئے جوہر نہین پیدا کر سکتے۔

پنڈت پران ناتھ سرسوتی

(ماخوذ از "کشمیر درپن" اپریل سنہ ۱۹۰۳ء)

یہ حبیب قوم جس کا نام زیب عنوان ہے اُن چند بزرگان عالی صفات مین سے ہے۔ جنھون نے اپنے اعلیٰ دماغی قابلیت اور جوہر طبعی سے خطۂ کشمیر کا نام کل ملک مین روشن کیا۔ یون تو اس عالی خیال کے ناخن فکر نے بہت سے سوشل مذہبی اور پولیٹکل مسائل کی گتھیان سُلجھائین لیکن زیادہ تر علمی ترقی کا خیال دامنگیر رہا۔ یہ شخص انگریزی زبان کا اسکالر اور سنسکرت کا عالم تھا علاوہ برین فارسی، اُردو، بنگالی، گجراتی، تیلیگو وغیرہ پر بھی قدرت حاصل تھی۔

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اس صاحب کمال کے ساتھ عمر نے وفا نہ کی۔ یہ آفتاب نصف النہار تک بھی پہونچنے نہ پایا تھا کہ غروب ہو گیا۔ لیکن جو کچھ اس چند روزہ زندگی مین کیا وہ اہل قوم اور اہل ملک کے لیے باعث ناز ہے۔

پنڈت پران ناتھ سرسوتی پنڈت شمبھوناتھ جج ہائیکورٹ کلکتہ کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔ آپکے آبا و اجداد زمانہ شاہی مین دارالسلطنت دہلی مین عہدہاے جلیلہ پر ممتاز تھے۔ لیکن کچھ عرصہ

بعد گردش زمانہ صوبہ بنگال کی طرف کھینچ لائی - ایک مدت تک بزرگون کی قدیم جائے سکونت سے تعلق قائم رہا لیکن آخر کار کلکتہ کی خاک ایسی دامنگیر ہوئی کہ وہین ہمیشہ کے لئے قیام کیا۔ یہان پنڈت شمبھو ناتھ نے اپنی جودت طبعی اور قوت بازو سے وکالت کے پیشے مین وہ نام پیدا کیا کہ ہائیکورٹ کی کرسی پر اجلاس کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ واقعہ کشمیری قوم کی تاریخ مین یادگار رہیگا کہ پنڈت شمبھو ناتھ ہی پہلے ہندوستانی تھے جو کہ اس عہدۂ جلیلہ پر ممتاز کئے گئے۔

پنڈت شمبھو ناتھ کا ستارہ عین عروج پر تھا کہ ۱۸۵۵ء مین پنڈت پران ناتھ ضلع بھوانی پور مین پیدا ہوے۔ زہے نصیب اُس باپ کے جس کے آغوش محبت مین ایسا لڑکا پرورش پائے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ پنڈت شمبھو ناتھ نے ۱۸۶۷ء مین انتقال کیا اور یہ گوہر یکتا گردشی مین مبتلا ہو گیا۔ اس وقت پنڈت پران ناتھ کی عمر بارہ سال کی تھی۔ سر سے باپ کا سایہ اُٹھنے کا قلق ایسا ویسا نہ تھا۔ لیکن سلسلہ تعلیم برابر جاری رکھا۔ اُردو تو مادری زبان تھی۔ فارسی کی تکمیل گھر پر پڑھ کر کر لی۔ ایک بنگالی درسگاہ مین بنگالی زبان مین استعداد علمی حاصل کی۔ تلنگی اور گجراتی زبانین زیادہ عمر مین سیکھین۔

اسکول مین انگریزی اور سنسکرت کی ابتدائی تعلیم کو انجام دیکر پریسیڈنسی کالج کلکتہ سے ۱۸۷۳ء مین بی ' اے ' کا امتحان پاس کیا۔ چونکہ کامیابی مین غیر معمولی لیاقت کا ثبوت دیا لہذا پچاس روپیہ ماہواری کا وظیفہ بھی ملا از بسکہ سنسکرت کی تحصیل کا شوق نہایت ترقی پر تھا لہذا اس زبان متبرک مین ام ' اے ' پاس کرنے کے لیے سنسکرت کالج مین نام لکھایا۔ قبل اس کے کہ سلسلہ تعلیم ختم ہو آپ کی نورانی طبع اپنے جوہر دکھانے لگی۔ اس طالبعلمی ہی کے زمانے مین کالیداس

کی مشہور کتاب "میگھدوت" کی تقریظ لکھی اور ساتھ ہی ساتھ اس کا ترجمہ بنگالی زبان مین نظم مین شایع کیا جس سے کہ مصنف کی عالمانہ لیاقت کا اظہار ہوتا تھا۔ ان تصنیفات کے شایع ہونے پر پنڈت صاحب کی استعداد علمی کے جابجا چرچے ہونے لگے اور محققین بنگال آپ کو قدردانی کی آنکھون سے دیکھنے لگے۔ ۱۸۷۴ء مین ام اے' کا امتحان پاس کیا اور اس خوش اسلوبی کے ساتھ کہ اس سال سرسوتی کا خطاب پایا اور قدردانان علم سے ناموری کا تمغہ لیا۔ اور اس فخر قوم کی اعلیٰ مثال اُن خیرہ سرون کے توہمات رد کرنے کے لئے کافی ہے۔ جو تعلیم کے معنی یہ سمجھتے ہین کہ انسان اسکول یا کالج کی درسیہ کتابون کو رٹتا رہے اور تحصیل علم کا مآل کار یہ سمجھے کہ امتحان پاس ہو جائے۔ برخلاف اِس کے اصل منشا تعلیم کا یہ ہے کہ ذہن کو صفا اور آئینۂ عقل کو جلا حاصل ہو۔ یہی اصول پنڈت پران ناتھ نے تحصیل علم مین پیش نظر رکھا۔ بعد سلسلۂ تعلیم ختم ہونے کے تحصیل علم کا چرچا برابر قائم رکھا۔ کتب بینی کا شوق عشق کے درجے تک پہونچ گیا تھا۔ آپ کا کتب خانہ اُن نایاب اور قیمتی کتابون کا ذخیرہ تھا جو کہ نہایت جانفشانی اور محنت سے جمع کی گئی تھین۔ انگریزی مین شکسپیر، بائرن، مور، اور شیلی کا کلام نہایت پسند تھا۔ اکثر تنہائی کے عالم مین ان شعرا کا دلاویز کلام پڑھا کرتے تھے۔ سنسکرت مین کالی داس کی شاعری سے خاص اُنس تھا۔ رگھوبنس کے ایک حصے کا ترجمہ بنگالی زبان مین کیا جس کی فصاحت کا نور اہل بنگال کے دیدہ و دل کی روشنی ہے کچھ عرصے بعد ایک مضمون انگریزی مین کالی داس کے "اخلاق" کے متعلق بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے مین لکھا جس کو سخن شناسون نے حسن تحریر کا اعلیٰ نمونہ مانا۔

لیکن صرف علمی اور اخلاقی مسائل پر مضامین لکھنے پر اکتفا نہ کیا۔ جولانی طبع کا دریا ہر طرف

لہرین مار رہا تھا۔ چنانچہ آبائی جوہر کی طرف توجہ ہوئی اور مطالعہ قانون کا شوق پیدا ہوا ۱۸۷۶ء مین قانون کا امتحان بھی پاس کر لیا اور وکالت شروع کر دی۔ اُس زمانے مین مسائل ملکی پر بھی توجہ مبذول کی چونکہ سائنس اور لٹریچر کے مختلف صیغون سے وقفیت کلی حاصل کر لی تھی اور قلم مین خداداد زور تھا لہٰذا مختلف پولیٹکل سوشل اور مذہبی مسائل پر جو کہ اُس وقت چھڑے ہوئے تھے بہت سے رسالے اور مضامین لکھے اور جابجا لکچر دیے جن کی فہرست لکھنا طول عمل سے خالی نہین عنفوان شباب کا زمانہ تھا اور طبیعت اپنی خداداد اُمنگین اور جوہر دکھا رہی تھی۔ اُسی زمانے مین ایک کتاب "بھگوت گیتا اور انجیل" کے نام سے انگریزی مین لکھی جس کی تعریف بہت سے اخبارون مین چھپی اور مصنّف کی عالی خیالی اور عالمانہ لیاقت کی داد علماے بنگال نے دی۔

قانونی لیاقت بھی اعلیٰ درجے کی تھی اور جودت طبعی نے اس پر اور جلا کر دی تھی۔ ایک شخص کا مقدمہ کوئی وکیل محض اِس خیال سے نہین لیتا تھا کہ ایک نامی گرامی وکیل فریق ثانی کی طرف تھا۔ پنڈت پران ناتھ کو وکالت شروع کیے ہوے ابھی زیادہ زمانہ نہ گذرا تھا لیکن چونکہ ذہانت طبع بجلی کا کام کر رہی تھی لہٰذا ہمت کر کے اِس مقدمہ کی پیروی کا ذمہ لے لیا اور اِس خوش اسلوبی سے دوران مقدمے مین کام کیا کہ فیصلہ اپنے موافق کرا لیا۔ بڑے بڑے گرگ باران دیدہ جو اِس مقدمے کی پیروی سے کنارہ کشی کر گئے تھے دنگ ہو کر رہ گئے اور اِس نوعمر وکیل کی طباعی پر آفرین کہی۔ مہاراجہ کشمیر اکثر معاملات مین آپ سے قانونی مشورہ لیتے تھے اور مختلف ریاستون کے آپ مشیر قانونی تھے۔ ۱۸۸۰ء مین ٹاگور لا لکچرر کے عہدے پر ممتاز ہوئے یہ اعزاز اُسی شخص کو عطا ہوتا ہے جو کہ اعلیٰ درجے کی قانونی لیاقت رکھتا ہو۔ علاوہ برین بہت

سی قانونی کتابین آپ سے یادگار ہین جوکہ اب تک قدرو منزلت کی نگاہون سے دیکھی جاتی ہین فن تقریرین زیادہ دخل نہ تھا لیکن نثر انگریزی لکھنے مین خاص ملکہ حاصل تھا۔ بنگال کے مشہور نشار ڈاکٹر شمبھو چندر مکرجی کے اخبار "رئیس ورعیت" مین آپ برابر مضامین لکھا کرتے تھے بلکہ جب وہ اخبار جاری ہوا تو اُس کے پہلے نمبر کے مضامین آپ ہی کے زور قلم کا نمونہ تھے۔ کچھ عرصے تک خود بھی ایک اخبار کے اڈیٹر رہے جس کا نام "نیشنل پیپر" تھا۔ شہر مین کوئی ایسی علمی سوسائٹی یا جماعت نہ تھی جس کی آپ دامے درمے قدمے سخنے مدد نہ کرتے ہون۔ کچھ روز کے بعد بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر ہونے کا امتیاز حاصل ہوا اور سوسائٹی مذکورہ کو آپ کے اعلیٰ درجے کی خدمات پر ہمیشہ ناز رہا۔ اسی زمانے مین تعلیم نسوان کے متعلق ایک زور شور کا مضمون لکھا جس کا منشا یہ تھا کہ عیسائیون کے ہاتھ مین ہندوستانی لڑکیون کی تعلیم رکھنا خلاف مصلحت ہے۔ اس مضمون کی سُرخی تھی "کیا ہم جاگ رہے ہین"۔ اِس تنبیہ نے بہتون کو خواب غفلت سے بیدار کیا اور جابجا اخبارون اور رسالون مین اس مسئلہ پر بحث چھڑ گئی۔

فن تاریخ مین خاص مداخلت حاصل تھی سنسکرت کے عالم ہونے کی وجہ سے بہت سے تاریخی عقدے جن کا کہ قدیم ہندوستان سے تعلق ہے آپ کے لئے آئینہ ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر شمبھو چندر مکرجی نے جو مضمون آپ کی وفات پر اپنے اخبار مین لکھا اِس مین صاف طور پر تحریر ہے کہ جہان تک ہندوستان قدیم کے مسائل تواریخی سے تعلق ہے پنڈت پران ناتھ سرسوتی کی رائے بہ نسبت ڈاکٹر جندر لال متر اور دیگر یورپ کے علماے سنسکرت کے زیادہ قابل وقعت خیال کرنی چاہیے۔ کیونکہ یہ لوگ اپنی کل تواریخی تحقیقات دوسرے پنڈتوں اور شاستریون کے ترجمون پر مبنی کرتے ہین۔ برخلاف اس کے

پنڈت پران ناتھ خود سنسکرت کے محقق تھے اور کل تاریخی مسائل کی چھان بین آپ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک تانبے کا پتّر دستیاب ہوا جس پر کچھ عبارت منقوش تھی اِس عبارت کے معنی حل کرنے پر بنگال کی قدیم تاریخ کا پتا چلتا تھا۔ ڈاکٹر رجندر لال متر نے جو کہ اُس زمانے مین تاریخ قدیم کی گتھیان سُلجھانے مین فرد سمجھے جاتے تھے اِس عبارت کا مطلب کسی خاص صورت پر حل کر دکھایا۔ جس مجلس علمی مین اِس عبارت کے معنی جیسا کہ ڈاکٹر راجندر لال نے ں کئے تھے پڑھے گئے اِس مین پنڈت پران ناتھ بھی موجود تھے آپ نے نہایت آزادانہ طور پر اُٹھ کر ڈاکٹر رجندر لال متر کے بتائے ہوے مطلب کی تردید کی اور اِس عقدے کو دوسرے طور پر حل کیا اس نوعمر اسکالر کو بنگال کے زبردست عالم پر اعتراض کرتے ہوے دیکھ کر حاضرین جلسہ دنگ رہ گئے۔ ڈاکٹر رجندر لال متر نے اپنی غلطی تسلیم کی اور سر جھکا لیا۔ خدا کی قدرت دیکھو اس غزال کشمیر کے آگے بنگال کا شیر پست ہو گیا۔

چھوٹے ناگپور کی ریاست کی تواریخ بھی آپ کے قلم کی یادگار ہے۔ پنڈت پران ناتھ نے ایک سلسلۂ مضامین کی بنیاد ڈالی تھی جس مین کہ ہر ایک گورنر جنرل کی دوران حکومت کے تذکرے شایع ہوا کرتے تھے۔ پہلا مضمون وارن ہسٹینگز کے زمانے پر ایک تواریخ سے اقتباس کر کے چھاپا بھی تھا۔ لیکن قبل اِس کے کہ دوسرا مضمون شایع ہو موت نے قصہ کوتاہ کر دیا۔

اپنے لڑکے کی علالت طبع کی وجہ سے چنار جانے کا اتفاق ہوا۔ وہان پہونچکر بخار آیا۔ یا یون کہیے کہ موت بخار کا بھیس بدل کر آئی۔ کچھ روز علیل رہ کر ۳۸ برس کی عمر مین مطابق ۲۶ اکتوبر سنہ ۱۸۹۲ع اس دار فانی سے رحلت کی۔

اس قلیل زمانے مین جو اعزاز پنڈت پران ناتھ کو حاصل ہوا اس پر ہر فرد بشر کو ناز ہو سکتا ہے۔ آپ کی وفات پر کل ملکی اخبارون مین حسرت آگین مضامین نکلے۔ الہ آباد مین مسٹر ڈبلو سی بانرجی نے بہ حیثیت صدر انجمن کانگرس آپ کی وفات پر افسوس ظاہر کیا اور آپ کی خدمات کا رقت آمیز الفاظ مین تذکرہ کیا۔

اہل بنگال اگر خدا کے بعد کسی کی عظمت کے قائل ہین تو اپنی عظمت کے لیکن پنڈت پران ناتھ کا لوہا سب مانتے تھے اور پھر ایسے وقت مین جب کہ ڈاکٹر شمبھو چندر مکرجی، ایشور چندر ودیا ساگر اور ڈاکٹر رجندر لال متر ایسے صاحب کمال موجود تھے (علما اور شرفا کے جلسون مین ادب و محبت کی آنکھین اس زبردست عالم اور نکتہ سنج کے لئے فرش راہ ہوتی تھین۔ مگر باوجود اس عزت و وقار کے اس عالی ظرف کا دامن شہرت بددماغی اور تمکنت کے داغ سے پاک تھا۔ اہل بنگال پنڈت پران ناتھ کی وسعت اخلاق، لطافت مزاج اور سلامتی طبع کی تعریف مین ہمیشہ تر زبان رہے۔

اس مین شک نہین کہ اعزاز پر اعزاز نصیب ہوا۔ قانونی لیاقت اور شان ریاست کے لحاظ سے آنریری مجسٹریٹی کا عہدہ سرکار سے ملا۔ کلکتہ یونیورسٹی نے اپنا فیلو مقرر کیا۔ بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر ہونے کا امتیاز حاصل کیا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ والی کشمیر جب کلکتہ تشریف لائے تو آپ کو شرف حضوری بخشا اور ست پارچہ کا خلعت عطا فرمایا۔ علاوہ برین ملک و قوم کی نگاہون مین جو آپ کا وقار تھا وہ محتاج بیان نہین۔ لیکن عجب حسن اتفاق تھا کہ باوجود اس عزت و اعزاز کے انکسار و ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا اور طبیعت مین سلامت روی کا جوہر قائم رہا واقعی یہی مقتضائے انسانیت بھی ہے۔

رتبے مین فروتنی کے بالا وہ ہے — تہذیب کی آنکھون کا اُجالا وہ ہے
انسان کے لئے ہے خاکساری جوہر — ادنیٰ سے ملے جھک کے جو اعلیٰ وہ ہے

پنڈت پران ناتھ کی زندگی پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو اگر واقعی پڑھنے کا شوق ہو تو وہ تھوڑے سے زمانے مین کیا کمال حاصل کرسکتا ہے۔ مگر اصلی جوش ہونا شرط ہے۔ جو لوگ شکایت کرتے ہین کہ اب ہماری قوم مین ایسے صاحب کمال نہین پیدا ہوتے ان کو اس بات پر غور کرنا لازمی ہے کہ اب تحصیل علم کا شوق محض ترقی علمی کے لئے دلون سے دور ہوتا جاتا ہے۔ کتابون کے مطالعے سے یہ مراد نہین رہتی کہ ان کا مضمون جزو دماغ ہو جائے جو کہ تعلیم کا اصل منشا ہے۔ آج کل کتب بینی کا مشغلہ ورق گردانی سے زیادہ وقعت نہین رکھتا اور وہ بھی امتحان کی سند حاصل کرنے کے لئے۔ یہ مانا کہ بڑی وجہ ایسے مشاغل سے نفرت پیدا ہونے کی یہ ہے کہ افلاس نے لوگون کے حواس پراگندہ کر رکھے ہین خدا کے بندے معاش کے بندے ہو گئے ہین لیکن فضل الٰہی سے ہماری قوم مین ایسے صاحب استطاعت کثرت سے پائے جائین گے جو کہ تحصیل علمی کا مذاق نہایت آسانی سے قائم رکھ سکتے ہین لیکن یہ لوگ دولت دنیا کے دام مین ایسے اسیر ہین کہ دولت علمی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہین۔ یہی وجہ ہے کہ اس قدر نخوت خود پرستی اور ما و من کا زور ہے۔ ؎

چاہے شکست جہل تو تحصیل علم کر — وابستہ یہ طلسم ہے لوح کتاب کا

برخلاف اس کے پنڈت پران ناتھ کا علمی شوق اس درجے پر پہونچ گیا تھا کہ ان کے مرنے پر جو مضامین ان کے احباب نے لکھے ان مین قریب قریب سب مین اس امر کا تذکرہ ہے کہ انھون نے ایک معنی مین اپنے تئین آپ مارا۔ یعنی ایسی دماغی محنت کی جس کے وہ متحمل نہ ہو سکے۔

اس سلسلہ مین اس امر کا خیال بھی لازمی ہے کہ انسان کی زندگی تاثیر صحبت سے بہت کچھ رنگ پکڑتی ہے۔ پنڈت پران ناتھ ایسی جگہہ پیدا ہوے تھے جوکہ اس عہد نو مین کل ہندوستان کی تہذیب و تربیت کا مسکن ہے اور جس کو اب وہی رتبہ حاصل ہے جوکہ زمانہ گذشتہ مین دہلی اور لکھنؤ کو حاصل تھا۔ لہذا اس ذہی فہم او نکتہ سنج نے اُس شایستہ اور پاکیزہ سوسائٹی کا خوب فائدہ اُٹھایا جوکہ بنگال کو مُلک کا دارالعلم بنائے ہوے تھی۔ اس مین شک نہین کہ ایسے لوگ جوہر خداداد اپنے ساتھ لاتے ہین لیکن نیک صحبت کا اثر سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ خالی تحصیل علمی سے کچھ فائدہ نہین۔ علمی ترقی کا مآل کار یہ ہے کہ دوسرون کو فیض حاصل ہو۔ علم کی دولت اگر قارون کا خزانہ ہوئی تو کیا۔ دماغ وہ ہے جوکہ علم کا سرچشمہ ہو نہ کہ قبر۔ پنڈت پران ناتھ کا فیض اس معنی مین ہمیشہ جاری رہا انھون نے اپنے جوہر علمی کے چراغ سے بہت سے چراغ روشن کئے۔ ان تمام اخلاقی، سوشل، پولیٹکل اور مذہبی مسائل پر جوکہ اس وقت ان کے پیش نظر تھے اپنے غور و فکر کی روشنی ڈالی۔

مگر کیا افسوس کا مقام ہے کہ اس عالی دماغ کو اپنے جوہر قابلیت دکھانے کا پورا موقع نہ ملا۔ دل کی آرزو دل ہی مین رہی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کیسے کیسے کمالات مرنے والے کے ساتھ مٹی مین مل گئے۔ وہ نخل حیات جوکہ عین بہار پر تھا اگر اتنی جلدی قلم نہ ہو جاتا تو خدا جانے اس مین کیسی کیسی کونپلین پھوٹتین اور کیا کیا پھل پھول پیدا ہوتے مگر قدرت کے کارخانے مین کسی کو دخل نہین ہے ؎

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد | روے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

دادابھائی نوروجی

ماخوذ از "کشمیر درپن" جنوری ۱۹۰۶ء

یادگارِ زمانہ ہین یہ لوگ
یاد رکھنا فسانہ ہین یہ لوگ

جب اُنیسوین صدی کے آغاز مین زمانے کے انقلاب مین ہندوستان کی قدیم سلطنت کے ساتھ قدیم تہذیب کا بھی ورق اُلٹا تو نئے دَور کے انداز معاشرت کی داغ بیل ڈالنے کے لئے چند ایسے پاک طینت بزرگ پیدا ہوے جن کے دل محبت سے پُر تھے اور جن کی آنکھین اس دوراندیشی کے نور سے روشن تھین جن کی بدولت انسان پُرانی روش کے نقش قدم کو نقش عبرت سمجھکر آئندہ شاہراہ تلاش کرلیتا ہے۔ اس زمرے مین کچھ پاک روحین ایسی تھین جو مذہبی اور سوشل اصلاح کے عالم مین گرم سیر رہے۔ انھون نے قدیم تعصبات و توہمات کے بُت توڑے اور خود غرضی و جہل کے تنگ و تاریک معبد کو وسعت دے کر اپنے بلند نظری کے فیض سے نورانی بنایا۔ راجہ رام موہن رائے سوامی دیانند سرسوتی، مسٹر رانیڈے وغیرہ کا شمار ایسے ہادیان طریقت مین ہے۔ ان بزرگون کے علاوہ چند ایسے ہیران اصلاح ظہور مین آئے جنھون نے پولیٹکل بیداری کا صور پھونکا اور اپنے مردہ دل ہموطنون کو پستی و گمنامی کے گورستان سے نجات دیکر قومی زندگی کی جنت کا راستہ دکھایا۔

اِس رنگ پر چلنے والون مین دادا بھائی نوروجی، سر ندرناتھ بنرجی، سر سیّد احمد خان وغیرہ ہین - اس مین شک نہین کہ ان نیک نفس حضرات کی کوششون کا برقی اثر اکثر مذہبی اور سوشل اصلاح کے دائرے تک بھی پہونچا۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی ان کے زندگی کے کارنامون کا اندازہ کیا جائے تو یہی ثابت ہوگا کہ ان کا سرمایۂ حیات زیادہ تر اپنے ہموطنون کے پولیٹکل حقوق کی وسعت کے لیئے وقف رہا - ان گران قدر بزرگون مین ہمارے مضمون کا تعلق دادا بھائی نوروجی سے ہے اور ان دوچار صفحون مین عزیزان وطن کے سامنے اِس فدائے ملک کے پولیٹکل عقائد کا خاکہ پیش کرنے کوشش کی جائے گی -

دادا بھائی نوروجی کے سوانحی حالات زیادہ تفصیل طلب نہین ۔ کیونکہ ہر سال جو مضامین آپ کے متعلق شایع ہوتے رہتے ہین ان کی وجہ سے یہ حالات زبان زد عام ہو رہے ہین - ہان غور کا مقام ہے تو یہ ہے کہ وہ بچہ جس کے سر سے چار برس کی عمر مین باپ کا سایہ اُٹھ گیا ہو، جس نے شیر مادر کے ساتھ مفلسی کا مزہ چکھا ہو، سوائے غریب مان کے کوئی خبر گیران نہ ہو، ایسا قابل اور ہونہار نکلے کہ بچپن سے لیکر بڑھاپے تک ہر رنگ اور ہر عالم مین اپنے ہم جلیسون مین ممتاز رہے اور مُدّت العمر تک ملکی کشتی کا ناخدا سمجھا جائے ۔ فیضان قدرت اسی کو کہتے ہین - اور انسانی زندگی کی عظمت اسی کا نام ہے - الفنسٹن کالج مین طالب علمی کے زمانے مین دادا بھائی کے معلمون کا یہ قول رہا کہ یہ لڑکا کروڑ مین ایک ہوگا - اسی کالج مین جو علمی انجمن قائم ہوئی اس کے روح روان یہی تھے ۔ تعلیم نسوان کا پہلا مدرسہ بمبئی مین دادا بھائی نے قائم کیا ۔ نیز علمی ترقی اور سوشل تربیت کے لیے جو انجمنین قائم ہوئی ہین اور جو زمانے کے ہاتھون سے اب تک محفوظ ہین

ان کے نشو و نما کا سہرا دادا بھائی کے سر ہے۔ بمبئی مین پہلی مرتبہ جو دیسی اخبار آزاد خیالی اور روشن دماغی کی امیدون پر جاری کیا گیا اس کے اڈیٹر دادا بھائی ہی تھے۔ ہندوستان مین پہلی مرتبہ دادا بھائی الفنسٹن کالج مین ریاضی کے پروفیسر مقرر ہوے۔ اور اس مشہور کالج کے لئے آپ کی خدمات باعث ناز ہین۔ بڑودہ کے دیوان کی حیثیت سے جو شان مدبری کے کرشمے دادا بھائی نے دکھائے اُن سے اس ریاست کی تاریخ کے صفحے روشن ہین۔ دادا بھائی اس کارخانے کے سرآوردہ شرکا مین تھے جس نے کہ پہلی مرتبہ انگلستان سے براہ راست تجارت شروع کی۔ بمبئی کی مجلس واضعان قانون کے نام آور اراکین مین دادا بھائی کا شمار رہا۔ انگلستان اور ہندوستان مین جو شاہی کمیشن مقرر ہوے دادا بھائی کو ان کے ممبر ہونے کا امتیاز حاصل رہا۔ یہی پہلے ہندوستانی تھے جنھون نے پارلیمنٹ کے شاہی دربار مین کرسی پا کر اپنے وطن کا نام روشن کیا۔ دادا بھائی پہلے حبیب وطن ہین جن کے سر پر قوم نے تین مرتبہ کانگرس کی صدر نشینی کا تاج رکھا۔ ان تمام واقعات کا تفصیل وار لکھنا ایک طولانی سوانح عمری لکھنا ہے۔ ذیل کے مضمون مین محض اس پولیٹیکل مذہب کے چند حقیقی پہلوؤن پر تنقید کی نظر ڈالی جائیگی جس کے دادا بھائی پیرو ہین۔

ہندوستان مین تقریباً ڈیڑھ سو برس سے سلطنت برطانیہ کا پھریرا لہرا رہا ہے۔ یہ زمانہ تین حصون مین تقسیم ہوسکتا ہے۔ پہلے دور سے وہ سراسیمگی کا عالم مراد ہے جبکہ میدان جنگ مین انگریزی سنگینون کے زور سے دولت برطانیہ کی حکومت کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ دوسرے دور مین یہ بنیاد مستحکم ہوئی اور قضا و قدر کے محکمے سے یہ فرمان جاری ہوا کہ آخر کار نیکنامی یا بدنامی کی تدبیرون سے ہندوستان کا نگین تاج برطانیہ مین جڑ دیا گیا۔ تیسرا دور، وہ دور اندیشی اور زمانہ شناسی کا عہد تھا

جب کہ واقعات کی رفتار دیکھ کر یہ مسئلہ پیش آیا کہ نئی حکومت اور نئے انداز معاشرت کے مطابق ہندوستان کی رعایا کو اپنی زندگی کا کیا دستورالعمل قرار دینا چاہیے جس کام کے لئے پہلے دو دَور وقف رہے وہ کام اہل ہند کی مدد کا محتاج نہ تھا مگر تیسرے دَور کے کارِ عظیم انجام دینے کے لئے بہت کچھ اہل ہند ذمہ دار تھے ۔ اس کارِ عظیم کے معنی یہ تھے کہ ہندوستانی نظام معاشرت مین اور ملک کی انقلابی حالت مین تناسب کا رشتہ قائم کیا جائے تاکہ انسانی کشاکش حیات کے عالم مین ہندوستانیون کی ہستی قائم رہے ۔ اس مسئلے کے حل کرنے کے لئے اس وقت کے عالی دماغ بزرگون نے یہ روش اختیار کی ایک جانب تو حکمران قوم اور دل شکستہ رعایا کے تعلقات مین رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے ۔ اور دوسرے جانب ہندوستان کے مختلف فرقون کی بکھری ہوئی کڑیون کو ایک سلسلے مین لاکر کل قوم کی شیرازہ بندی کی فکر کی جائے ۔ ان بزرگون مین دادا بھائی کا نام سب سے زیادہ قابل امتیاز ہے ۔ جن حضرات کی نظر سے دادا بھائی کی پولیٹکل تقریرین اور تحریرین گزری ہین وہ جانتے ہین کہ شروع سے اُن کا مسلک یہی رہا کہ ہندوستان کی بہبودی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اہل ہند سلطنت برطانیہ کی وفاداری سے مُنہ نہ موڑین اور باضابطہ بحث و تحریک کی مدد سے بلالحاظ ملت و مذہب یک دل اور یک زبان ہوکر اپنے پولیٹکل فرائض انجام دین اور اپنے پولیٹکل حقوق کی توسیع کی کوشش کرین ۔ دادا بھائی کا عقیدہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ جو امن و امان کی نعمت ہندوستان کو دولت برطانیہ کے سائے مین حاصل ہے ۔ اس کا شکریہ ادا کرنا اہل ہند کا فرض ہے اور نیز جو برکتین اس مہذب حکومت کے ساتھ وابستہ ہین ان سے کوئی چشم پوشی نہین کرسکتا ۔ مگر باوجود ان محاسن کے انگریزی حکومت کے دامن پر دو ایسے داغ

ہین جو کسی طرح مٹائے مٹ نہین سکتے۔ اولاً حاکم و محکوم کے مالی تعلقات ایسے غیر منصفانہ ہین کہ ہندوستان کے تیرہ خاکدان ہین روز بروز مفلسی کا اندھیرا بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ثانیاً ہندوستان کے باشندون کے لئے اعلیٰ ذمہ داری اور اعزاز کے عہدون کا در بند ہو گیا۔ لہذا اُن کی دماغی اور اخلاقی ترقی کا معیار ادنی ہوتا جاتا ہے۔ کیونکہ جن قابلیتون کو اظہار کا موقع نہین ملتا اُنکی نشو و نما ممکن نہین۔ ان عیوب کے فنا کرنے کے لئے دادا بھائی نے اپنی زندگی وقف کر دی ہے اور ہمیشہ اُن کی تلقین یہی رہی ہے کہ جو متنفس ہندوستان کی خاک سے اُٹھا ہے اُس کا یہ فرض ہے کہ وہ باضابطہ بحث و تحریک کی مدد سے اپنے دردِ دل کی داستان حکمران قوم کے کان تک پہونچاے۔ آج جب کہ ہندوستان ہین پولیٹکل معرکہ آرائیون کا بازار گرم ہے۔ یہ تلقین روزمرّہ کی گفتگو ہین شامل ہے۔ مگر جس وقت دادا بھائی نے باضابطہ بحث و تحریک و قومی اتحاد و یگانگت کا وعظ شروع کیا وہ زمانہ ہندوستان کے لئے عجب بیخبری کا زمانہ تھا۔ چارون طرف جہل و خود پرستی کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ۱۸۲۵ء مین مرہٹون کی قوت شکست کھا چکی تھی۔ مگر ان کے خون آشام تلوارین ابھی پوری طور سے میان ہین نہین داخل ہوئین تھین۔ رسّی جل گئی تھی مگر بل قائم تھا دہلی کی گذشتہ عظمت کے مزار پر ایک دھیمی سی شمع ابھی تک جل رہی تھی۔ اودھ ہین نوابی دور کا منہ قائم تھا۔ سکھون اور مسلمانون کے درمیان ہین نفاق کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ انگریزی تہذیب و تربیت کے نشو و نما کا زمانہ دُور تھا۔ قومی اتحاد اور پولیٹکل نجات کے ولولے دلون نے محسوس ہی نہین کئے تھے۔ کانگرس کا خیال خواب ہین بھی نہین پیدا ہوا تھا۔ ایسے عالم ہین اہل ہند کے پولیٹکل حقوق کی حفاظت کا خیال پیدا ہونا اور پھر اس خیال کا کسی خاص فرقے یا قوم

تک محدود نہ رہنا ایک عجیب وحانی وقار اور بلند نظر کا کرشمہ تھا۔ میرے دوست عظیم الشان پیشوایان قوم جس نگاہ سے زمانے کی رفتار دیکھتے ہین اس نگاہ سے معمولی نظر کا آدمی نہین دیکھ سکتا۔ جہل و تعصب کے پردے ان کی آنکھون سے اٹھ جاتے ہین۔ کوتاہ اندیشی اور مذہبی تعصبی کی آہنی دیوارین ان کے سامنے شق ہو جاتی ہین۔ اور وہ عالم خیال مین اپنی روحانی پاکیزگی کی روشنی کی مدد سے آیندہ منزل مقصود کا جلوہ اپنی عقیدتمند آنکھون سے دیکھ لیتے ہین اور اسی طرف اپنے اُن دوستون کو چلنے کی تلقین کرتے ہین جن کی نظر اتنی بلند نہین ہے اور جن کے خیال کا دائرہ اتنا وسیع نہین ہے۔ دادا بھائی کی بلند نظری اور اخلاقی عظمت کا وقار ہمارے دل مین اور بڑھ جاتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہین کہ اب بیسوین صدی کے آغاز مین جب کہ انگریزی تہذیب کا سکہ ہمارے دلون پر چل رہا ہے۔ جب کہ مغربی قومین اتحاد اور جمہوری اصولون کی ترقی کی بدولت روے زمین کا نقشہ بدلتی جاتی ہین ہماری مبارک سرزمین پر ایسی خدا کی مخلوق انسان کی شکل مین موجود ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ ہندو مسلمانون کا پولیٹیکل اتحاد اک امر محال ہے (اور جس کے مذہب مین منصفی اور سب تجی کی چارون کی چاندنی حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کا گلا کاٹنا ثواب مین داخل ہے۔ مگر دادا بھائی کی طینت مین اس کفر کو کبھی دخل نہ تھا۔ ان کی دور اندیش نگاہون کو پچاس برس قبل وہ راستہ نظر آگیا تھا جس پر اس وقت ملک کے بہترین دماغ چلنے کی کوشش کر رہے ہین۔ سر تندر ناتھ بنرجی اسی بیشہ کے شیر ہین۔ بدرالدین طیب جی اسی مذہب کا کلمہ پڑھتے تھے۔ رومیش چندر دت اسی شمع کے پروانے ہین۔ پروفیسر گوکھلے اسی چمن کے بلبل ہین۔ اور کالی چرن بنرجی اسی کلیسہ مین سجدہ کرتے ہین۔

مگر اٹھارہ یا انیس سال کا عرصہ ہوا کہ اس عام عقیدے کے خلاف ایک زبردست اور پُرشوکت آواز علی گڑھ سے بلند ہوئی اور یہ آواز اب تک مسلمانوں کے ایک کثیر حصے میں گونج رہی ہے۔ یہ سر سید احمد خان (نور اللہ مرقدہٗ) کی آواز تھی۔ سر سید احمد مرحوم کے سر میں بھی دادا بھائی کی طرح حب قوم کا سودا سمایا ہوا تھا اور اس فدائے قوم کی کوششوں میں اسی سرگرمی اور مستقل مزاجی کا جلوہ نظر آتا ہے جو تمام عظیم الشان انسانوں کا جوہر ہے۔ اور جو اصلاحیں سر سید کی زبردست تدبیروں سے مسلمانوں کے تعلیمی، سوشل اور مذہبی نظام میں ظہور میں آئیں ان کے ذکر خیر سے آیندہ نسلوں کی زبان ہمیشہ تر رہیگی۔ مگر سر سید کا پولیٹیکل مذہب دادا بھائی کے اصولوں کے خلاف ہے۔ سر سید نے اہل اسلام کو یہ سبق دیا کہ اُن کو حکام وقت کی شفقت اور انصاف پسندی پر بھروسا رکھنا چاہیئے اور پولیٹیکل بحث و تحریک سے اپنا دامن آلودہ نہ کرنا چاہیے۔ سر سید کی صدق نیت میں شک کرنا کفر ہے۔ جو کچھ اس حبیب قوم نے کیا اپنے ہم مذہبوں کی سچی بہبودی کے خیال سے۔ مگر با این ہمہ ہماری ادب آموز نگاہیں یکایک اس عظیم الشان بزرگ کی خیالی تصویر کی جانب اُٹھتی ہیں اور ہماری زبان سے بے ساختہ یہ کلمہ نکلتا ہے کہ افسوس سر سید نے باوجود اعلیٰ درجے کی مُدبری اور عالی خیالی کے اپنے زمانے کی پولیٹیکل تہذیب کی قوتوں کا صحیح اندازہ نہ کیا۔ میرے دوستو سر سید کا پولیٹیکل عقیدہ دادا بھائی کے مذہب ہی کے خلاف نہیں ہے بلکہ دُور اندیشی اور زمانہ شناسی کے خلاف بھی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس وقت ہندوستان کی تمدنی ترقی کی معرکہ آرائیوں میں مغربی قوموں سے مقابلہ کرنا ہے۔ اور یہ مقابلہ کامیابی کے ساتھ اسی حالت میں ہو سکتا ہے جب کہ ہم ان آلات حرب سے واقف ہوں جو کہ مغربی قوموں کے قوت بازو بنے ہوئے ہیں۔

یہ آلات حرب کیا ہین - اُن کی تہذیب معاشرت کے جمہوری اصول ہین - اگر اہل ہند کچھ روز دُنیا مین عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہین تو اُن کو اپنی ترقی کے راستے مین انھین اصولون کو سنگ نشان خیال کرنا چاہیئے - (انھین اصولون کے مطابق ہم موجودہ تہذیب کا یہ رنگ دیکھتے ہین کہ نظام معاشرت کے ہر صیغے مین ہر ایک قسم کے اقتدار و قوت کا سرمایہ افراد واحد کے قبضے سے نکلکر عوام مین تقسیم ہوتا جاتا ہے) وہ مذہبی پیشوا جو پیشتر اپنے قلم کی ایک گردش سے تخت و تاج کا فیصلہ کر دیتے تھے اب اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ مقلدین کی رائے کے خلاف کوئی فتوے نہین جاری کر سکتے - بڑے بڑے مسائل مین بیٹا باپ کے خلاف اپنے عقیدے کا اظہار کر سکتا ہے اور اُس کا ایسا کرنا بے ادبی اور بد تہذیبی مین شامل نہین سمجھا جاتا - اِس جمہوری اصول کی نشو و نما زیادہ تر پولیٹیکل دُنیا مین ہوئی ہے - شاہ وقت یا وزیر اعظم کے احکامات محض عام رعایا کے مجموعی خیالات کا عکس ہوتے ہین - اور رعایا کو اختیار حاصل ہے کہ وہ حکام وقت کے خلاف اپنی نارضگی کا باضابطہ اظہار کرے - اسی اصول کا پرتو دادا بھائی کے پولیٹیکل مذہب مین بھی نظر آتا ہے - وہ انگریزی حکومت کا استحکام ہندوستان کی بہبودی کے لئے نہایت ضروری خیال کرتے ہین اور ان کی سچی وفاداری سے پائنیر ایسے کافر کو بھی انکار نہین ہے - مگر اسی کے ساتھ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اہل ہند کو حکام وقت کے سامنے اپنے ضروریات کا اظہار باضابطہ بحث و تحریکات کے پیرائے مین کرنا چاہیئے اور اپنے پولیٹیکل حقوق کے تحفظ و توسیع کی کوشش مین سرگرم رہنا چاہیئے - برعکس اس کے سر سید مرحوم کا عمل شیخ سعدیؒ کے مقولہ پر تھا کہ ؎

اگر شہ روز را گوید شب ست این ... بباید گفت اینک ماہ و پروین

اور یہ کہنے کی ضرورت نہین کہ یہ اصول موجودہ تہذیب و تربیت کے بالکل خلاف ہے ہم کو
اس بات کی شکایت نہین کہ سرسید نے کانگرس کو اپنی شرکت سے کیون محروم رکھا۔ ممکن ہے کہ
سرسید کو کانگرس کے اراکین کی نیک نیتی مین شک ہو یا اسی قسم کے اور خیالات کانگرس سے
اختلاف کے حامی ہوئے ہون ۔ ہم کو افسوس ہے تو یہ کہ سرسید نے یہ تلقین کس اصول پر کی کہ
مسلمانون کو پولیٹیکل بحث و تحریک سے قطعاً پرہیز کرنا چاہیئے ۔ اور حکام وقت کی محبت اور انصاف
پسندی پر کافی اعتماد رکھنا چاہیے ۔ اگر کانگرس ان کے امتحان مین پوری نہین اتری تھی تو وہ
مسلمانون کے لئے دوسری پولیٹیکل انجمن قائم کر سکتے تھے ۔ مگر نہین ۔ اس حبیب قوم کی تو مسلسل
کوشش یہی ہے کہ مسلمان نوجوان پولیٹیکل تعلیم کے سرچشمے سے اپنے ہونٹ نہ تر کر سکین ۔ اس تلقین کا
نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانون مین باوجود اعلیٰ ذہانت کے ایسے بزرگ نظر نہین آتے جو پولیٹیکل یا تمدنی
مسائل کے محقق سمجھے جائین ۔ ان مین دادا بھائی کے ایسے پولیٹیکل رشی اور گوکھلے کے ایسے
پولیٹیکل سنیاسی معدوم ہین ۔ ایسے بزرگون کا نہ پیدا ہونا کوئی معمولی بات نہین ہے ۔ ایسے لوگ
قوم کی جان ہوتے ہین اور انھین کی اخلاقی عظمت سے قوم کی عظمت کا اندازہ کیا جاتا ہے برعکس
اس کے ہم دیکھتے ہین کہ نواب سلیم اللہ صاحب کے ایسے اکثر قوم فروش پیدا ہو گئے ہین جو پولیٹیکل او
تمدنی تعلیم کے ابتدائی اصولون سے بے بہرہ ہین اور جو ذاتی فروغ حاصل کرنے کے لئے کل
قوم کی طرف سے یہ صدا لگانے کے لیے تیار ہین کہ " الٰہی آفتاب دولت درخشان باد ۔ لارڈ
منٹو سلامت "۔ نواب صاحب موصوف نے مسلمانون کی ایک انجمن قائم کرنے کی فکر کی تھی
جس کا دستور العمل یہ ہوتا کہ کانگرس کی ہر تجویز سے اختلاف کرے اور حکام وقت کی تائید کرے

اگر یہ قوم فروشی نہین ہے تو کیا ہے اور افسوس کا مقام یہ ہے کہ نواب محسن الملک و شرف الدین صاحب کے ایسے بزرگ نواب سلیم اللہ صاحب کے ایسے پولیٹیکل پیشواؤن کے پیچھے قومی ترقی کی نماز پڑھنے مین تکلف نہین کرتے۔ ان باتون سے اگر کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ مسلمانون کے دل مین پولیٹیکل ترقی کے ابدی اصول ذہن نشین نہین ہوئے ہین - وہ پولیٹیکل واقعات کے رفتار کا اندازہ کرتے ہوے عارضی اور دائمی قوتون مین فرق نہین کر سکتے - میرے ہم وطنو! نواب سلیم اللہ صاحب کی پولیٹیکل حکمت محض مسلمانون ہی کے لئے نہین بلکہ کل ہندوستان کے لئے باعث ننگ ہے - انگریزی حکام چاہے مصلحت کے خیال سے ایسے حضرات کی حرکات پر آفرین کہین مگر وہ دل مین خوش نہین ہو سکتے - وہ اس قوم کے رکن ہین جس نے اپنے خون سے پولیٹیکل آزادی کے چمن کو سینچا ہے اور جس کا یہ اصول ہے کہ جو شخص اپنے حقوق کی حفاظت نہین کر سکتا - وہ اُن حقوق کے حاصل کرنے کا مستحق نہین ہے اگر ان کی نگاہون مین قدر ہو سکتی ہے تو دادا بھائی کے ایسے بزرگون کی جن کی رگون مین پولیٹیکل ترقی کا جوش بجلی کی طرح سرایت کر گیا ہے -

علاوہ ان اصولی کمزوریون کے سر سید مرحوم نے جو روشنی قائم کی ہے وہ اسی حالت مین عملی طور پر عارضی حیثیت سے مسلمانون کے لئے نفع رسان ثابت ہو سکتی ہے جب کہ ہندو ملکی حقوق کی توسیع و حفاظت کے لئے پولیٹیکل معرکہ آرائیون مین مصروف ہین اور اپنے مسلمان ہموطنون کو اس بات کا موقع دیں کہ وہ ان معرکہ آرائیون سے اختلاف ظاہر کر کے حکام کی نگاہون مین سرخ روئی حاصل کرین - برعکس اس کے اگر ہندو بھی باضابطہ بحث و تحریک کے

دائرے سے نکل کر اور ملکی ترقی کی کوشش ترک کر کے مسلمانون کی تحریکون کی بیجا مخالفت شروع کردین تو اُس وقت دونون مین کوئی فرق قائم نہین رہیگا اور حکام کو کوئی وجہ نہین رہیگی کہ وہ مسلمانون کی مصنوعی دلجوئی کی فکر کرین ۔ اور ان کو اس چال سے پولٹیکل تحریکون مین شریک ہونے سے باز رکھین ۔ کیونکہ اِس حالت مین ہندو مسلمانون کی حالت یکسان ہوگی ۔ دونون کا صرف مشغلہ یہ ہوگا کہ باہمی نفاق کی آگ مشتعل کرتے رہین اور پولٹیکل حقوق کی جانب رُخ نہ کرین ۔ اِس لحاظ سے بھی سرسید کی پولٹیکل تلقین پائدار اصولون پر مبنی نظر نہین آتی ۔ ان سب باتون پر غور کرنے کے بعد یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندوستان کی پولٹیکل ترقی کے لئے دادا بھائی کے اصولون کی پیروی لازمی ہے اور آثار زمانہ بتلارہے ہین کہ ہمارے مسلمان ہموطنون مین ایک فرقہ ایسا پیدا ہوگیا ہے جو سرسید کی پولٹیکل نصیحتون کو فراموش کرتا جاتا ہے اور وہ زمانہ ضرور آنے والا ہے جب کہ سلطنت برطانیہ کے سایۂ عاطفت مین تمام ہندو مسلمان دادا بھائی کے پھریرے کے نیچے اپنے پہرے جما کر پولٹیکل ترقی کے منزل مین قدم رکھین گے ۔ ہندوؤن مین اکثر ایسی پر جوش طبیعتین مذہبی تعصب کے نشے مین دادا بھائی کے اصولون سے انحراف کرنے پر آمادہ ہین ۔ ان عاقبت اندیش حضرات کا خیال یہ ہے کہ ہندوؤن کو پولٹیکل اتحاد کی کوشش ترک کر کے مسلمانون کی طرح محض اپنے ہم مذہبون کی ترقی کی کوشش کرنا چاہیے مگر ہمارے دوستون کو مایوس ہونا چاہئے قومی اتحاد و قومی ترقی کی منزلین دشوار گزار ہین ۔ بگڑی ہوئی قسمت ایک دن مین نہین بنتی ہے مسلمان اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کی کوشش کرتے ہین تو اس کی وجہ یہ نہین ہے کہ ان مین فطرتی طور سے ہندوؤن کی مخالفت کا مادہ موجود ہے ۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ابھی مغربی اصول

پورے طور سے اُن کے ذہن نشین نہین ہوے ہین۔ ابھی زمانے کے معلّم نے انہین قومی یگانگت کا سبق نہین دیا ہے لیکن وہ زمانہ بہت قریب نہین ہے تو بہت دور بھی نہین ہے جب کہ یہ زمانہ سازی کا رنگ زمانہ شناسی سے بدل جائیگا۔ دادا بھائی کی کوششین کامل طور پر بارآور ہون گی اور ہندوستان کی تاریخ مین قومی یگانگت کا نیا دور شروع ہوگا۔ ؎

لذّتِ سیر دگر چشم تمنا لے گی ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لے گی

مایوسی کا کوئی مقام نہین ہے۔ سچّائی اور نیک نیتی کی قوتون کو دُنیا مین ہمیشہ فتح ہوئی ہے عارضی ناکامیان مردون کا دل نہین توڑ سکتین۔ دادا بھائی کی عمدہ مثال آنکھون کے سامنے ہے۔ مُدّت العمر کی معرکہ آرائیون مین کیسی کیسی ناکامیابیون سے انھین سامنا ہوتا رہا ہے اور زمانے کے ظالم ہاتھون سے کون کون صدمے انھین پہونچے ہین۔ مگر ان کی ہمّت مین کمی نہین ہے اور اُن کی نورانی پیشانی پر افسردگی کی شکن کا نشان نہین نظر آتا۔ وہ اِس وقت زندگی کے سفر کی بیاسی منزلین طے کرنے کے بعد اپنے حجِ پیری کے نورانی عالم مین فرشتۂ اُمید کے ظہور کے منتظر ہین۔ اُن کو یقین ہے کہ زمانہ ضرور کروٹ لے گا اور ہندوستان کی تقدیر چمکے گی۔ وطن کی محبّت اُن کے لئے مذہبی عقیدے کے درجے تک پہونچ گئی ہے اور دلی جوش خون کے ساتھ رگون مین دوڑ گیا ہے۔ اِس خیال کی پختگی ان کی عظمت کا راز ہے۔ اکثر ایسے نیک نفس انسان ہین جن کے دل رنج و درد کے نظارے دیکھ کر پگھل جاتے ہین اور یہ اُمنگ پیدا ہوتی ہے کہ بیکس کی چارہ سازی کی جائے اور غریب کے زخم پر مرہم رکھا جائے۔ مگر جب دُنیا کے فانوس خیال مین اور اور دلکش تصویرین سامنے آجاتی ہین تو جو اُمنگین درد و غم کے مرقعے دیکھ کر پیدا ہوئی تھین وہ فنا ہو جاتی ہین

اور خود غرضی کے جذبات ذاتی عیش و آرام کے دام مین اسیر کر دیتے ہین یا اکثر عارضی ناکامیابی ہمّت توڑ دیتی ہے اور مایوسی کی زنجیر پنہا کر گوشۂ عافیت مین بٹھا دیتی ہے۔ مگر دادا بھائی کا سوُا وہ سودا نہ تھا جو کہ دُنیا کے آدم فریب عیش و آرام کی ہوا سے دُور ہو جائے یا جس پر یاس و بیم کے جذبات غالب آ جائین۔ یہ وہ سَودا تھا جس کی بدولت اُنھون نے اپنی تمام زندگی ملکی خدمت کے لئے نذر کر دی۔ اپنی راحت کو ملک کی راحت پر قربان کر دیا۔ ملکی افلاس دور کرنے کی کوشش مین اپنی مفلسی کو مفلسی نہ سمجھا۔ اور جو پولیٹیکل (سیاسیات) آرائی شباب مین شروع کی تھی اسے بڑھاپے تک اسی دم خم کے ساتھ قائم رکھا جن کے دلون مین محبت و ہمدردی کے سرچشمے خشک ہو گئے ہین۔ اور قومی حمیّت و غیرت کے شعلے بجھ کر رہ گئے ہین اور جو ذاتی عیش اور ذاتی تجارت کو زندگی کا فرض اولی سمجھتے ہین۔ اُن کی نظرون مین دادا بھائی کی مردانہ اور مسلسل کوششین زیادہ وقعت نہین پیدا کر سکتین مگر جو قومی محبت کے بندے اور قومی خانقاہ کے در کے فقیر ہین اور جن کے دل سنگ و خشت کے نہین بنے ہوئے ہین وہ اس قومی محبت کے پتلے کی عظمت کا اندازہ کر سکتے ہین۔ ؎

حریفِ ناوکِ مژگانِ خونریزم نہ ای ناصح
بدست آور رگِ جانے و نشتر را تماشا کن

پنڈت بشن نراین در

(ماخوذ از "ادیب" جنوری سنہ ۱۹۱۰ء)

باغ جہان مین کھلتے ہین گل کتنے جا بجا
بو بھی نہین سنگھائی ہے جن کی کبھی صبا
کتنے گہر ہین گردِ یتیمی مین مبتلا
آئینے خاک مین ہین پڑے کتنے بے جلا
ہین بے نشان کتنے نگین ہاے نامدار
حیران جن کو دیکھ کے ہو عقل سادہ کار
(آبر)

مین عزیزانِ وطن کی نگاہون کے سامنے ایسی زندگی کا مرقع پیش کر رہا ہون جس کی قدرتی آب و تاب پر مکروہات دنیوی کے گرد و غبار نے پردہ ڈال دیا ہے مگر جس کا حُسن ازلی عقیدت مند آنکھون سے پنہان نہین ہے جو بندگانِ خدا محض دولت دنیا اور شہرت و ناموری کو مآلِ کار ہستی سمجھتے ہین اُن کو اس زندگی کے افسانے مین ایک واقعہ بھی دلچسپ نظر نہ آئے گا لیکن جن علم دوست محبانِ وطن کا یہ خیال ہے کہ انسان کے دل و دماغ مین اکثر ایسے جوہر لطیف موجود ہین جن کا حُسن ذاتی مصنوعی شان و شوکت کی جلا کا محتاج نہین ہے وہ اس حیرت و عبرت کی داستان کو ضرور ادیب کے کانون سے سُنینگے۔

پنڈت بشن نراین صاحب درؔ کی زندگی ایک ایسے مرد قانع کی زندگی ہے جس نے علم کو دولت اور ملک و قوم کی خدمت کو ذریعہ نجات سمجھا اور آزاد خیالی اور بلند نظری کو انسانی شرافت کا معیار خیال کیا۔ جو واقعات ذیل مین قلمبند ہین اُن کو انھین صفات کی تفسیر سمجھنا چاہیے۔ آپ ضلع بارہ بنکی مین ۱۸۶۴ء مین پیدا ہوے۔ ابتدائی تعلیم کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ آٹھ نو برس کے سن مین اُردو فارسی کی ابتدائی تعلیم شروع ہوئی۔ اِس کے بعد اسکول مین انگریزی تعلیم کی بنیاد پڑی۔ انگریزی زبان سے آپ کو کچھ ایسا خلقی اُنس تھا کہ مڈل ہی کی جماعت مین آپ نے علاوہ نصاب تعلیم کی کتابون کے انگلستان کے مشہور مصنف اسمائلس (Smiles) کی وہ نورانی تصانیف پڑھین جو سلف ہلپ (Self-help) اور کیرکٹر (Character) کے لقب سے مشہور ہین۔ ان کتابون کو آپ کے علمی مذاق کی عالی شان عمارت کا بنیادی پتھر خیال کرنا چاہیے۔ انٹرنس مین پہونچکر آپ کے مطالعے کا دائرہ اس قدر وسیع ہوا کہ آپ نے کارلائل ایسے خارا شگاف مصنف کی زبردست تصنیف ہیرو اور ہیرو ورشپ (Hero and Hero-worship) کو بارہا پڑھا اور جزو دماغ کیا۔ اس کے علاوہ اسپکٹیٹر (Spectator) کو بھی بہت پڑھا۔ انٹرنس کی منزل طے کرنے کے بعد لکھنؤ مین کیننگ کالج مین شریک ہو کر ایف۔ اے۔ کی جماعت مین قدم رکھا۔ یہان کالج کا نفیس کتب خانہ کیا ملا گویا پیاسے مسافر کو دریا کا کنارا مل گیا۔ یہان آپ مذہب، اخلاق اور فطرت انسانی کے فلسفے کے متعلق متعدد کتابین پڑھا کئے۔ جن مین مندرجہ ذیل تصانیف خاص شوق کے ساتھ پڑھین۔

(1) Spencer's Study of Sociology.

(2) *Spencer's Essays.*

(3) *Spencer's First Principles.*

(4) *Hume's Essays.*

(5) *Conflict between Science and Religion.*

(6) *Mill's Subjection of Women.*

(7) *Mill's Three Essays on Religion*

آخری کتاب لکھنؤ سے بنارس تک ریل کے سفر مین پڑھ ڈالی - میرے نوجوان دوستو اس علمی شوق کی مجسّم تصویر پر نظر ڈالو اور اپنے مذاق کی پاکیزگی پر غور کرو - اوّل تو نصاب تعلیم کی کتابون کے علاوہ تمہارے لئے دوسری کتاب کا پڑھنا محض خلاف وضع ہی نہین ہے بلکہ کفر مین داخل ہے اور خدا نخواستہ اگر کے یہ کفر اگر کبھی ٹوٹتا بھی ہے تو اُن ادنیٰ درجے کے افسانون کے مطالعے سے جن کا بازار اسٹیشنون پر گرم رہتا ہے - دیکھو اگر ایک ایف - اے - کی جماعت کا طالب علم اپنی دماغی قابلیت کو کافی نشو و نما دیتا ہے تو وہ کارلائل - مل - اور اسپنسر کے ایسے باریک بین اور نکتہ سنج مصنفون کے آسمان فکر سے تارے توڑ لا سکتا ہے - مگر یہ ہو تو کیونکر ہو تم کو پوشاک کی تراش و خراش اور دماغ کے بیرونی حصّے کی آرائش اور بیٹ اور ریکیٹ کی گردش پر وجد کرنے ہی سے فرصت نہین ملتی کہ تم مل اور اسپنسر کی روح پر احسان کرو - پنڈت بشن نراین در کا یہ وتیرہ نہ تھا - آپ طالب علمی کے زمانے مین دماغی مشاغل مین ہمہ تن محو رہتے تھے - اور انگریزی لکھنے مین آپ نے خاص مہارت پیدا کر لی تھی - کالج کی تعلیم کے علاوہ آپ کے

دل و دماغ کی نشو و نما پر ایک اور بہترین اثر پڑ رہا تھا۔ یہ کشمیری کلب کا اخلاقی اثر تھا۔ اِس کلب کے جلسے ہفتہ وار ہوتے تھے جن مین مختلف اخلاقی اور علمی مسائل پر بحث ہوتی تھی۔ اس مرکز اخلاق کا اثر بہت زبردست اور وسیع تھا اور حضرت در خود فرماتے تھے کہ آپ کے گھر کی فطری تعلیم ایسی تھی کہ اگر آپ کلب کے ممبر نہ ہوئے ہوتے تو شاید قومی اور سوشل مسائل کے متعلق آپ اکثر نئے خیالات سے عرصۂ دراز تک بے خبر رہتے۔ غرضکہ کلب کی تربیت اور ذاتی مطالعۂ کتب سے آپ کے خیال روز بروز وسیع اور روشن ہوتے گئے اور آپ کو ولایت جانے کا خیال پیدا ہوا۔ یہ خیال رفتہ رفتہ ترقی کرتا گیا اور کالج کی تعلیم سے طبیعت ہٹ گئی۔ اس عرصے مین امتحان کا زمانہ آیا اور آپ ریاضی کی مدین ناکامیاب رہے اور بی۔ اے۔ کی جماعت مین ترقی نہ پا سکے اِس ناکامیابی نے ولایت کے شوق پر تازیانے کا کام کیا۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ولایت کے نام سے روح فنا ہوتی تھی اور ولایت کا سفر عقبے کے سفر سے کم وحشت ناک نہین کیا جاتا تھا۔ لہذا والدین سے اجازت ملنا ناممکن تھا۔ مگر آپ نے اپنی والدہ ماجدہ کو موافق کر لیا اور بجز دو ایک احباب کے اِس راز سے کسی کو آگاہ نہ کیا۔ اور ایک روز الہ آباد کے سفر کا بہانہ کر کے بمبئی روانہ ہو گئے اور وہان سے ولایت کی راہ لی۔ لندن پہونچکر آپ نے بیرسٹری کی تکمیل کی فکر کی مگر چونکہ قانون سے طبعی مناسبت نہ تھی لہذا اس کو محض ایک معاش کا ذریعہ سمجھا اور اپنا علمی مذاق وہان بھی قائم رکھا۔ ولایت کے تین سال کے قیام کے زمانے مین آپ نے زیادہ تر فن تاریخ فلسفہ۔ اصول پالیٹکس (Abstract Politics) اور سوشیالوجی (تمدن) کے متعلق کتابین پڑھین۔ خصوصاً ذیل کی کتابون پر زیادہ توجہ رہی۔

Herbert Spencer's Works.

Huxley's Essays.

Tyndall's Fragments of Science.

Darwin's Origin of Species.

Mill's Works.

Lecky's Rationalism.

Lecky's History of European Morals

History of Civilization.

Draper's Intellectual Development of Europe.

Sir H. Mayne's Works

Carlyle's Works.

ولایت کے سفر کے قبل کارلائل کی ہیرو ورشپ اور اسپنسر کی سوشیالوجی کا اثر آپ کی دماغی تربیت پر بہت پڑا تھا۔ ولایت مین آپ کو مل کی تصانیف پڑھنے کا زیادہ شوق دامنگیر ہوا۔ آپ فرماتے تھے کہ ولایت مین آپ نے مکالے کی کوئی تصنیف نہین پڑھی بلکہ ہندوستان واپس آنے کے بھی کئی برس بعد اس برق وش مصنف کی سیر کی۔ پنڈت بشن نراین در کو سنجیدہ تصانیف کا مطالعہ ہمیشہ مدنظر رہا۔ افسانون اور ناولون کو بالاے طاق رکھا یعنی ادنےٰ درجے کے ناول تو خارج از بحث ہین۔ پنڈت صاحب موصوف نے ولایت سے واپس آنے کے بعد انگلستان کے جادو

نگار مصنف اسکاٹ کے تاریخی افسانے پڑھے۔ ولایت کی تعلیم سے آپ کا علمی مذاق پختہ ہوگیا۔ اور آپ کو انگریزی ادب اور انگریزی زبان پر وہ عبور حاصل ہوگیا جس کی تعریف آسان ہے مگر تقلید مشکل ہے۔ انگریزی زبان کے مصنفین مین کارلائل۔ مل۔ فرڈ۔ میتھو آرنلڈ۔ ہکسلی مارلی۔ ہیریسن۔ برک زیادہ تر ہمیشہ سے آپ کے پسند خاطر ہین۔ اور شعرا مین شکسپیر۔ بائرن۔ شلی۔ کیٹس۔ ورڈس ورتھ اور ٹینی سن کے چمنستان سخن مین آپ زیادہ گرم سیر رہتے ہین۔ ملٹن کا کلام کم پڑھا ہے اور اُس طرف طبیعت بھی زیادہ مائل نہین ہے۔

ولایت کے اخبارون مین لندن ٹائمس کی نسبت آپ ایک لطیفہ بیان کرتے تھے کہ اس گران قدر اخبار کے نسبت آپ سے ولایت کے قیام کے زمانے مین مسٹر ہنٹنگ نے (جو کہ اب سر رسپی ہنٹنگ ہین) فرمایا کہ اگر " تم کو دریافت کرنا ہو کہ انگریزون کا اصلی خیال کیا نہین ہے تو ٹائمس کو پڑھو"۔

"If you wish to know what the English people do not think, read the Tims."

یہ ایک عجیب فقرہ تھا۔ مگر پنڈت صاحب موصوف کا خیال ہے کہ ایسا کہنا بالکل صحیح نہین ٹائمس مین جمہور کے خیالات کا عکس نہو مگر اس کو اُمرا اور اکابر کے جذبات اور خیالات کا مرقع ضرور سمجھنا چاہیے۔ ولایت کے اکثر اخبارون اور رسالون مین پنڈت بشن نراین نے مضامین لکھے جو وہان وقعت کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ ولایت کے قیام کے پہلے سال مین پنڈت صاحب موصوف کو پولیٹیکل امور مین زیادہ دلچسپی پیدا نہین ہوئی مگر جب ۱۸۸۴ء کے آخر مین مسٹر گلیڈسٹن نے

ہوم رول بل پیش کر کے انگریزون کے پولیٹیکل خیالات کے دریا مین تلاطم پیدا کر دیا تو اُس سے آپ بھی متاثر ہوے اور ہندوستان کے پولیٹیکل حقوق کی حفاظت کے جذبات آپ کے دل مین بھی بیدار ہوے۔ حسن اتفاق سے اُسی زمانے مین مسٹر لال موہن گھوش مرحوم اور مسٹر چندر وارکر بھی ہندوستان کے ادبار و بیکسی پر نوحہ خوانی کرنے کے لیئے ولایت تشریف لے گئے اور مسٹر گھوش موصوف نے پارلیمنٹ کی پولیٹیکل خانقاہ مین اپنا سجادہ قائم کرنے کی فکر کی۔ ان تمام واقعات کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ آپ نے بھی ہندوستان کے پولیٹیکل مسائل کا مطالعہ شروع کیا اور ملکی خدمت کا بیڑا اُٹھالیا۔ ولایت سے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے واپس آنے کے بعد مطالعۂ قانون محض تفنن طبع کی طور پر جاری رکھا اور پولیٹیکل اور سوشل مسائل کی چھان بنان مین ہمہ تن سرگرم رہے۔ آپ کے کتب خانہ مین انگریزی ادب و فلسفہ و اخلاق وغیرہ کی کتابون کی تعداد سیکڑون سے تجاوز کر گئی مگر قانون کی کتابون کا ذخیرہ بہت محدود رہا۔ مین اپنے ذاتی علم سے کہہ سکتا ہون کہ ایک مرتبہ آپ کی خدمت مین نیاز حاصل کرنے کے لیئے جانا ہوا تو یہ تماشا نظر آیا کہ آپ کسی پولیٹیکل یا سوشل مسئلے پر مضمون تحریر فرما رہے ہین اور خدمتگار کو یہ ارشاد ہوا ہے کہ اگر موکل آئے تو اُس سے کہ دو کہ بیرسٹر صاحب گھر پر موجود نہین ہین۔ دنیادار اور زر پرست اس اخلاقی سرگرمی کو نرم سے نرم الفاظ مین جنون اور سخت الفاظ مین حماقت کہین گے۔ مگر جن فدائیان وطن کے دل دردِ محبت سے آشنا ہین اور جن کے سر پر ایثار کے فرشتے کے پرون کا سایہ ہے وہ ضرور اس حب الوطنی کے جوش پر درود پڑھین گے۔ میرے دوستو انسانی عظمت اسی کا نام ہے اور حیات جاودانی کا سرمایہ ایسی ہی زندگی سے حاصل ہوتا ہے مگر حرص و ہوا کے اسیر لوگ

خود پرستی کے شیدا ان روحانی رموز سے واقف نہین۔ فارسی کا اُستاد کہہ گیا ہے؟ ؎

حریفِ ناوکِ مژگان خونریزم نئی ناصح　　بدست آور رگِ جانے و نشتر را تماشا کن

۱۸۸۷ء مین جب کانگرس کا تیسرا اجلاس مدراس مین ہوا تو پنڈت بشن نراین در بھی اُس مین شریک ہوے۔ کانگرس مین شریک ہونے کا آپ کا یہ پہلا موقع تھا۔ لیکن آپ کی تقریر سے کانگرس کے پیر طریقت مسٹر ہیوم ایسے متاثر ہوے کہ اُنھون نے تقریر مذکور کے ایک اقتباس سے کانگرس کی روئداد کی پیشانی کو رونق دی۔

آپ کی پولٹیکل جد وجہد کا سلسلہ جاری تھا کہ ۱۸۹۳ء مین اعظم گڈھ کے ہندو مسلمانون مین گاؤکشی کی بنیاد پر فتنہ و فساد کی آگ مشتعل ہو گئی اور بعض حکّام ضلع کی ناعاقبت اندیشی اور پولٹیکل تعصب کی وجہ سے واقعات نے یہ رفتار اختیار کی کہ ہندوؤن پر سرکاری عتاب نازل ہوا اور متعدد ہندو رئیسون اور زمیندارون کی آبرو خطرے مین آ گئی۔ اِس طوفان کے عالم مین جب کہ سرکاری قہر سے اعظم گڈھ کے در و دیوار بھی پناہ مانگ رہے تھے اور کسی وکیل یا بیرسٹر کی جُرات نہ ہوتی تھی کہ ناکردہ گناہ ملزمون کے مقدمات کی پیروی کرے۔ پنڈت بشن نراین در خود اعظم گڈھ تشریف لے گئے اور وہان کل واقعات کی تحقیقات کر کے ایک معرکہ آرا پمفلٹ مین حکام کی انتظامی بدعنوانیون کا پردہ فاش کیا۔ یہ پولیٹکل معرکہ اِس صوبے کی تاریخ مین یادگار رہیگا۔ اور اُس زمانے مین بنگال کے اخبارون نے لکھا تھا کہ پنڈت بشن نراین در نے وہ کام کیا ہے جس کے لئے اگر اُن کا سونے کا بُت قائم کیا جائے تو بجا ہے۔ اِس پمفلٹ کے علاوہ پنڈت صاحب موصوف نے اکثر طولانی مضامین پولٹیکل اور سوشل مسائل پر مختلف اخبارون مین لکھے ہین جن کے پڑھنے سے یہ واضح

ہوتا ہے کہ آپ نے مغربی ملکون کی تاریخ اور فلسفہ پر کیسا عبور حاصل کیا ہے اور مغربی اصول کی روشنی مین آپ کس آسانی سے ہندوستان کی پولیٹکل اور سوشل گتھیان سلجھانے کی کوشش کرتے ہین آپ کی تحریرین ہمیشہ نہایت فلسفیانہ آزاد خیالی کے جوہر سے معمور ہوتی ہین اور اعلیٰ درجے کی تنقید کا نمونہ ہوتی ہین - جہان تک حسن تحریر کا تعلق ہے اُس کی تعریف میرے قلم کی محتاج نہین ہے - بابو گنگا پرشاد صاحب ورما کہتے تھے کہ مسٹر ڈگبی نے اُن سے ایک مرتبہ فرمایا کہ اس وقت ہندوستان مین دو شخص اعلیٰ درجے کی انگریزی لکھ سکتے ہین - ایک پنڈت بشن نراین در اور دوسرے مسٹر ان - ان - گھوش مرحوم -

ڈاکٹر تیج بہادر سپرو کا بیان ہے کہ جب وہ آگرہ مین کالج مین پڑھتے تھے تو ایک روز مسٹر اینڈروزاُن کے پروفیسر جو کہ خود انگریزی زبان کے ایک عالم متبحر تھے کہنے لگے کہ اگر اس صوبے مین کوئی شخص ایسی انگریزی لکھتا ہے کہ جس کی تحریر پر اہل زبان انگریز کی تحریر کا دھوکا ہوتا ہے تو وہ بشن نراین در ہے - ڈاکٹر صاحب موصوف یہ بھی فرماتے تھے کہ آگرہ کالج کے پرنسپل مسٹر ٹامسن نے اُن سے بسبیل تذکرہ ایک روز کہا کہ جو مضامین بشن نراین در نے آثار زمانہ (Signs of Times) کے عنوان سے تحریر کئے ہین - اگر مین ایسے مضامین لکھتا تو ولایت کے کسی نامی اخبار مین شایع کرتا اور ان کی اشاعت سے میرا نام ہوگیا ہوتا -

پنڈت بشن نراین در کا علمی مذاق محض انگریزی ادب اور انگریزی زبان تک محدود نہین، اُردو اور فارسی شاعرون کا کلام بھی آپ نہایت شوق سے پڑھا کرتے ہین اور آپ کا خیال یہ ہے کہ قومی اور ملکی ترقی کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ اپنے وطن کی قدیم زبانون کو یعنی

اُردو ہندی وغیرہ کی مردہ ہڈیون مین نئی روح پھونکی جائے۔ چنانچہ آپ خود اُردو کے سخن سنج ہین۔ پہلی غزل جو اُردو مین آپنے تصنیف فرمائی تھی اُس کا ایک شعر مجھے اس وقت یاد آگیا۔ وہ شعر یہ ہے۔ ؎

جیب ملک ہین اپنے وطن سے ہم کو اُلفت ہے — تمنائے ولایت کیا کرین ہندوستان ہوکر

بارہ تیرہ سال کا عرصہ ہوا کہ پنڈت للتا پرشاد صاحب بٹ پوری کے یہان لکھنؤ مین دو سال تک مشاعرے ہوا کئے۔ یہ مشاعرے بھی یادرہینگے۔ پنڈت بشن نراین در برابران مشاعرون مین شریک ہوتے رہے اور برابر طرحی غزلین کہتے رہے۔ پہلی ہی جو غزل آپ نے مشاعرے مین پڑھی اس کا ایک شعر بہت مقبول ہوا اور مشہور بھی ہوا۔ ؎

نیّتِ پاک ہی کافی ہو طہارت کے لئے — نہ وضو چاہیے زاہد نہ تیمم مجھ کو

ایک مرتبہ آپ دہلی تشریف لے گئے اور وہان قطب کی لاٹ کی سیر کو بھی گئے۔ اُس خاص موقع پر آپ نے ایک رباعی تصنیف فرمائی۔

رباعی

دُنیا کی عجیب ہم نے ہستی دیکھی — پہونچے جو بلندی پہ تو پستی دیکھی
مینار سے قطب کے جو کی ہم نے نگاہ — اُجڑی ہوئی دلّی کوٹی بستی دیکھی

اُردو شاعرون مین آپ کو آتش و انیس و غالب کا کلام بہت پسند ہے اور انیس کو آپ تمام اُردو شعرا مین ممتاز سمجھتے ہین۔ اور نیز آپ کا یہ خیال ہے کہ اعلیٰ درجے کے اُردو شعرا کی پرواز فکر اکثر بڑے بڑے انگریزی شعرا کی پرواز فکر کا مقابلہ کرتی ہے۔ آپ کے کلام سے چند اشعار تبرکاً

درج ذیل ہین -

قیدیِ دامِ رگِ گل ہون برنگِ تارِ گل — اے صبا آزاد کر دے صورتِ نکہت مجھے
منّ و سلوا مفت کا گر ہو تو ہی مجھکو حرام — ہو ریاضت کی تو نانِ خشک ہے نعمت مجھے

ہر دانے کی کیمیا تھی زمین کل تھی حقیقت — کیون خاک سے دامن کو اٹھائے ہین شجر آج

ہی بیکاری بھی اس خمخانۂ عالم مین بیکاری — جو خالی بیٹھے ہین وہ عمر کا پیمانہ بھرتے ہین

جب نہ سوجھی راہِ حق گم گشتگانِ دہر کو — شیخ کوئی ہو گیا کوئی برہمن ہو گیا

اثر ہو سننے سے کانون کو یا نہ ہو لیکن — جو فرض تھا وہ ادا کر چکی زبان اپنا

ہر اک تھا زیرِ سایۂ دامانِ مادری — کس کو نہین ہی یاد وہ الطافِ گستری
موقوف جب تھی شیر ہی پر جسم پروری — تاثیرِ مادری سے ہو کیونکر کوئی بری
بچون کو مان کی گود بھی مکتب سے کم نہین
اِس مدرسے مین حاجتِ لوح و قلم نہین

ابھی دو تین ہفتہ کا عرصہ ہوا کہ بیماری کی حالت مین آپ نے الموڑہ سے ایک غزل کہہ کر بھیجی ہے۔ دو ایک شعر اُس کے درج ذیل ہین۔ ؎

طریق لطف مہمانی مین یکسان دوست دشمن ہین ۔۔۔ گھر اُس کا ہے یہان جو آشنا بیگانہ آتا ہے
نکل آئے ہین کس وحشت سرا مین تیرے دیوانے ۔۔۔ نظر کو سو دن تلک ویرانہ ہی ویرانہ آتا ہے
ہین مرگ و زیست پردے شعبدہ گر کے تماشے کے ۔۔۔ نظر بندی کا عالم ہے کوئی جاتا نہ آتا ہے

لیکن دس بارہ سال کے عرصے سے آپ کچھ ایسے مکروہات دنیوی سے تنگ رہے جس کی وجہ سے آپ کو پولیٹکل معرکہ آرائیون کے میدان سے ہٹ کر گوشۂ تنہائی اختیار کرنا پڑا اور سوائے مطالعۂ کتب کے آپ کے تمام دماغی مشاغل کا بازار سرد رہا۔ یہی وجہ ہے کہ عرصۂ دراز سے آپ کے اہل وطن آپ کی تحریر و تقریر کے فیض سے محروم رہے اور ملک کے اکثر گوشون سے یہ صدا آیا کی ؎

صد فصل نو بہار گذشت و درین چمن ۔۔۔ بلبل تو نالۂ نکشیدی چہ شد ترا

زیادہ افسوس کا مقام یہ ہے کہ ملک اور قوم کی بدنصیبی آپ کی مسلسل علالت کی شکل مین نمودار ہوئی ہے جس مین آپ چار سال سے گرفتار ہین۔ لیکن اِس عالم مین بھی آپ ملک کی خدمت سے بے خبر نہین ہین۔ لکھنؤ کی پراونشل کانفرنس مین جو آپ نے زبردست تحریر فارم اسکیم کے متعلق پڑھی تھی اس سے لوگون پر یہ آئینہ ہو گیا کہ تپ دق کی جانگزا علالت سے بھی اِس شیر دل اور شیر مرد مدبر کی قوت دماغ اور شان تحریر مین فرق نہین آیا ہے۔ یا جو مضمون آپ کا ۱۲ دسمبر ۱۹۰۹ء کے لیڈر مین نئی کونسل کے قواعد کے متعلق شایع ہوا ہے۔ اُس نے سب کو حیرت مین ڈال دیا ہے اور آپ کی صحت کی ناقابل اطمینان حالت کو دیکھ کر اگر ہم اِس مضمون کو قوت تحریر کا

معجزہ کہون تو نامناسب نہ ہوگا۔ ملک کے پولیٹکل واقعات کی رفتار کا اندازہ آپ اپنی بیماری کے بستر سے کر رہے ہین۔ اور جان مارلی کی نیک نیتی مین آپ کو یقین نہین بلکہ عقیدہ ہے۔ اس وقت اکسٹریمیسٹ یعنی شورش پسند فرقے نے جو ملک مین ہنگامہ حشر بپا کر رہا ہے اس کے نسبت آپ ایک حال کے خط مین تحریر فرماتے ہین۔

"اس وقت کی پولیٹکل شورش کی نسبت میری نہایت مختصر رائے یہ ہے کہ (Anarchy)[1] تو ہر طرح سے قابل گردن زدنی ہے لیکن (Extremism)[2] ابھی ہمارے قوم سے لیے سخت مضر ہے۔ جس قسم کے فائدے ان سے کبھی کبھی بعض ملکون مین ہون لیکن جو میرے نزدیک نہایت مشتبہ ہین وہ بھی ابھی ہندوستان کو ۵۰ برس تک نہین ہو سکتے۔ میرے نزدیک جو بمبئی کے لیڈر ہین انھون نے اس معاملے کو خوب سمجھا ہے اور بہت دانشمندی کی پالیسی اختیار کی ہے۔ بنگال کے بعض لیڈرون کی حالت قابل اطمینان نہین ہے اور ہمارے صوبے والون کو تو انکی کبھی اس معاملے مین تقلید نہین کرنا چاہیے (Moderate)[3] فریق کے اصول بہت عمدہ ہین مگر اُن سے مجھکو یہ خوف ہمیشہ لگا رہتا ہے کہ وہ (too moderate)[4] نہ ہو جائین۔"

طالبعلمون کو آپ خاص محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہین اور متعدد نوجوان آپ کے علمی فیض کے چشمے سے سیراب ہو چکے ہین اور اس وقت تک اپنے کو آپ کا شاگرد خیال کرتے ہین اور فخر کرتے ہین۔ ڈاکٹر تیج بہادر صاحب سپرو۔ ایم۔ اے۔ ال۔ ال۔ ڈی۔ اس صوبے کے تعلیم یافتہ حضرات مین خاص امتیاز رکھتے ہین۔ آپ ایک خط مین تحریر فرماتے ہین۔

---

[1] طوائف الملوکی۔ [2] شورش پسند فرقے کا طرز عمل۔ [3] اعتدال پسند۔ [4] ضرورت سے زیادہ اعتدال پسند۔

"۱۸۹۵ء میں مجھے پنڈت بشن نراین سے دہلی مین چند بار موقع ملاقات کا ہوا اور اس کے بعد مجھے اُن سے ایسی عقیدت ہوگئی جیسے کہ کسی شاگرد کو اُستاد سے ہوتی ہے۔ مین نے اُسی زمانے مین ایم۔اے۔ کا امتحان پاس کیا تھا اور ایم۔اے۔ کے امتحان کے کورس مین میرے زمانے مین مل کی مشہور کتاب لبرٹی (Liberty) مقرر تھی۔ باوجودیکہ مین نے اس کتاب کو نہایت محنت سے پڑھا تھا۔ مگر چند مشکلات مجھے ایسی معلوم ہوتی تھین کہ جن کا جواب مین خود آسانی سے نہین دے سکتا تھا۔ مین نے ایک مرتبہ موقع پاکر پنڈت صاحب سے ان کا تذکرہ کیا ...... مین اپنے تجربے کے بعد یقیناً کہہ سکتا ہون کہ مل کو جس خوبی کے ساتھ پنڈت بشن نراین صاحب نے سمجھا ہے بہت کم ہندوستانیون نے سمجھا ہوگا۔"

اسی صورت پر پنڈت منوہر لال صاحب زتشی ایم۔اے۔ پروفیسر ٹریننگ کالج الہ آباد ایک خط کے خط مین تحریر فرماتے ہین۔

" مجھے یہ کہنے مین کلام نہین ہے کہ پنڈت بشن نراین در نے مجھ کو غور و فکر کا طریقہ بتلایا۔ مجھ کو اُن کی علمی شاگردی کا فخر ہے اور مین اُن کی خدمت مین نیاز حاصل ہونے کو ایک نعمت سمجھتا ہون۔"

میرے دوستو! ابھی تک مین نے بشن نراین در کے دماغی اوصاف کا ذکر کیا ہے لیکن پنڈت صاحب موصوف کی اصلی وقعت و عظمت کا اندازہ وہی حضرات کر سکتے ہین جن کو آپ کی خدمت مین دوستانہ یا شاگردانہ نیاز حاصل ہے۔ میرا یہ کہنا ہرگز مبالغہ مین داخل نہ ہوگا اور آپ کے احباب مجھ سے کلیتاً اتفاق کرینگے کہ پنڈت صاحب موصوف اپنے صفائی قلب۔ حمیت و نیک نیتی

اور صبر واستقلال کے لحاظ سے انسانی عظمت کی تصویر مین یا یون کہون کہ قدرت نے توکل اور استغنا کے پتلے مین کسی یوگی کی روح پھونک دی ہے - اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آپ کے احباب آپ کی پرستش کرتے ہین - جب آپ کے ولایت سے واپس آنے پر کشمیری پنڈتون کے فرقے مین طوفان بے تمیزی برپا ہوا اور آپ کو برادری سے خارج کرنے کا فتوی دیا گیا تو اُس زمانے مین بھی آپ کے دل مین بغض وکینہ کے جذبات جوش مین نہ آئے اور آپ نے اپنے پرجوش مخالفین کی حماقتون کو ہنسی مین ٹال دیا - اور آپ کی اس اخلاقی عظمت یہ نتیجہ تھا کہ کشمیری پنڈتون مین سفر ولایت کا مسئلہ آسانی سے طے ہوگیا - آپ کا ہمیشہ یہی اصول رہا - ؎

وفا سرشت ہون شیوہ ہر دوستی میرا　　نہ کی وہ بات جو دشمن کو ناگوار ہوئی

مگر مین یہ ضرور کہون گا کہ اکثر موقعون پر پنڈت صاحب کا توکل واستغنا درجۂ اعتدال سے گزر جاتا ہے - مثلاً ایک مرتبہ انگلستان کی مشہور فسانہ نگار مسز اسٹیل نے آپ سے یہ درخواست کی کہ آپ اپنے تمام مضامین ہم کو عنایت کرین تاکہ ہم اپنے زیر اہتمام ولایت مین شایع کرائین اور وہان کے انگریزون پر آپ کے خداداد طبعی جوہرون کا اظہار کرین - آپ نے مضامین دینے کا وعدہ تو کرلیا مگر آپ کے پاس آپ کے ایک مضمون کا بھی مسودہ نہ تھا - اب مضمون آئین تو کہان سے آئین - بہرحال آپ کے اکثر احباب آپ کے مضامین جمع کرتے تھے - اُنھون نے جتنے مضامین آپ کے قلم سے نکلے ہوے دستیاب ہوسکے آپ کے حوالے کئے - مگر آپ کے استغنا اور تساہل نے اس امر کی اجازت نہ دی کہ آپ وہ مضامین مسز اسٹیل کو روانہ کردین - اُنھون نے ولایت پہونچکر بہت تقاضے کئے لیکن یہان سے بجز سکوت کے جواب نہ ملا - آخر معلوم

ہوا کہ وہ مضامین آپ سے گم ہو گئے۔ میں یہ ضرور کہونگا کہ آپ کو ذاتی شہرت کا خیال مطلق نہین
ہے۔ لیکن اگر آپ کے مضامین ولایت مین مسز اسٹیل کے اہتمام سے شایع ہو جاتے تو غریب
ہندوستان کا بہت کچھ بھلا ہوتا اور وہان کے انگریز اس تیرہ خاکدان کی بہت سی حالتون سے
واقف ہو جاتے۔ اسی طرح ایک مرتبہ کسی جرمن سائنٹسٹ نے آپ کو ایک خط بھیجا اور اُس
مین یہ درخواست کی کہ آپ مسئلہ نوآت کے متعلق اگر ایک مضمون لکھ کر بھیج دین تو آپ کو
پی، ایچ، ڈی، کا خطاب دیا جائے۔ آپ نے اُس خط کو بھی ردی کی ٹوکری کے سپرد کیا۔
آپ کے دوستون کو اس طرح کی متعدد مثالین یاد ہین جب کہ آپ نے شہرت سے دور
بھاگنے کی کوشش بلیغ فرمائی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جناب موصوف میری اِس نکتہ چینی کی گستاخی
کو معاف فرمائین گے کیونکہ مین ہمیشہ سے آپ کو اپنا محسن اور فرشتہ رحمت خیال کرتا ہون۔ اس
توکل و استغنا کے ساتھ طبیعت مین صبر و استقلال کا یہ عالم ہے کہ تپ دق کی بیماری نے بھی
آپ کی کمر ہمت نہین توڑی ہے۔ آپ کو اپنی بیماری مین محض ایک سائنٹفک دلچسپی ہے اور وہ
وحشت یا خوف جو کہ عام طور پر ایسے مریضون مین پایا جاتا ہے آپ سے کوسون دور ہے۔
مجھے گذشتہ ستمبر مین الموڑہ جانے کا اتفاق ہوا اور آپ کی خدمت مین قریب تین ہفتے کے
نیاز حاصل رہا۔ اِس عرصے مین آپ سے مختلف سوشل پولیٹیکل معاملات پر مباحثے رہا مگر آپ کی
گفتگو کی تازگی مین مطلق فرق نہین پایا۔ نہ آپ کے بشرے سے خوف یا مایوسی کے آثار نمایان
دیکھے۔ برعکس اس کے گفتگو مین وہی قدیم انداز اور ظرافت کی چاشنی کا مزہ موجود تھا۔ ایک
روز ایک طالبعلم آپ سے ملنے آیا جو بیچارہ خود دق وسل کے مرض مین مبتلا تھا۔ اس کی

حالت اچھی تھی مگر حسب معمول وہ کسی قدر مایوسی کی گفتگو کر رہا تھا اور کچھ اس امر پر مجھ سے اور اُس سے بحث ہونے لگی کہ ڈاکٹر جو آلہ لگا کر امراض سینہ کی جانچ کرتے ہیں تو واقعی یہ تشخیص کا طریقہ نہایت مشکل ہے اور محض سانس کی آواز سے پھیپھڑوں کے زخموں کا اندازہ کرنا کارے دارد۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی اور اس طریقہ تشخیص کے غیر مکمل ہونے پر طالب علم مذکور کچھ افسوس اور مایوسی ظاہر کر رہا تھا کہ آپ نے ایک مرتبہ ہنس کر کہا کہ تشخیص کا طریقہ تو بہت اچھا ہے بشرطیکہ ڈاکٹر ہوشیار ہو اور اسی کے ساتھ غالب کا یہ شعر پڑھا۔ ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اس شعر کے پڑھتے ہی سب ہنس پڑے اور مایوسی کا رنگ تازگی سے بدل گیا۔ اور یہی طبیعت کی تازگی ہے جس کو کہ ڈاکٹر بہت اچھی علامت سمجھتے ہیں اور یقین ہے کہ دو ایک مہینے کے عرصے میں تپ رہنا موقوف ہو جائے۔ اور صحت عود کر آئے۔ اطبا کی یہ رائے ہے کہ آپ کے مرض کا زور بہت کم ہو گیا ہے اور عقیدت مند دل یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتے ہیں کہ ؎

لذتِ سیرِ دگر چشمِ تمنا لے گی　　ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لے گی

مگر ابھی مرض پورے طور سے فنا نہیں ہوا ہے اور ضعف اِس قدر قائم ہے کہ ۲۴ گھنٹے بستر ہی کے نذر ہوتے ہیں مگر یہ جسمانی کاہش اس لبرٹیل یوگی کی روح کی تازگی میں فرق نہیں پیدا کر سکتیں اور آزاد دماغ کے آزاد خیالات اپنی اصلی قوت کے کرشمے دکھا رہے ہیں۔ میرے دوستو عبرت کی آنکھیں کھولو اور انسانی عظمت کی پرستش کا کلمہ پڑھو اور یہ دعا کرو کہ آبِ رفتہ پھر جو بن آئے۔ تمہاری دعا مستجاب ہوگی کیونکہ

ع۔ اثر باقی ہے بیکس کی دعا میں

تاریخ

(ماخوذ از رسالہ "تہذیب")

تاریخ ہے معلم باہوش و باخبر ہو اس کے مدرسے مین اگر ایک دم گزر
مضمون طلب وہ جن سے ہو روشن درون بشر عالم جہان کا اور ہی آنے لگے نظر
اُٹھے نقاب دیدۂ وہم و خیال سے
ماضی زیادہ صاف نظر آئے حال سے

تاریخ عقدہاے سلف کی کلید ہے رشتہ یہی میان قریب و بعید ہے
جس کو کہ ہم سمجھتے ہین وضع جدید ہے اس کے لباس کہنہ سے قطع و برید ہے
تاریخ حال اہل سلف کی گواہ ہے
غافل کے واسطے سبق انتباہ ہے

(پنڈت بشن نراین در۔ آبر)

موجودہ تہذیب کا یہ ایک علمی اصول ہے کہ دنیا مین جس قدر رسم و رواج یا علوم و فنون ہین وہ ایک سلسلہ وار ترقی سے ظہور مین آئے ہین۔ فن تاریخ بھی اس حالت سے مستثنیٰ نہین ہے

ابتداے آفرنیش سے موجودہ زمانے تک یہ فن مختلف تہذیبون کے مختلف سانچون مین ڈھلتا چلا آیا ہے - ایک زمانہ وہ تھا کہ جب انسان کو دُنیا مین آئے ہوے بہت کم دن گزرے تھے قدرت کے کارخانے اِس کے لئے معمے سے کم نہ تھے اِس عالم حیرت مین اس کی نگاہون کے سامنے جو حیرت انگیز نقشے گزرتے تھے وہ اِس کے دل پر عجب اثر پیدا کرتے تھے مثلاً وہ دیکھتا تھا کہ کبھی دن بڑے ہوتے ہین کبھی راتین کبھی چاند سورج سیاہی مین چھپ جاتے ہین - کبھی سردی زور شور کے ساتھ اپنا رنگ دکھاتی ہے کبھی گرمی کے موسم کی تپش حد سے زیادہ ترقی کر جاتی ہے - شروع شروع مین وہ قدرت کے کارخانون مین کوئی انتظام یا ترتیب نہین پاتا تھا - ان انقلابات سے متاثر ہو کر وہ دُنیا کی کیفیت تشبیہون اور استعارون کے رنگ مین ایک شاعرانہ طرز پر بیان کرتا تھا - اب بھی جو وحشی قومین باقی ہین ان کی گفتگو تشبیہ و استعارے کے پیرائے مین ہوا کرتی ہے - مثلاً اگر کسی وحشی کو یہ کہنا ہو گا کہ فلان شخص میرا ہمسایہ ہے تو وہ یہ کہے گا کہ اس کے گھر کی پتیان میرے گھر مین اُڑ کر آتی ہین - چنانچہ زمانہ گذشتہ مین بھی وحشی قومون کا یہی رنگ تھا - اِس قسم کے گیت یا نظمین ہر ملک اور ہر قوم کی تاریخ مین موجود ہین جن مین وہ خیالات پائے جاتے ہین جو کہ انسان کے دل مین ابتدائی تہذیب مین پیدا ہوے ہونگے - مثلاً سیارون کو ایک قسم کا دیوتا مانتا ہے - دریاؤن اور پہاڑون کی عظمت و شوکت سے متاثر ہو کر اُن کی پرستش کرتا ہے اور جب اس کے جذبات دلی جوش مین آتے ہین تو وہ اُن خیالات کو شاعرانہ طرز پر ادا کرتا ہے جو کہ نظمون یا گیتون کی شکل مین یادرہ جاتے ہین اور آئندہ نسلون کو ایک ایسی تاریخ کا کام دیتے ہین جس سے اس وقت کی تہذیب اور ترقی کی حالت آئینہ ہو

نظر آتی ہے۔ ایسی نظمون وغیرہ کو جن کو انگریزی زبان مین مائی تھالوجی کہتے ہین خلاف عقل انسانی جان کر بالکل بے وقعت نہین سمجھنا چاہیئے۔ ان سے کامل طور پر تاریخی واقعات کی تشریح نہین ہوتی ہے لیکن اُس وقت کی تہذیب کا بہ حیثیت مجموعی اندازہ ہو سکتا ہے جس وقت کہ نظمین تصنیف ہوئی تھین۔ اور یہ ایسی تحقیقات ہے جو کہ تاریخی تحقیقات کی حد سے کسی حالت مین باہر نہین ہے اس موقع پر یہ کہنا ضروری ہے کہ تاریخی صراحت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو خارجی واقعات کی تصریح ہے جو کہ موجودہ سائنس کے اصولون پر مبنی ہے۔ دوسرے جذبات انسانی کی توسیع و ترقی کی تشریح ہے۔ فن تاریخ کے ابتدائی کارنامون سے ہم خارجی واقعات کی تصریح عمل مین نہین لا سکتے لیکن اُس وقت کے انسانون کے جذبات دلی اور عقائد کا رجحان نہایت آسانی سے دریافت کر سکتے ہین اور اس قسم کے تاریخی کارنامے ایک نہایت اعلےٰ علمی ذخیرے کا کام دے سکتے ہین۔ یہ فن تاریخ کی ابتدائی منزل ہے۔

دوسری منزل مین اِس دلچسپ فن نے ایک نئی صورت پکڑی۔ جب کہ انسان ترقی کے میدان مین دس قدم اور آگے بڑھا اس کا تجربہ وسیع ہوتا گیا۔ دل و دماغ کی پنہان قابلیتین ظہور مین آئین۔ اِس حالت مین تاریخ صرف اُن جذبات و عقائد انسانی کی داستان نہ رہی جو کہ انسان کے دل مین محض قدرت کے عظیم الشان کارخانے دیکھنے سے پیدا ہوے تھے بلکہ اس مین خارجی واقعات کو مثلاً انسانی کارنامون کو بھی دخل ہوتا گیا لیکن یہ واقعات اصلی حالت مین نہین بیان کیئے گئے ہر روایت کے بیان مین خیالی عظمت و شوکت کو بہت کچھ دخل رہا۔ جو عظیم الشان انسان اس دور مین پیدا ہوے ان کی تعریف مین بہت سی داستانین

کہی گئین ۔ کچھ نظم مین کچھ نثر مین ۔ مگر واقعات کی صراحت کا خیال بالکل بالائے طاق رہا۔ اس قسم کی داستانین پڑھنے سے ہم کو ہزارون تاریخی واقعات معلوم ہوتے ہین مگر جیسا کہ پیشتر لکھا گیا ہے ہر واقعے کے بیان مین مبالغے کو بہت دخل ہے ۔ مثلاً لڑائیون کی داستانین اس طرح لکھی گئی ہین جنھین عقل انسانی کبھی قابل اعتبار نہین مان سکتی یا اکثر عظیم الشان انسانون کی تعریف مین مبالغہ درجۂ اعتدال سے گزر گیا ہے ۔ یورپ مین آرتھر[1] ہرکولیز[2] وغیرہ ایسے قدیمی تہذیب کے عظیم الشان انسانون کی مثالین موجود ہین جن کی بہادری اور روئین تنی کی تعریف مین دریا بہا دیئے گئے ہین ۔ ہندوستان مین مہابھارت[3] کے سوربیران[4] کے جواب ہین ۔ ان کی بہادری کی روایتین جس طرز پر لکھی گئی ہین ان سے صاف ظاہر ہے کہ کس قدر مبالغہ آمیز ہین ۔ مہابھارت کے ہرکولیز یعنی بھیم کی نسبت یہ روایت تحریر ہے کہ اس نے غصے کے عالم مین ایک بہت بڑا درخت زمین سے اکھاڑ کر اپنے مخالف کی طرف اس طرح کھینچ مارا جس طرح کوئی تنکا اٹھا کر پھینک دے ۔ گو بادی النظر مین یہ واقعہ خلاف قانون قدرت معلوم ہو لیکن اصل مین یہ ایک بہادر اور قوی ہیکل شخص کی بہادری اور روئین تنی کی مبالغہ آمیز تعریف ہے ۔ اس اصول کو پیش نظر رکھ کر ہم اگر اس قسم کی حکایتون کا مطالعہ کرین تو ہم بہت کچھ تاریخی واقفیت حاصل کر سکتے ہین ۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مبالغہ پسندی کی وجہ کیا ہے ۔ حقیقت حال یہ ہے کہ دنیا مین بڑے بڑے لوگون کی نسبت مبالغہ آمیز

ف۱ انگلستان کا ایک بادشاہ جو چھٹی صدی مین حکمران تھا۔

ف۲ یونان قدیم کا ایک پہلوان جس کو دیوتا کا رتبہ دیا گیا تھا۔

ف۳ ہندوون کی ایک مذہبی کتاب جو شاہنامہ کے طرز پر ہے اور جس مین پانڈون اور کورون کی لڑائی کی داستان بیان کی گئی ہے۔ ف۴ بہادر۔

روایتین مشہور ہو جاتی ہین اور جس قدر زمانہ گزرتا جاتا ہے اس ذخیرے مین اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جن خلاف قدرت کرشمون کا اُنھون نے اپنی زندگی مین کبھی دعویٰ نہین کیا انھین کا وہ مجموعہ بتلائے جاتے ہین۔ مثلاً ہندوستان مین گوتم بدھ نے کبھی اوتار ہونے کا دعویٰ نہین کیا بُت پرستی کے خلاف اِس نے وعظ کہا لیکن برہمنون نے ایک پران بنا کر اُس کو اوتار کا اعزاز بخشا ہے اور اس کے مریدون نے اس کے مرنے کے بعد اس کا بُت پوجنا شروع کر دیا ہے۔ ع

بہ بین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

یا سیوا جی کی مثال بہت نزدیک زمانے کی مثال ہے۔ یہ سب جانتے ہین کہ سیوا جی انسان تھا اس کے وقت کی قابل اعتبار تاریخ موجود ہے لیکن مہراشٹ مین ایک فرقے کا یہ عقیدہ ہے کہ سیوا جی شیو جی کا اوتار تھا اور اس کی پیدایش ایک معجزے کے ذریعے سے ظہور مین آئی تھی۔ اِن واقعات پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان مین چونکہ عظمت و شوکت کی قدر کرنے کے جذبات قدرتی طور پر موجود ہین اس وجہ سے مبالغہ آمیز روایتین بڑے بڑے آدمیون کی نسبت مشہور ہو جاتی ہین۔ یہان تک کہ اکثر ان کی پرستش ہونے لگتی ہے۔ ابتداے تہذیب مین چونکہ یہ جذبات نہایت زور شور کے ساتھ انسان کے دل مین پائے جاتے تھے اور اِس کا عقیدہ غائبانہ روحانی قوتون مین تھا لہذا اُس زمانہ مین جو عظیم الشان انسان گزرے اُس کے مداحون نے اُن کو آسمان پر چڑھا دیا اور اُن کی تعریف مین کوئی دقیقہ اُٹھا نہین رکھا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ مبالغہ پسندی کو عیب نہین سمجھتے تھے اُن کے نزدیک یہ ایک قسم کی

عزت تھی کہ بڑے آدمیون کی صفت مین مبالغے سے کام لیا جائے نیز وہ یہ سمجھتے تھے کہ بزرگون کے کارنامون پر جس قدر خیالی تعریف کی وارنش کی جائے زیبا ہے۔ لہذا جب ہم اس قسم کی روایتین پڑھین تو ہم کو اس امر کا خیال لازمی ہے کہ ہم اصلی واقعات بجنسہٖ نہین پڑھ رہے ہین بلکہ ان واقعات کی وہ تصویر دیکھ رہے ہین جس مین کہ بہت کچھ مبالغے کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ یہ فن تاریخ کی دوسری منزل کی حالت ہے تیسری منزل کی سیر کا راستہ بہت کچھ صاف ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ انسان کو تاریخ کی غرض سے تاریخ لکھنے کی حس پیدا ہوئی ابھی تک اس کا منشا محض جذبات دلی کا اظہار تھا یا بزرگون کی عظمت کرنا نہ کہ تاریخ کی غرض سے تاریخ لکھنا۔ اب وہ زمانہ آیا کہ جب اُس نے گزشتہ و موجودہ واقعات کو یک جا جمع کرنا شروع کیا لیکن یاد رہے کہ اس وقت تک تاریخ نویسی کا مذاق تکمیل پر نہین پہونچ گیا تھا۔ اُس زمانے کی تاریخین محض واقعات کی فہرستین ہین نہ کہ ملک اور سوسائٹی کی حالت کی فلسفیانہ تفسیرین نیز اس وقت تک مبالغے کو تاریخی واقعات لکھنے مین بہت کچھ دخل تھا۔ ہیراڈوٹس[1] یورپ کا اِس رنگ کا پہلا باقاعدہ مورخ ہے اس نے اپنی تاریخ مین اکثر واقعات لکھے ہین جو مبالغے سے پُر ہین یا اسی زمانے کا ایک دوسرا مؤرخ ہے اُس نے صاف الفاظ مین لکھ دیا ہے کہ مین نے اصلی واقعات کے علاوہ بہت کچھ اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے۔ جیسے فردوسی نے شاہنامہ مین صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ ؎

منش کردہ ام رستم پہلوان | وگرنہ یلے بود در سیستان

ہندوستان مین تاریخ نویسی کا مذاق اِس حد سے آگے ترقی نہ کر سکا۔ یہان پرانین وغیرہ موجود

---

[1] یونان کا پہلا مورخ۔

ہین جن کے پڑھنے سے تہذیب قدیم کا حال معلوم ہو سکتا ہے یا کشمیر کی تاریخ کا پتہ اب چلا ہے لیکن کوئی باقاعدہ تاریخ تمام ملک کی موجود نہین - اس مین شک نہین کہ ہندوستان کے قدیم باشندون نے مختلف علوم و فنون مین حیرت انگیز ترقی کی تھی جس کی ثنا و صفت مین یورپ کے محققین تر زبان ہین لیکن فن تاریخ نے یہان نشو و نما نہ پائی - اکثر حضرات کا یہ مقولہ ہے کہ مسلمانون کے دَوران حکومت مین اکثر جابر اور متعصب فرمانرواؤن نے ہندوستان کی کتب تاریخی جلا دین مگر یہ خیال بالکل غلط ہے اور اس قابل نہین کہ اس پر اعتبار کیا جائے - کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کی فلسفہ اور شاعری وغیرہ کا ذخیرہ تو اب تک موجود ہے مگر تاریخی کتابین اس انتظام کے ساتھ جلائی گئین کہ اُن کی خاک بھی سرمے کے لئے نہین ملتی - اصل وجہ یہ ہے کہ فن تاریخ نے اُسی ملک مین زیادہ نشو و نما پائی کہ جس ملک مین نظام معاشرت پولیٹکل اصولون پر مبنی تھا ہندوستان کی حالت جُداگانہ تھی یہان نظام معاشرت کا دار و مدار محض مذہبی اُصولون پر تھا - یہان دُنیا سے زیادہ عقبیٰ کی فکر رہتی تھی اس لئے فن تاریخ کو قابل اطمینان ترقی نہ ہوئی کیونکہ فن مذکور زیادہ تر دنیاوی کارنامون سے تعلق رکھتا ہے - اب فن تاریخ کی چوتھی منزل کا حال ملاحظہ ہو جب انسان مین غور و فکر کی قابلیت نے ترقی کی اور وہ محض عادت کا غلام نہین رہا تو اُس نے واقعات کو صرف سرسری نظر سے دیکھنا ناپسند کیا بلکہ اُن کی رفتار کا بہ حیثیت مجموعی اندازہ کرنا شروع کیا عام اسباب سے عام نتائج اخذ کئے اور ان عام نتائج کی مدد سے چند عام اصول قائم کئے اور ان عام اصولون کو پیش نظر رکھ کر واقعات کی رفتار پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی - اِس دماغی ترقی کے ساتھ نظام معاشرت کی سادگی مین بھی روز بروز فرق آتا گیا اور

زندگی کی داستان پیچیدہ ہوتی گئی - اِس حالت مین تاریخ جب لکھی گئی تو وہ محض واقعات کی فہرست نہ رہی بلکہ اُن واقعات کی اسباب و نتائج کی فلسفیانہ تشریح ہوگئی - اِس قسم کی تاریخ نویسی کی بنیاد یورپ مین پڑی - اِس مین شک نہین کہ عربی فارسی وغیرہ مین اکثر مستند تاریخین موجود ہین مگر ان مین صرف سلطنتون کے کمال و زوال کی داستانین درج ہین مگر سوسائٹی اور مذہب وغیرہ کے پیچیدہ مسائل کا ان مین ذکر نہین ہے - یورپ مین سب سے پیشتر ملک اطالیہ مین میکے ولی[1] نے فلسفیانہ تاریخ کی داغ بیل ڈالی - اس کے بعد جرمنی انگلستان وغیرہ مین ایسے مورخ پیدا ہوے جنھون نے علاوہ معمولی واقعات کے سوسائٹی کے مختلف پہلوؤن پر تاریخ مین نقادانہ نظر ڈالی - آخرکار فرانس مین گیزو[2] نے تاریخ تمدن لکھ کر تمام دنیا کو حیرت مین ڈال دیا - غرضکہ رفتہ رفتہ فن تاریخ ترقی کرتا گیا اور آخرکار تجربے سے یہ ثابت ہوگیا کہ فن تاریخ شاعری اور فلاسفی کا مجموعہ ہے یعنی مورخ کامل وہی شخص ہوسکتا ہے جو کہ فلسفی کا دماغ اور مصور کا قلم رکھتا ہو - دماغ سے واقعات کا فلسفیانہ طور پر اندازہ کرے اور جادو کار قلم سے سوسائٹی کے انداز معاشرت کی تصویر کھینچے لیکن ابھی تک غالبًا یورپ مین بھی کوئی ایسا مؤرخ نہین پیدا ہوا جس مین یہ دونون وصف درجۂ کمال پر پائے جاتے ہون - بالفعل وہان فن تاریخ دو حصون پر منقسم ہے ایک فرقہ ایسے مؤرخین کا ہے جس نے واقعات کی تشریح اور ان کی فلسفیانہ تحقیقات اپنا حصہ کرلیا ہے - دوسرا فرقہ تاریخی فسانہ نگارون کا ہے - اِس قسم کے مصنفین زمانہ ہاے دوردراز کی سوسائٹی کے طرز معاشرت کی تصویر افسانون کے پیرایہ

---

(1) Machiavelli (2) Guizot.

مین کھینچتے ہین - جو شخص کہ پوری طور سے تاریخی واقفیت حاصل کرنا چاہے اُس کے لئے ان دونون قسم کی تصانیف کی سیر ضروری ہے - ہمارے اُردو لٹریچر مین تاریخی تحقیقات کا ذخیرہ بہت کم ہے - یہ بھی انگریزی تہذیب و تربیت کا اثر ہے کہ اکثر بزرگون کو تاریخ لکھنے کا شوق پیدا ہوا ہے مثلاً شمس العلما مولوی ذکاءاللہ صاحب نے اکثر تاریخین لکھی ہین مگر ان تصانیف مین اُس نقادانہ لیاقت سے کام نہین لیا گیا ہے جو کہ فن تاریخ کی شان مین داخل ہے مگر نہ ہونے سے یہ تصانیف بہتر ہین - بیشک اُردو مین ایک ایسی کتاب موجود ہے جس پر کہ سچی تاریخ کا اطلاق ہو سکتا ہے اس کتاب کا نام "دربار اکبری" ہے اور اس کا لکھنے والا ہندوستان کا مشہور مصنف محمد حسین آزاد ہے -

زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کے لئے

"دربار اکبری" مین محض اکبر کے زمانے کے محاربات وغیرہ ہی کا ذکر نہین ہے بلکہ اکبر کے زمانے کی سوسائٹی کا رنگ بھی دکھایا گیا ہے - اِس نامور مصنف سے نظم اُردو کی تاریخ "آب حیات" کے نام سے یادگار ہے - یہ تاریخ بھی اپنے رنگ مین لاجواب ہے -

علاوہ ان نامی مصنفین کے اکثر حضرات نے چھوٹی چھوٹی تاریخین ہندوستان کے مختلف حصون کی لکھی ہین اور ایک حد تک کامیابی بھی حاصل کی ہے - مگر افسوس ہے کہ فن تاریخ کی دوسری شاخ یعنی تاریخی فسانہ نگاری نے ابھی کچھ نشو و نما نہین پائی - یون تو ایسے فسانہ نگارون کا ایک فرقہ پیدا ہو گیا ہے جو اپنے تئین تاریخی فسانہ نگار سمجھتے ہین - مگر

ابھی تک ایک بھی ایسا مصنف نہین پیدا ہوا جو کہ واقعی تاریخی فسانہ نگار کے لقب کا مستحق ہو میری نظر سے اکثر فسانے گزرے ہین جن کی لوح پر یہ لکھا ہوا تھا کہ "یہ تاریخی فسانہ ہے" مگر ایک فسانہ کے پڑھنے سے بھی اس زمانے کی سوسائٹی کے طرز معاشرت کا پتہ نہین چلتا تھا جس زمانے کا اُن فسانون مین ذکر تھا۔ ان مین محض تاریخی واقعات درج کر دیے گئے تھے مگر ان کے مصنف زمانہ دیرینہ کے مردہ قالبون مین جان نہین ڈال سکتے تھے۔ ایک فسانہ مین جو کہ عرب کے متعلق تھا اور جس مین کہ ہزار برس اُدھر کی تاریخ کا ذکر تھا۔ یہ واقعہ نظر سے گزرا کہ کسی شخص نے کسی کو رجسٹری کر کے خط بھیجا۔ حالانکہ عرب مین اب تک رجسٹری کا پتہ نہین ہے۔ ایک صاحب نے اپنے تاریخی فسانہ مین کسی مغربی عورت کے حُسن کی تصویر مین سیاہ اور چمکدار زلفین بھی شامل کر دی ہین۔ حالانکہ مغرب مین سُنہرے اور گھونگھر والے بال ہوتے ہین نہ کہ سیاہ اور چمکدار زلفین۔ ایک بزرگوار نے اپنے تاریخی فسانہ مین جو کہ راجپوتانہ کی سو برس اُدھر کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ راجہ کے محل مین مختلف آرائشون کے علاوہ اپنے دماغ سے گیس کی روشنی بھی پیدا کر دی ہے۔ حالانکہ اُس زمانہ مین گیس کی روشنی کہان۔

اِس تشریح کے بعد یہ ثابت ہو گیا کہ فن تاریخ نے کس طرح ترقی کی اور کیا کیا رنگ بدلے۔ اور جو کچھ مین نے اس حد تک تحریر کیا ہے اسے مین فن تاریخ کی تاریخ کہون گا۔ مذکورالصدر اصولون کو پیش نظر رکھ کر اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کرین تو بہت سی کاوشین رفع ہو جائینگی مثلاً ہم پر یہ امر روشن رہیگا کہ پُرانی کتب مذہبی جنھین کہ ہم تقویم پارینہ خیال کرتے ہین ایک قسم کے تاریخی سرمایہ سے کم نہین جس سے تہذیب انسانی کی ابتدائی حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے

یا مہابھارت الیڈ[1] اوڈیسی وغیرہ ایسی تاریخی تصانیف ہین جن مین ایسی روایتین درج ہین جو کہ مبالغے سے خالی نہین مگر جن کی اصلیت ضرور ہے - علاوہ برین مطالعہ تاریخ مین ہم کو اور چند امور کا بھی خیال لازمی ہے - اولاً یہ کہ تاریخ پڑھنے مین ہم کو اس امر کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ہم صرف ایک کہانی یا داستان نہین پڑھ رہے ہین جس مین بادشاہون کی تخت نشینی یا مرنے جینے کے تذکرے ہین برعکس اس کے ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ مختلف زمانون مین انسانی اخلاق کا کیا معیار رہا ہے جس سے کہ تہذیب کے مختلف درجون کا اندازہ ہو سکتا ہے یا مذہبی انقلابات پر ہم کو غور کرنا چاہیے کہ کون کون مذہبی عقائد مختلف زمانون مین سوسائٹی پر حاوی رہے ہین اور علم طبیعات کی ترقی کے ساتھ ان عقائد مین کیا تبدیلیان پیدا ہوئی ہین اور ان مذہبی انقلابات کے ساتھ سوسائٹی کے سوشل رسم و رواج کا کیا رنگ رہا ہے کون اصول دیرپا ثابت ہوئے ہین اور کن کو زمانے نے فنا کر دیا ہے - اِس انداز پر مطالعہ تاریخ کرنے سے تاریخی زمانہ ہم کو محض ایک داستان غیر مسلسل نہ نظر آئے گا بلکہ ہم پر یہ امر آئینہ ہو جائے گا کہ یہ اخلاقی مذہبی اور سوشل قوتون اور ان کے نتائج کا ایک ایسا سلسلہ ہے جو کہ ازل سے شروع ہوا ہے اور ابد تک قائم رہے گا -

دوسرا امر جس کا خیال مطالعہ تاریخ مین لازمی ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو صرف بڑے بڑے واقعات کو ضروری سمجھ کر حفظ نہ کر لینا چاہیئے - محض بڑی بڑی لڑائیون کی حکایتین یا انقلاب عظیم کی داستانین یاد کر لینے سے ہم سوسائٹی کی اندرونی یا اصلی حالت کا اندازہ

---

[1] الیڈ اور آڈیسی یونان کے مشہور اور قدیم شاعر ہومر کی تصانیف ہین -

نہین کر سکتے ہین - ہم کو زیادہ تر توجہ اُن واقعات پر کرنا چاہیے جو کہ بادی النظر مین غیر ضروری معلوم ہوتے ہین مگر جو در اصل قوم یا ملک کے اخلاق یا عادات پر اثر کرتے آئے ہین - مثلاً علمی ترقی یا جہالت کی طرف سوسائٹی کے رجحان کا اندازہ کرنا افلاس و دولتمندی کی مختلف حالتون پر غور کرنا نہایت ضروری ہے - کیونکہ یہ ایسی نہان قوتین ہین جن سے کہ بڑے بڑے انقلابات ظہور مین آ سکتے ہین - لہذا سوسائٹی کی اصلی حالت دریافت کرنے کے لئے محض عظیم الشان واقعات پر توجہ کرنا ضروری نہین بلکہ اُن نہانی اخلاقی اور علمی قوتون پر غور و تعمق کی نظر ڈالنا چاہیے جن کے زوال و کمال کے ساتھ ملکون اور قومون کے زوال و کمال کی داستانین وابستہ رہی ہین - اکثر لوگون کا یہ خیال ہے کہ دین اسلام کو جو کچھ فروغ ہوا ہے وہ تلوار کے زور سے ہوا ہے جس کے یہ معنی ہین کہ یہ عظیم الشان مذہب محض جبر سے پھیلایا گیا ہے ایسا خیال محض تاریخ اسلام کے سطحی نظارے سے پیدا ہو سکتا ہے - جن لوگون نے عمیق نظر سے عروج اسلام کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہین کہ اسلام کے فروغ کی بانی ایک زبردست اخلاقی قوت تھی جو کہ رسول عربی کی تلقین سے ظہور مین آئی تھی اور جس نے عرب کے جاہل وحشیون کو سرفروش اور توحید پرست مسلمان بنا دیا تھا - مسلمان ایمان پر جان و دولت قربان کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے اور یہی زبردست قوت اخلاقی تھی جس نے اسلام کا سکہ دُنیا مین جاری کر دیا - اسی طرح اکثر حضرات کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان مین مرہٹون کو جو کچھ عروج حاصل ہوا ہے وہ محض لوٹ مار کی بدولت حاصل ہوا ہے اور سیواجی محض ایک زبردست لٹیرا تھا لیکن اگر نظر غور اور انصاف سے مرہٹون کی حیرت انگیز ترقی کی داستان

پڑھی جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ مرہٹون کے سینون مین حب الوطنی کی آگ روشن تھی اور وہ محض ذاتی عروج و فائدے کے لئے نہین لڑتے تھے بلکہ اپنے ملک پر اپنی جان قربان کرتے تھے اور یہ زبردست اخلاقی قوت سیواجی کی بہادری اور جان نثاری سے پیدا ہوگئی تھی جن صاحبون نے جناب راناڈے[1] مرحوم کی وہ لاجواب کتاب پڑھی ہے۔ جس کا نام "عروج سلطنت مرہٹہ" ہے۔ وہ میرے اس دعوے کی تائید کرین گے۔ مُرا دان مثالون کے پیش کرنے سے یہ ہے کہ محض بڑی بڑی انقلابی حالتون کے ظاہری عنوان تک مطالعہ تاریخ مین نظر نہ محدود رکھنا چاہیئے۔ بلکہ ان انقلابات کے اسباب باطنی بھی تلاش کرنے چاہییں۔ مطالعہ تاریخ مین اس بات کی بھی سخت ضرورت ہے کہ ہر واقعے کا اندازہ تحقیق و تنقید کی نظر سے کیا جائے کیونکہ اگر کسی قسم کے تعصب سے کام لیا گیا تو واقعات کی تشریح سے کبھی قابل اطمینان نتیجہ نہین نکل سکتا بلکہ نتائج کی صحت مین فرق آجانے سے اُلٹا سبق گمراہی کا ملتا ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بالفعل ہندوستان مین تاریخی مطالعے کے وقت بہت کچھ تعصب سے کام لیا جاتا ہے۔ یہان رسم ورواج دیرینہ کی پابندی کی بیڑیان ایسی مضبوط ٹھکی ہوئی ہین کہ ہر پرانی بات کو عزت کی نگاہ سے دیکھنا اصول اخلاق سمجھا جاتا ہے اس کا اثر مطالعۂ تاریخ پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً اکثر حضرات کا یہ شیوہ ہے کہ جب وہ قدیم ہندوستان کی تاریخ پڑھتے ہین تو اُن کی محض یہ غرض رہتی ہے کہ جو واقعات کہ پُرانے ہندوؤن کے اخلاقی یا علمی اعزاز کے شاہد ہون اُن کی تشہیر کی جائے اور "پدرم سلطان بود" کا غلغلہ

---

[1] مہادیو گوبند راناڈے بمبئی ہائیکورٹ کے جج اور اُنیسوین صدی مین ہندوستان کے سربرآوردہ لوگون مین تھے۔

بلند کیا جائے اور اگر کسی طرح یہ ثابت ہو جائے کہ قدیم ہندوستان مین بھی ریل اور تار برقی کا سامان موجود تھا تو پھر کیا کہنا ہے اور جب اس وضع کے حضرات کو کسی ایسی لغزش کا سامنا ہوتا ہے جس سے کہ ہندوستان کے قدیم باشندون کو کسی اخلاقی یا سوشل بدعنوانی کا ثبوت ملتا ہے تو یہ فکر پیدا ہوتی ہے کہ کسی طرح ان واقعات پر خاک ڈال دی جائے یا اکثر بانیان اصلاح نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جب کسی اصلاح کی عمل مین لانے کی کوشش کرتے ہین تو اختلاف کی شورش سے بچنے کے لئے یہ چال چلتے ہین کہ تاریخی واقعات توڑ مروڑ کر لفظی شعبدہ پردازی سے یہ ثابت کر دیتے ہین کہ ہم کوئی نئی بات نہین کہتے ہین بلکہ ایک پُرانی رسم تازہ کر رہے ہین۔ مثلاً ایک بزرگوار پردے کے خلاف ہین اُنھون نے اپنے دلائل مین اس بے بنیاد تاریخی تصرّف کو بھی شامل کیا ہے کہ مسلمانون مین کبھی پردے کی رسم نہ تھی ہندوستان مین چین سے پردہ آیا اور ہندوؤن سے مسلمانان ہند نے پردے کی رسم سیکھی۔ حالانکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ ایسی کوئی قابل وقعت تاریخی شہادت نہین موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہو کہ ہندوستان نے چین سے پردہ اُڑایا اور مسلمانون پر ابر کی طرح چھا گیا۔ اسی طرح کی اور مثالین موجود ہین مگر یاد رہے کہ اصلاح قومی کی عالی شان عمارت ایسی سُست بنیاد پر تیار کرنا خالی از اندیشہ نہین ہے۔ اِن خدا کے بندون سے کوئی پوچھے کہ قومی اصلاح کی کوشش مین ایسا ”دروغ مصلحت آمیز“ شامل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا ہمارے بزرگ انسان نہ تھے؟ کیا اُن کی تہذیب فرشتون کی تہذیب تھی کہ اس مین نقص دریافت کرنا کفر مین داخل ہے۔ اِن سب باتون کو چھوڑ کر ہمارا فرض یہ ہے کہ تاریخ کا مطالعہ تحقیق و

تنقید کی نظر سے کرین جو لغزشین اپنے بزرگون کے نظام معاشرت مین دیکھین ان سے عبرت حاصل کرین اور اُن کے تجربے سے فائدہ اُٹھائین ۔ سب سے زیادہ ضروری اصول مطالعۂ تاریخ کی نسبت یہ ہے کہ ہمین اپنے ملک یا قوم کی تاریخ کو کل دنیا کی تاریخ سے الگ نہ سمجھنا چاہیے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے ملک یا قوم کی تاریخ اُس عظیم الشان تاریخ کی ایک شاخ ہے جو کل بنی نوع انسان کی تہذیب و ترقی کی داستان ہے اور جس کا سلسلہ زمانۂ قدیم مین دور تک پہونچتا ہے ۔ اگر غور سے ہم تاریخ ماضیہ پر نظر ڈالین تو ہم پر ثابت ہو جائیگا کہ ہماری موجودہ حالت اُن ہزارون اخلاقی اور علمی قوتون کی مدد سے ظہور مین آئی ہے جو کہ ابتدائے آفرینش سے اب تک مختلف ملکون اور قومون مین کام کرتی آئی ہین ۔ ہزارون دل و دماغ تحقیقات علمی کے لئے وقف ہو گئے ہین جنھون نے مختلف ملکون اور مختلف قومون مین مختلف زمانون مین تہذیب کی شمع روشن رکھی ہے اور ایک ملک کا چراغ دوسرے ملک سے جلا ہے ۔ مثلاً اُس زمانے کی سیر کرو جب کہ وادی انڈس مین تہذیب کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا چین مین علم و فن کی ترقی ظہور مین آ رہی تھی ۔ بابل مین تہذیب اپنا ابتدائی رنگ جما رہی تھی ۔ پھر اُس زمانے کی تصویر اپنی آنکھون کے سامنے کھینچو جب کہ اُن مختلف تہذیبون مین تعلقات باہمی شروع ہوے ۔ مختلف علم و عقل کے کارنامے اور صنعت و حرفت کے نمونے ایک ملک سے دوسرے ملک مین پہونچے ۔ غرضکہ اسی طور سے دُنیا روز بروز ترقی کرتی گئی ۔ آج ہمارے سامنے تہذیب کے وسیع باغ ہین مختلف رنگ کے مختلف پودے اپنی اپنی بہار دکھلا رہے ہین اور ہمارے دلون کو سرور اور آنکھون کو نور بخش رہے ہین ۔ ان مین ایسے پودے بہت کم ہین کہ جنھون نے

ابتداے آفرینش سے اب تک ایک ہی سرزمین کی آب وہوا مین نشو ونما پائی ہو۔ برعکس اسکے ہر ایک پودا ایسا ملے گا جس مین کسی دوسرے ملک کے پودے سے لاکر قلم لگائی گئی ہے۔ دیکھو آج علم ہندسہ کس ترقی پر ہے اہل یورپ نے اس مین کیا کیا باریکیان پیدا کی ہین۔ اب اگر اس کی تاریخ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوجائے گا کہ اہل یورپ نے اہل عرب سے حاصل کیا ہے اور اس کی ایجاد کا سہرا ہندوستان کے سر ہے جہان سے اہل عرب نے اسے سیکھا۔ ہر گھنٹے کے ساٹھ منٹ اور ہر منٹ کے ساٹھ سکنڈ پر تقسیم اہل بابل کا ایجاد ہے۔ آتش فشان آلات حرب کی صنعت اہل یورپ کے ساتھ مخصوص سمجھی جاتی ہے۔ مگر اصل مین اہل چین ان کے موجد ہین کیونکہ بارود چین ہی کا ایجاد ہے فن جہازرانی آج کس ترقی پر ہے اس کے لئے بھی ایک معنی مین اہل چین کا شکریہ لازم ہے کیونکہ قطب نما پہلے اُنھون نے بنایا۔ دور کیون جاؤ یورپ کی موجودہ تہذیب بہت کچھ اہل عرب کے احسانون سے گرانبار ہو۔ سب جانتے ہین کہ یورپ مین پہلی یونیورسٹی مسلمانون نے قائم کی اور مسلمانون ہی نے پہلی رصدگاہ وہان بنائی۔

اسی طرح اور بہت سی مثالین مل سکتی ہین۔ غرضکہ اِس صورت پر تاریخی واقعات کا اندازہ کرنے سے یہ آئینہ ہوجاتا ہے کہ ہماری موجودہ تہذیب کل پُرانی تہذیبون کا عطر ہے اور یہ ایسا اصول ہے جو تنگ خیالی اور کم نظری کے فنا کرنے کے لئے جادو کا اثر رکھتا ہے۔ اکثر ہندو مسلمانون کے جھگڑے "پدرم سلطان بود" کے ناز بیجا پر قائم ہین۔ ہندو کہتے ہین کہ ہم نے عادات بد مسلمانون سے سیکھے۔ اور مسلمان کہتے ہین کہ ہم نے ہندوؤن کو اخلاق حسنہ سکھائے ہین۔ اُن سے کچھ نہین سیکھا ہے۔ مگر دونون فرقون مین جن لوگون کی نظر وسیع اور جن لوگون کے دماغ علم تاریخ کے نور سے روشن ہین وہ جانتے ہین کہ ہندو بہت سی خوبیون کے لئے مسلمانون کے احسان مند ہین اور مسلمان ہندوؤن کے

جناب رانا ڈے مرحوم نے لکھنؤ مین سوشل کانفرنس کے موقع پر جو تقریر فرمائی تھی اس مین ثابت کر دیا تھا کہ ہندوؤن نے انتظامی قابلیت اور قومی یگانگت کا اصول مسلمانون سے سیکھا اور دماغی اور روحانی ترقی کا سبق مسلمانون نے ہندوؤن سے - ان واقعات پر غور کرنے سے اُن کاوشون سے نجات مل سکتی ہے جو کہ جہل و تعصب کی وجہ سے دلون مین پیدا ہو گئی ہین -

قصہ مختصر عالم تاریخ کی سیر بھی عجیب روحانی سرور کا سرمایہ بہم پہونچاتی ہے اور آئینۂ عقل کو جلا دیتی ہے - اِس عالم مین قدم رکھتے ہی تجربے کا آفتاب نور افشان نظر آتا ہے جس سے دل کی آنکھین روشن ہوتی ہین - اِس عالم مین تہذیب و ترقی کی وہ زبردست شاہراہ نظر آتی ہے جس کا ایک کنارا ازل ہے اور دوسرا ابد جس کی ہر منزل پر فیض کے چشمے جاری ہین کہین وہ بزرگ اپنی خانقاہون مین بیٹھے ہوے نظر آتے ہین جنھون نے مذہب و فلسفہ کی تحقیق مین اپنی عمر صرف کر دی ہے اور طبع نورانی سے ایسے چراغ روشن کر گئے ہین جنھین ہواے مخالف کے جھونکے نہین بجھا سکتے اور جن کی روشنی مین اب تک بہت سے گمراہ منزل مقصود تک پہونچ جاتے ہین کہین وہ بزم جادو آراستہ نظر آتی ہے جس مین بڑے بڑے سحر نگار نثارون اور شاعرون کا مجمع ہے - نکتہ سنجیون کے گلدستے مہک رہے ہین اور شراب سخن کا جادو چل رہا ہے - کہین اُن قوی ہیکل اور ضیغم منش جوانون کی پُر رعب صورتین دکھائی دیتی ہین جن کی چتونون سے شجاعت کا نور برس رہا ہے اور جن کی تلوارون کے پانی سے اب تک مختلف قومون کے اعزاز و وقار کا چمن ہرا ہو رہا ہے - اسی طرح عالم تاریخ مین ہر علم و فن کے باکمال حضرات کی زیارت کا موقع ملتا ہے اور لطف یہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ شخص عظیم الشان انسانون کی صحبت مین بلا تکلف شریک ہو سکتا ہے اور اپنی قابلیت کے مطابق فیض حاصل کر سکتا ہے -

ذات کی تفریق

(ماخوذ از "زمانہ" جولائی و اگست سنہ ۱۹۰۴ع)

اس مین شک نہین کہ ہندوستان مین ذات کی پابندی کا خیال ایک بہت بڑی اخلاقی قوت ہے جس کا اثر قریب قریب ہمارے نظام معاشرت کے ہر صیغے مین پایا جاتا ہے قبل اس کے کہ اس رواج دیرینہ کے متعلق اصولاً بحث کی جائے۔ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ابتدائی حالت اور اصل بنیاد کی نسبت کچھ عرض کیا جائے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ذات کی تفریق کی بنیاد قدیم زمانے کے سوسائٹی کی تین مختلف حالتون کا نتیجہ ہے۔ اوّل قومی اختلاف۔ دوّم پولیٹکل اختلاف تیسرے پیشہ کا اختلاف۔ جب قدیم زمانے مین آریا لوگون نے ہندوستان کے اصلی باشندے نیم مہذب وحشیون پر حکومت کا سکہ جمایا۔ اُسی وقت سے ذات کی تفریق کی بنیاد پڑ گئی۔ سُرخ و سفید آریا لوگ فاتح قوم کے غرور و نخوت مین ڈوبے ہوے اپنے محکوم سیاہ فام وحشیون کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور یہ طبیعت انسانی کا مقتضا ہے گویا یہ نیم مہذب وحشی اُس وقت کے "کالے آدمی" تھے۔ لہذا سب سے پیشتر اس شرف قومی سے جو کہ اختلاف قومی کا نتیجہ تھا۔ ذات کی تفریق کی بنیاد پڑی۔

جب ایک مرتبہ یہ تفریق ظہور میں آئی تو اس کا اثر پولیٹکل تعلقات پر پڑنا لازمی ہوا۔ پولیٹکل حقوق کی کمی بیشی سے اس تفریق کی بنیاد اور مضبوط ہو گئی۔ اس پولیٹکل تفریق کے بعد پیشون کی تفریق وجود میں آئی اور اس سے اُس اُلجھاؤ کو ایک اور پیچ دیدیا۔ اصل میں آخری تفریق نے ذات کی پابندی کا رنگ بہت چوکھا کر دکھایا۔ یہ سب جانتے ہین کہ اگلے وقتون مین شاہ وقت خدا کا سایہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کو جیسا کہ اپنی رعایا کی پولیٹکل حالت پر اختیار حاصل تھا ایسا ہی سوشل اور اخلاقی حالت پر بھی اس کا فرمان احکام الٰہی کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اِس صورت مین شاہ وقت نے جس کے لئے جو پیشہ تجویز کیا وہ خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا پیشہ تھا

مختلف پیشون کے لوگ سمجھنے لگے کہ اُن کی سوشل حالت خاص مشیت ایزدی پر مبنی ہے اور اس سے ایک قدم ہٹنا کفر ہے۔ رفتہ رفتہ اس عقیدے پر کچھ مصلحت وقت اور کچھ خود غرضی کے لحاظ سے مذہبی وارنش ہوتی گئی۔ اور لوگ سمجھنے لگے کہ چار ذاتین ازل سے موجود ہین اور ابد تک قائم رہینگی۔ اب ان چار شاخون مین اور کونپلین بھی پھوٹنی شروع ہوئین اور وہ تخم جو کہ اختلاف قومی نے بویا تھا اُس نے ایسی نشو و نما پائی کہ ایک بڑے درخت کی طرح پھیل کر ہند پر چھا گیا اور تمام ہندو قوم کو اپنے سائے مین لے لیا۔ اب ان چار ذاتون سے ہزارون فرقے پیدا ہو گئے۔ ان فرقون کی پیدایش اس طرح ظہور مین آئی کہ جب کسی ذات کے چند افراد زمانے کی تفرقہ پردازی سے اپنے اصلی مخرج سے جدا ہو کر کسی دور دراز مقام پر پہونچ گئے اور ان کا سلسلہ اپنی قدیمی سوسائٹی سے بالکل منقطع ہو گیا تو اس حالت مین ان مین چند اوصاف ایسے پیدا ہو گئے جو کہ ان کی اصلی سوسائٹی کے قوانین اور طرز

معاشرت سے جُدا گانہ تھے۔ اب اُن کی نئی سوسائٹی کی رنگت ہی اور ہوگئی جس کو اُنھون نے نئے فرقے کے نام سے منسوب کرلیا۔ مثال کے طور پر کشمیری پنڈتون کا فرقہ اس بیان کی تائید کرتا ہے۔ ایک زمانہ گذرا جب کہ چند کشمیری برہمن آوارہ وطن ہوکر پنجاب اور ممالک مغربی و شمالی مین آباد ہوے۔ ان کا سلسلہ اپنی قدیمی سوسائٹی سے بالکل ترک ہوگیا یہان مسلمانون کی صحبت نے ان کے رسم و رواج۔ خیالات۔ پوشاک وغیرہ پر اسلامی تہذیب و تربیت کا اثر ڈالا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی قدیمی حالت بالکل بدل گئی اور ایک چھوٹا سا فرقہ ایسا پیدا ہوگیا جو کہ کشمیر مین شادی کرنا خلاف شان سمجھنے لگا اور اپنے عزیزان وطن کو ذلت کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اگر انگریزی تعلیم کو ترقی نہ ہوتی اور سفر کی آسانی کی وجہ سے باہم سوشل تعلقات کی صورت نہ پیدا ہوجاتی تو ایک زمانہ وہ نہ آتا کہ یہان کے کشمیری پنڈت کشمیر کے برہمنون سے خورونوش بھی ترک کردیتے اور بالکل ایک نئے فرقے کی شکل پکڑ لیتے۔ یہی واقعات پُرانے زمانے مین بھی پیش آئے۔ چونکہ اس زمانے مین مذہب کا زیادہ زور تھا لہذا ایسے اختلافات پر مذہبی رنگ و روغن چڑھایا گیا اور خور و نوش کی پابندی بھی لازمی سمجھی گئی۔ قیود ذات کی ماہیت موجودہ تہذیب کے اصولون اور فلسفیانہ تحقیقات کے مطابق جو کہ یورپ کے محققین کی جانفشانی کا نتیجہ ہے اسی طرح بیان کی گئی ہے۔ اب مین اصل منشائے مضمون کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتا ہون۔

اس مین شک نہین کہ ذات کی پابندی ہماری موجودہ ترقی کے میدان مین سنگ راہ ہوتی ہے۔ قبل اس کے کہ ان نقصانات کا ذکر کیا جائے جو کہ ہندو قوم کو اس کی وجہ سے براہ راست

یا بالواسطہ پہونچے ہین یہ مناسب ہے کہ ان خیالی فوائد کی تردید کی جائے جو کہ معاونین ذات اس کے کارآمد ہونے کی تائید مین پیش کرتے ہین - اولاً بہت بڑی دلیل جو کہ ذات کی پابندی کے طرفدار پیش کرتے ہین وہ یہ ہے کہ یہ رواج دیرینہ سوسائٹی کی سوشل حالت پر ایک اخلاقی پولیس یا محافظ کا کام کرتا ہے - یعنی ذات کے قوانین پر نظر رکھنے سے انسان ممنوعات مین دخل نہین دے سکتا اور سوسائٹی کی اخلاقی حالت اس کے ذریعے سے معرض خطر مین نہین آسکتی اس مین شک نہین کہ یہ اصول ایک حد تک درست ہے لیکن موجودہ واقعات اور زمانے کی رفتار کے لحاظ سے اگر کوئی شخص یہ کہے کہ واقعی اب تک یہ حفظ اخلاق کا اصول فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے اور اس کے خراب اثر نیک نتائج سے زیادہ نہین ہین تو یا تو وہ راسخ الخیال نہین ہے یا اس کا دماغ کافی طور سے وسیع نہین ہے - گو کہ یہ الفاظ اکثر حضرات کو ناگوار معلوم ہون - لیکن اُن کے درست و صحیح ثابت کرنے کی کوشش آیندہ حصہ مضمون مین کی جائے گی -

جس وقت ہم یہ کہتے ہین کہ ذات کی پابندی ایک قسم کی سوشل پولیس یا محافظ ہے تو ہم کو یہ خیال کرنا چاہیے کہ اس کا اصل مطلب کیا ہے - یعنی یہی ایک ایسا ذریعہ ہے کہ جسکی مدد سے سوسائٹی کے ہر ممبر کی ذات پر عام رائے کے لحاظ سے ایک قسم کی اخلاقی بندش ہوتی ہے - مگر یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ عام قواعد جو کہ اِس عام رائے کا نتیجہ ہین اور جن کا برتنا سوسائٹی کے ہر ممبر پر فرض سمجھا جاتا ہے کن جزوی اصولون پر مبنی ہین - اولاً بہت سے اصول جن پر کہ قیود ذات کا دارومدار ہے زمانہ قدیم کی رفتار کے بموجب اختیار کیے گئے تھے - دیگر قیود جو کہ اتنے قدیم نہین ہین وہ دقیانوسی خیالات کے ہندون کے مذہبی عقائد اور تعصبات پر مبنی ہین

لہذا ثابت ہوا کہ ذات کے قیود مین کوئی ایسا جزو نہین ہے جو کہ موجودہ ترقی کا حامی ہو میرا مطلب اس دلیل سے یہ نہین ہے کہ ہم مین کوئی ایسا معمولی خیالات اور تعلیم کا شخص نہین ہے کہ ان بندشون سے فائدہ نہ اُٹھا سکے جو کہ ذات کے قیود مین شامل ہین - بلکہ میرا اصل منشا یہ ہے کہ یہ بندشین اُن لوگون کے حق مین سخت مضر ہین جن کا تعلیم یافتہ اور ترقی خواہ فرقے مین شمار ہے یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ دُنیا مین جب کبھی اور جہان کہین کوئی نئی بات رائج کرنے کی کوشش کی گئی ہے سخت اختلاف پیش آیا ہے - مگر ہندوستان مین سب سے زیادہ دقّت کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ یہان بانیان اصلاح یا ریفارمرون کو ایسی سخت سزا دی جاتی ہے کہ اصلاح کے مخالف اس سے زیادہ سخت سزا دے نہین سکتے اور وہ سزا اخراج قومی کی ہے ذات سے خارج ہونے کا ڈر لوگون کے دلون مین ایسا سمایا ہے کہ بڑے بڑے روشن دماغ اور عالی خیال جو کہ دل سے اصلاح اور ریفارم کے حامی ہین ذراسی نئی بات پر عمل کرنے مین جان چُراتے ہین - قوانین ذات اخلاقی اور سوشل اصلاح عمل مین لاتے ہوئے بڑی بڑی دقتین لاحق کرتے ہین - اور یہ کہنا کہ قوانین ذات انسان کو ممنوعات مین دخل دینے سے روکتے ہین سراسر خلاف واقعات ہے ہزارون ہندو ایسے موجود ہین جو کہ شراب خواری اور عیاشی مین لاکھون روپیہ تباہ کرتے ہین یا سیکڑون برہمن مسلمان عورتون سے ناپاک تعلقات پیدا کرتے ہین - پُرانے بزرگ اس قسم کی زندہ یادگارین چھوڑ گئے ہین - پھر یہ باتین چھپا کر نہین کی گئی ہین بلکہ طشت از بام ہین - ان گناہون کے مرتکب اقبالی مجرم ہین مگر اُنھین کوئی قوم سے خارج نہین کرتا - ہان اگر کوئی غیر برہمن کے ہاتھ کا پکّا ہوا کھانے کی اصلاح پیش کرے تو اُس کی گردن نا انصافی کی کُند چھری سے رینتنے کو سب

سب آمادہ ہوجاتے ہین ۔مطلب یہ ہے کہ حفظانِ اخلاق کا خیال تو بالاے طاق رکھا جاتا ہے ۔صرف بانیان اصلاح کے خلاف جہان اور شورشین برپا کی جاتی ہین وہان خارج کرنیکا خوف بھی دلایا جاتا ہے ۔

اکثر اصحاب کا یہ قول ہے کہ ذات کی تفریق کسی نہ کسی شکل مین ہر جگہ موجود ہے ۔ وہ انگلستان کی نظیر پیش کرتے ہین یعنی اُن خیالی تعصبات کا اشارہ کرتے ہین جو کہ وہان کے امرا مین اوسط درجے کے لوگون کے خلاف پائے جاتے ہین یا وہ اعزاز و مرتبت کا فرق جو کہ اوسط درجے کے لوگون اور مزدور پیشہ فرقے مین ہے لیکن یہ خیال رہے کہ یہ اختلاف جو انسانی طبیعت کا مقتضی ہے درجۂ اعتدال سے گزر نہین گیا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ امیر آدمی غریب کی سوسائٹی مین شامل ہونا پسند نہین کرتے ۔ مگر ہر انگلستان کے باشندے کے دل پر یہ اصول نقش ہے کہ اگر ذلیل سا ذلیل انگریز اپنے جوہر ذاتی سے اعزاز حاصل کرنا چاہے تو وہ وزیر اعظم کے درجے تک پہونچ سکتا ہے اور رؤسا و امرا کے ساتھ خورو نوش مین شریک ہو سکتا ہے ۔مگر ہندوستان مین یہ بات کہان نصیب یہان تو شودر کیسا ہی اعزاز کیون نہ حاصل کرے مگر ہندو سوسائٹی کے اصولون کے موافق کبھی وقعت کی نگاہ سے نہین دیکھا جا سکتا ۔لیکن اب یہ بات یہان بھی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے ۔جن کے دماغ تہذیب مغربی کے نور سے روشن ہین وہ ان تعصبات کو جو ترقی قومی کے دشمن ہین ۔ترک کرتے جاتے ہین ۔بعض حامیان و معاونین ذات کا یہ خیال ہے کہ مختلف فرقے جو کہ مختلف ذاتون کی حیثیت مین قائم ہین وہی کام دیتے ہین جو کہ ممالک یورپ مین مختلف اہل پیشہ کی مختلف جماعتین کام دیتی ہین ۔یعنی ایسی جماعتون کے ذریعے سے ایک

ساتھ مل کر کام کرنے کی قابلیّت لوگون مین بڑھتی ہے اور انسانی ہمدردی کو ترقی ہوتی ہے بیشک انگلستان وغیرہ مین ایسی جماعتین ہین - ایک کلب ان مزدورون کا ہے جو کہ کلون مین کام کرتے ہین یا تعلیم یافتہ گروہون کی مختلف سوسائٹیان ہین ہر ایک جماعت کے ممبر اپنے فرقے کے متعلق سوشل اور پولیٹیکل امور کا تصفیہ کرتے ہین - سیکڑون جھگڑے مل جُل کر طے کر لیتے ہین لیکن یہ ان کا خیال ہرگز نہین ہوتا کہ دوسرے فرقے والے کو ذات کی نگاہ سے دیکھین یا اُسکو نقصان پہونچانے کی کوشش کرین - ہندوستان مین معاملہ برعکس ہے - یہان ایک فرقے یا ذات کے مختلف ممبرون مین ہرگز اتفاق نہین ہوتا - ہاتھ کو ہاتھ کھانے کی کوشش کرتا ہے غیر فرقے والے سے تو ہنس کر بات بھی کر لین گے مگر اپنے فرقے والے کو ہمیشہ چرکا دینے کی کوشش مین رہینگے - اس صورت مین ساتھ مل کر کام کرنے کی قابلیت کا پیدا ہونا دشوار کیا ناممکن ہے اور یہ امر موجودہ واقعات سے جو کہ روزمرہ تک کی زندگی مین پیش آتے ہین ثابت ہے - دوسرے یہ کہ ایک فرقہ دوسرے فرقے کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے - کشمیری کایستھون کو " لالہ " سمجھتے ہین - کایستھ کشمیری پیچ سے گھبراتے ہین - بنگالی مرہٹون کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہین - اور مرہٹے بنگالیون کو بلیک سمجھتے ہین - اِس حالت مین انسانی ہمدردی کو ترقی ہونا تو درکنار، حسد و بغض کو البتہ روز افزون ترقی ہوتی جاتی ہے -

بعض حبیبِ وطن فرماتے ہین کہ ذات کے قیود ٹوٹنے سے وہ چند باتین جن سے کہ قومی تخصیص کا اظہار ہوتا ہے مٹ جائین گی - ہم بھی صاحب بہادر بن جائین گے - پھر " ہندوپن " کی کون سی بات باقی رہیگی - مگر مین ان سے پوچھتا ہون کہ ہم مین قومی تخصیص کی کون سی بات باقی

رہ گئی ہے ؟ کیا ہماری موجودہ پوشاک ہماری قومی پوشاک ہے ؟ شیروانی اچکن اور فلٹ کیپ کیا ویدک زمانے کے درزیون کی ایجاد ہے ۔ یا لالہ نوندھرائے کو خدا بخشے اُن کی دستورالصبیان مین ہم کو نعت سرور کائناتؐ اور توصیف پنجتنؑ جو پڑھائی جاتی ہے یہ ہماری قومی تعلیم ہے ۔ یا ہمارے یہان کی سوشل محفلون مین مکلف فرش تقسیم عطر و پان بیت بازی مسلمانی غذا کے ذائقے ۔ ہماری قومی تخصیص کا پتہ دیتے ہین ۔ ہمارا لباس قومی نہین رہا ۔ ہماری زبان مادری زبان نہین رہی ۔ ہمارا طرز معاشرت مشرقی و مغربی قومون کی نقل ہو گیا ہے ۔ اس صورت مین اگر ہم "میان بھائی" نہ رہے اور "صاحب بہادر" بن گئے تو ہماری شان مین کیون کر بٹہ لگ گیا ؟ اور بالفرض اگر ہم مین قومی تخصیص کی کوئی علامت باقی بھی ہے تو کیا وہ اس درجۂ کمال پر پہونچی ہوئی ہے کہ اب اس مین کسی اصلاح کی ضرورت یا گنجائش نہین رہی ۔ خداوند کریم نے جس کو عقل سلیم عطا کی ہے وہ اس اصلاح کی ضرورت کو ضرور تسلیم کرے گا ۔

یہ خیال رہے کہ جن باتون کو ہم قومی تخصیص کی علامت سمجھتے ہین وہ طرفہ معجون ہین ۔ کچھ قدیم ہندوستان کے وحشیون کی یادگارین کچھ مسلمانون کے اثر صحبت کا نتیجہ ہین اور کچھ انگریزی تعلیم سے پیدا ہو گئی ہین ۔

بعض دور اندیش نہایت متانت سے رطب اللسان ہوتے ہین کہ سوسائٹی ابھی ذات کی تفریق دور کرنے کے لئے تیار نہین ہے ۔ جب کوئی نئی روش اختیار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اکثر محبان قوم مختلف پہلوؤن سے اعتراض کرتے ہین ۔ کوئی پابند مذہب پکار اُٹھتا ہے کہ دھرم کی ناؤ بھنور مین آ گئی ۔ کوئی عالم بالتحقیق سائنس کے اصولون پر اپنی دلیل قائم کرتا ہے کہ

کہ اُدھر اُن کی وضع چھوٹی اور اُدھر اعتدال عناصر مین فرق آگیا - اسی طرح سیکڑون ہی خواہ
ملک و قوم ہزارون براہین قاطع پیش کرنے مین تامل نہین کرتے مگر جب دیکھتے ہین کہ لوگون مین ان کے
گڑھے ہوے روحانی مسئلون کے سمجھنے کی قابلیت نہین رہی اور نہ سائنس کے اصول کارگر
ہوے تو پھر یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ تم لوگون مین زمانہ شناسی کی قابلیت نہین ہے - جب کانگرس
قائم ہوئی تو مذہبی اور پولیٹیکل اصولون پر تو اختلاف ہوا ہی مگر یہ بھی ایک بہت بڑا اعتراض
مخالفین کانگرس کا تھا کہ ملک ابھی ایسی کارروائی کے لئے تیار نہین ہے - مگر خیر - تجربے سے
ثابت ہوگیا کہ ملک اینٹی کانگرس کی کارروائی کے لئے تیار نہین تھا - حقیقت یہ ہے کہ جب
اصلاح کی کوشش کی گئی ہے تو اس پر ایسے ہی اعتراضات ہوے ہین - اس لئے جب
تک تجربے سے نہ ثابت ہو جائے کہ فلان شئے قبل از وقت ہے اُس وقت تک ایسی
باتین کرنا جن سے کہ سوائے خیالی اطمینان کے اور کچھ حاصل نہ ہو دانشمندی سے بعید ہے -

اکثر محققین جو کہ اپنے تئین ہندو مذہب کے اصولون سے واقف اور علم طبیعات یا
سائنس مین ماہر سمجھتے ہین فرماتے ہین کہ ذات کے قوانین کے مطابق جو کھانے پینے کی پابندی کی
گئی ہے یہ خاص الخاص سائنس کے اصولون پر مبنی ہے گویا یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ جتنے
علم و فن آج کل اہل مغرب کو معلوم ہین یہ سب قدیم ہندوستان مین موجود تھے اور جتنی آیندہ ترقیان
آیندہ نسلون کی کوشش کا نتیجہ ہونگی وہ بھی پرانے زمانے کے ہندوؤن کو معلوم تھین -
چنانچہ کچھ عرصہ گزرا کہ اہل مغرب نے فن طب مین ایک تحقیقات کی، کہ کل وبائی امراض خاص
قسم کے کیڑون یا (ذرون) کی وجہ سے پیدا ہوتے ہین جو ہوا مین اُڑا کرتے ہین یا پانی مین

پائے جاتے ہین مگر بغیر خوردبین کے نظر نہین آسکتے - لہذا جو شخص وبائی امراض مین مبتلا ہو اس کے ہاتھ کا یا اُس کے ساتھ کھانا نہ کھانا چاہیئے کیونکہ اُس مین اُس قسم کے کیڑے موجود ہوتے ہین اس حالت مین اندیشہ ہے کہ جو اُس کے ساتھ کھائے اُس مین بھی وہ سرایت نہ کر جائین اور وہی مرض پیدا نہ کر دین - گویا ہمارے محققین کے خیال کے موافق اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر قدیم ہندوؤن نے کھانے پینے کی پابندی قائم کی تھی کہ خدا نخواستہ اگر کبھی ہندوستان مین طاعون یا ہیضہ آیا تو اُس وقت ذات کی تفریق کام آئے گی - کیا سائنس کی تحقیقات کے بموجب یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ صرف "کچی رسوئی" مین وبائی امراض کے کیڑے پائے جاتے ہین ؟ کیا پکوان وغیرہ جو کہ مختلف فرقے ہندوؤن کے ایک دوسرے کے ہاتھ کا پکا ہوا کھا سکتے ہین اس بلا سے بری ہین ؟ کیا پانی (جس مین کسی تفریق سے کام نہین لیا جاتا) کے ذریعے سے وبا نہین پھیل سکتی ؟ حالانکہ جہان تک کشمیریون کا تعلق ہے وہ اس اعتراض سے مستثنی ہین یعنی ان کے مختلف "دھڑون" مین پان کیا بلکہ پانی تک کی پابندی لازمی سمجھی جاتی ہے -

قیود ذات کا ایک بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ ہندوستانیون اور انگریزون مین میل جول کو ترقی نہین ہوتی - اس کی وجہ یہ ہے کہ سوشل تعلقات کی ترقی دو اصولون پر مبنی ہے - اوّل یہ کہ انھین دوستون مین سوشل تعلقات قابل اطمینان ہو سکتے ہین جو کہ ہم پیالہ و ہم نوالہ ہون دوسرے یہ کہ عورتین بھی سوسائٹی مین شامل ہون مگر ذات کے قوانین کے مطابق یہ دونو صورتین ناممکن ہین - انگریز ہماری دعوت کرتے ہین مگر ہم کھانے پینے مین شریک نہین ہو سکتے وہ اپنی بیوی یا مان بہنون کی ہماری مستورات سے ملاقات کرانا چاہتے ہین مگر ہمارے یہان کی عورتین

اُن کی سوسائٹی مین شریک نہین ہوسکتین -اِس حالت مین سوشل تعلقات اور میل جول کا بڑھنا دشوار ہے گو یہ ضرور ہے کہ انگریزون کی سرد مہری کا بھی بہت کچھ اس مین حصّہ ہے اس سرد مہری کا نتیجہ ملک کی پولیٹکل حالت کے لحاظ سے جتنا بُرا ہے سب پر روشن ہے مگر اِس کے علاوہ ہمارے سوشل اور اخلاقی حالت پر بھی اس کا بہت خراب اثر پڑتا ہے اس امر سے کسی کو انکار نہین ہو سکتا کہ بحیثیت مجموعی انگریزون کی دماغی اور اخلاقی حالت ہم سے برتر ہے -اور ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کے نیک خصائل کا فائدہ اُٹھائین -یہ اُس حالت مین ممکن ہے جب کہ ہم اُن کی سوسائٹی مین بے تکلفی کے ساتھ شریک ہوسکین - دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر محض سائنس اور حکمت کے اصولون پر یہ خورونوش کی پابندی قائم کی گئی ہے تو اس کا توڑنے والا برادری سے کیون خارج کیا جاتا ہے-

مختلف ذرایع سے جو کہ خورونوش کی پابندی توڑنے سے زیادہ صریحی نقصان پہونچاتے ہین اصول صحت خاک مین ملائے جاتے ہین -تب کوئی خارج کرنے کا نام بھی نہین لیتا- مگر وبائی امراض کا کچھ ایسا دھڑکا بیٹھا ہوا ہے کہ جہان کسی پر کھانے پینے کی قیود توڑنے کا شک ہوا- فوراً ہی تو سوسائٹی کا شیرازہ باندھنے کی فکر پیدا ہو جاتی ہے- اور باوجود اس کے کیا ہندؤن کی صحت اور جسمانی قوت بحیثیت مجموعی اُن قومون سے اچھی ہے جن مین کہ خورو نوش کی پابندی نہین ہے-؟ مثلاً انگریز، مسلمان، پارسی وغیرہ؟ اور اگر ہے؟ تو کیا اس وجہ سے کہ ہندو مذہب کے جامع اصول طب پر مبنی ہین -غرض اسی طرح ذرا سے غور مین ذات کی تمام دلیلین غلط اور بے بنیاد ہو جاتی ہین -اب اس آخری حصّہ مضمون مین ان صریحی نقصانات کی نسبت

بحث کی جائیگی جوکہ ہندو قوم کو ذات کی پابندی سے پہونچے ہین۔

سب سے خراب نتیجہ قوانین ذات کا یہ ہے کہ (جیساکہ پیشتر بیان کیا گیا ہے) یہ سوشل ترقی کے میدان مین سنگ راہ ہوتے ہین۔ شادی صغر سنی، ازدواج بیوگان، سفر ولایت، تعلیم نسوان، قوانین حفظان صحت وغیرہ۔ سب ذات کی پابندی سے مارے ہوئے ہین۔ صغر سنی کی اصلاح یا بیوہ کی شادی کی کوشش خلاف مذہب ہنود سمجھی جاتی ہے۔ اُن کی تلقین جو شخص کرے وہ لامذہب سمجھا جاتا ہے اور خارج ہونے کا مستحق خیال کیا جاتا ہے۔ سفر ولایت تو گویا حرام ہی ہے۔ تعلیم نسوان کیونکر ہو۔ ہندو عورتون کو یہ سخت ناگوار ہوتا ہے کہ انگریزی عورتین اپنے قدمون سے ان کے گھرون کو ناپاک کرین۔ قوانین حفظان صحت کیونکر عمل مین آئین وہ ہندو مذہب کے خلاف ہین۔ اِس صورت سے ہم ان کے نیک خصائل سے فائدہ نہین اُٹھا سکتے ہین۔ شاید کوئی کہے کہ مسلمانون اور ہندوٗون مین ربط وضبط کیونکر بڑھا ان سے بھی تو خور و نوش مین پرہیز رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونون کی طبائع ایشیائی طرز کے واقع ہوئے ہین۔ مسلمانون کے دل و دماغ اُسی سانچے مین ڈھلے تھے جس مین کہ ہندوٗون کے توہمات مین ان کا بھی ویسا ہی عقیدہ تھا جیسا کہ ہمارا۔ لہٰذا ہم ان کے توہمات کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور وہ ہمارے تعصبات کی توقیر کرتے تھے۔ ہمارے بزرگ شہید مردون کو ریوڑیان چڑھاتے تھے۔ لڑکون کو امام حسینؑ کا فقیر بناتے تھے۔ تعزیہ داری کرتے تھے۔ مسلمان ہمارے فقیرون سے منتین مانگتے تھے چیچک جب بچون کے نکلتی تھی ہندو مالیون کی خوشامد کرتے تھے۔ لہٰذا ایک قسم کا سوشل اتحاد دونون قومون مین پیدا ہو گیا تھا۔ علاوہ اس کے عموماً ہندو اس زمانے مین

اپنی خوشی سے مسلمان نہین ہوتے تھے اس لیئے ان کا ظاہری طرز معاشرت بدل جاتا تھا۔لیکن ان کا دلی عقیدہ نہین بدلتا تھا۔ لہذا وہ مسلمان ہوکر بھی بہت سی باتین ہندو مذہب کی پوشیدہ طور سے قائم رکھتے تھے اس کا اثر عام سوسائٹی پر پڑتا تھا اس لیئے دونو مذہبون مین میل جول کی صورت پیدا ہوگئی تھی۔ انگریزون کا معاملہ برعکس ہے وہ ہمارے تعصبات وتوہمات کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہین ہمارے روحانی عقائد کا مضحکہ اُڑاتے ہین جو ہندو عیسائی ہوتے ہین وہ دلی عقیدے سے ہوتے ہین نہ کہ جبراً۔ لہذا انگریزون سے اِس صورت مین میل جول نہین ہوسکتا جب تک کہ دیگر سوشل تعلقات قائم کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ علاوہ برین ذات کی پابندی وہ بلاے بد ہے کہ اس نے مسلمانون سے بھی ایک حد تک نا اتفاقی پیدا کرادی۔ اکثر شیعہ مسلمان ایسے ہین کہ اگر ہندو ان کے فرش پر بیٹھ جائے تو وہ فرش دُھلوا ڈالتے ہین۔ ہندو کے ہاتھ کا پان تک نہین کھاتے۔ ظاہر ہے کہ عرب وعجم کی یہ رسم نہین ہے صرف ان کو یہ خیال ہے کہ اگر ہندو ہم کو ناپاک سمجھتے ہین تو ہم بھی اُن کو ناپاک کیون نہ سمجھین مختصر یہ کہ گو کہ دیگر وجوہ سے ہندو مسلمان ایک دوسرے سے مل چلے تھے مگر ذات کی تفریق سوشل نا اتفاقی کی بنیاد ڈال رہی تھی۔

یہ سب کو ماننا پڑیگا کہ ہندوستان مین اتحاد و یگانگت قومی کی ضرورت ہے اور ایسے اتحاد قائم کرنے کے لئے یہ امر لازمی ہے کہ ایک فرقے کے لوگ دوسرے فرقے مین شادی کرین۔ جب اس قسم کی شادیان ہونگی تو وہ تعصبات دور ہوجائین گے۔ جو کہ مختلف فرقے کے لوگون مین آپس مین موجود ہین یعنی اس قسم کے خیالات کہ فلان فرقہ ذلیل ہے اس کی لڑکی

اپنے خاندان میں لانا باعث توہین ہے۔ سوشل اتحاد میں حارج ہوتے ہیں۔ ایسی رسم ازدواج سے جو محبت و اتحاد کو ترقی ہوتی ہے وہ اس سے معلوم ہو سکتی ہے۔ کہ جس روز سے راجپوت شاہزادیاں اکبری حرم سرا میں داخل ہوئیں اُسی روز سے راجپوت سردار تخت مغلیہ کے جان نثار خادم بن گئے۔ جب ہندو اور مسلمانوں میں ایسے ازدواج کا یہ نتیجہ ہوا تو ہندوؤں کے مختلف فرقوں میں اگر یہ سلسلہ چل نکلے تو ضرور قومی اتفاق کو ترقی ہو گی۔ مگر اس رسم کو بھی اُس وقت فروغ ہو سکتا ہے جب کہ ذات کے قیود توڑے جائیں۔ اس رسم کی عدم موجودگی میں جو نقصانات ہندو سوسائٹی کو پہونچ رہے ہیں وہ قابل غور ہیں۔ اوّل یہ کہ ہندوؤں کی جسمانی اور دماغی ترقی میں بہت کچھ خلل واقع ہے۔ یہ ایک طب کا اصول ہے کہ دو مختلف فرقوں کا خون ملنے سے جسمانی اور دماغی ترقی ہوتی ہے لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے۔ ایک ہی فرقے کے چار ٹکڑے ہو جاتے ہیں کہ جن کے علاوہ شادی کرنا ممنوع خیال کیا جاتا ہے اس کا جو کچھ اثر ہماری جسمانی اور دماغی ترقی پر ہے۔ ظاہر ہے۔ علاوہ اس کے ہمارے سوشل اور اخلاقی حالت بھی اس رسم کی عدم موجودگی کی وجہ سے معرض خطر میں ہے۔ جب تک فرقے میں ہزار شاخیں پیدا ہو گئیں تو یہ لازمی ہے کہ ہر ایک شاخ میں لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد محدود ہو۔ اس حالت میں صغر سنی کی شادی کو فروغ ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ ہر شخص اس فکر میں رہتا ہے کہ اپنی اولاد کے لئے اچھا خاندان سب سے پہلے تجویز کر لے تاکہ دوسرے نہ شکار پھانس لیں۔ لہٰذا آٹھ یا نو برس ہی کی عمر میں جلدی پڑ جاتی ہے کہ کسی طرح لڑکی یا لڑکے کی شادی کا بندوبست ہو جائے۔ اور "قرارداد" کی رسم بھی اسی وجہ سے ترقی پذیر ہے۔ کیونکہ جب لڑکوں کی تعداد محدود ہوئی تو

جہیز کی قیمت بڑھانے کا اختیار لالچی والدین کو حاصل ہے۔ علاوہ اس کے ہندوستان اُسی وقت ترقی کر سکتا ہے کہ کل مختلف فرقے ایک قومی یگانگت کا لباس پہنین۔ مگر یہ آرزو اُسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب کہ ذات کی پابندی نہ رہے۔ مختلف فرقے ایک دوسرے کے خورونوش اور شادی بیاہ مین شریک ہون۔ غرضکہ ذات کی پابندی نے ہماری حالت بدتر کر رکھی ہے ہزارون سوشل اور پولیٹکل اخلاقی جسمانی دماغی خرابیون کی یہی باعث ہے۔

آخر مین اِس مسئلے کے مذہبی پہلو پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ ہندوستان مین اُنیسوین صدی مین چار ایسے شخص پیدا ہوے جن کی رائے ہر شخص کو قابل وقعت ماننا پڑے گی یعنی راجہ رام موہن رائے۔ سوامی دیانند سرسوتی کیشب چندر سین۔ مسٹر راناڈے۔ ان چارون رفارمرون مین ہندو مذہب کے دیگر اصولون پر کچھ بھی اختلاف کیون نہ ہو مگر اس ایک بات پر یہ سب متفق اللفظ اور متحد الکلمہ تھے کہ مذہبًا بھی ہندوؤن کے لئے ذات کی پابندی ضروری نہین ہے ان مین سے ہر ایک نے ویدون کے ذریعے سے ثابت کر دیا کہ قدیم ہندوون مین ذات کی پابندی اِس بیہودہ طور سے لازمی نہین سمجھی جاتی تھی اگر شودر ترقی کرتا تھا تو وہ برہمن کے درجے تک پہونچ سکتا تھا۔ لاہور مین اپنے آخری ایڈرس مین مسٹر راناڈے نے صاف طور سے مذہبی و تاریخی دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ قدیم ہندؤن مین ذات کے قوانین ایسے احمقانہ طرز کے نہ تھے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ لوگ اُنیسوین صدی مین پیدا ہوے لہذا ان کی بات قابل اعتبار نہین ہے۔ تو ان کے لئے چیتن نانک کبیر وغیرہ کی مثالین موجود ہین۔ ان مذہبی رفارمرون نے صاف طور سے ذات کے

قیود کی مخالفت کی ہے - اگر متاخرالذکر رفارمرون پر بھی اعتبار نہ ہو تو گوتم بدھ کی مثال موجود ہے - اُنھون نے ذات کے قیود توڑ کر دکھا دیئے - یہان پر مسز بیسنٹ کی رائے پیش کرنا غیر مناسب نہین ہے کیونکہ مسز موصوف دقیانوسی خیالات کے ہندوون کی رہنما ہین چند سال ہوئے بنارس مین اُنھون نے جو ذات کی پابندی کی نسبت تقریر کی تھی اِس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ذات کی موجودہ حالت سے وہ بھی سخت بیزار ہین۔ اُن کے لکچر کے چند فقرون کا لفظی ترجمہ درج ذیل ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذات کی بالفعل جو حالت ہے اس کی نسبت ان کا کیا خیال ہے - آپ فرماتی ہین کہ "موجودہ حالت ذات کے قیود کی افسوسناک اور شرمناک ہے - پُرانے زمانے مین جس کی جتنی زیادہ اونچی ذات تھی اُسی قدر اُس کے زیادہ فرائض تھے - مگر اب معاملہ برعکس ہے - اب ذات کی برتری چند حقوق سے تعلق رکھتی ہے نہ کہ فرائض سے - (صفحہ لکچر ۷۹) پرانے زمانے مین برہمن کا فرض تھا کہ غریب ہو اور عالم ہو - اب برہمن کا فرض ہے کہ امیر ہو اور جاہل ہو" (صفحہ ۸۶) پُرانے زمانے مین اگر کوئی اپنا دھرم نہین رکھتا تھا تو وہ خارج کیا جاتا تھا - مثلاً برہمن کا یہ فرض ہے کہ وہ اخلاق کا مجموعہ ہو اور پاک زندگی بسر کرے - اس پر اگر اس کی اخلاقی حالت مین فرق آتا تھا وہ خارج کیا جاتا تھا - (صفحہ ۸۲) اب اگر کوئی خارج کیا جاتا ہے تو بہت کچھ وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ جو لوگ اس کو خارج کرتے ہین ان کو اس سے باطنی تعصب ہوتا ہے یا ذاتی ناراضگی ہوتی ہے اور جو لوگ خارج کرتے ہین وہ ظاہراً مذہبی بناوٹ سے ظاہری عزت حاصل کر لیتے ہین نہ کہ زندگی کی پاکیزگی سے

اور علم سے اور چال چلن کی خوبی سے۔ تم خوب جانتے ہو کہ اگر کوئی شخص ذات کی حدود میں رہ کر اخلاق کے ہر ایک اصول کو خاک میں ملادے تو اُن کو کوئی شخص خارج نہ کرے گا۔ اپنی اصلی زندگی میں وہ ذات کے کل قوانین توڑے لیکن اگر وہ ظاہر اپنا ڈھٹ بنائے جاتا ہے تو خارج نہیں کیا جاتا وہ ہوٹل میں جائے گا گوشت کھائے شراب پیئے۔ مگر اس شرط سے کہ وہ ہوٹل کے پچھلے دروازے سے جائے نہ کہ اگلے دروازے سے۔ تو اُس کی ذات والے اپنی آنکھوں پر پٹیاں باندھ لیں گے اور اس کو خارج نہ کریں گے۔

مگر ہان کوئی ولایت کا سفر کرے اور کتنا ہی تعلیم یافتہ کیوں نہو۔ اس کی زندگی کتنی ہی پاکیزہ کیوں، وہ اپنی قوم کو کتنا ہی فائدہ پہونچانے کے قابل کیوں نہو مگر اس بنا پر خارج کیا جاتا ہے کہ اُس نے ولایت کا سفر کیا ہے (صفحہ ۹۳) کوئی اصول نہیں جس پر کہ اخراج عمل میں لایا جاتا ہے۔ مثلاً فوج میں ہر سال برہمن نوکر رکھے جاتے ہیں اور ان سے قسم لی جاتی ہے کہ باہر سفر کرنے کے لئے تیار رہیں اور وہ باہر سفر کر کے ہندوستان میں آتے ہیں لیکن ان کو کوئی نہیں خارج کرتا۔ ہان اگر کوئی سولین ہونے کے لئے ولایت جائے تو وہ ضرور خارج کیا جاتا ہے (صفحہ ۵۵) اخلاقی جعلسازی سے ذات کے قیود قائم رکھنے میں کام لیا جاتا ہے۔ مین نے سُنا ہے لوگ کہتے ہین کہ ہم ولایت گئے اور ہم نے واپسی پر پانچ روپیہ دے کر پرایشچت کر لی۔ یہ پرایشچت نہیں ہے یہ توہین ہے۔ ہندو مذہب کی اور ذلت ہے ان کے لئے جو اس میں حصہ لیتے ہین۔ ایسے شخص کو اس لئے نہیں خارج

کرنا چاہئیے کہ اُس نے سفر ولایت کیا بلکہ اس لئے کہ اس نے پرایسچت کے اصول کو خاک مین ملایا ہے اور اخلاقی جلسازی سے کام لیا ہے (صفحہ ۱۰۱) یہ الفاظ کسی تعلیم یا فتہ لامذہب نوجوان کے نہین ہین - یہ اُس باہمت خاتون کے الفاظ ہین جس نے ہندو مذہب دہریہ مذہب چھوڑ کر اختیار کیا ہے جو کہ ہندو مذہب کے لئے جان دینے کو تیار ہے جس کا جوش محبّت ہندو مذہب کے لئے درجۂ اعتدال سے گزر گیا ہے جس کو ہندو مذہب کے بے بنیاد تعصبات اور توہمات مین بھی روحانی اصولون کی جھلک نظر آتی ہے - مگر ذات کے قوانین ایسے شرمناک حالت مین ہین کہ مسز بیسنٹ ایسے ہندو مذہب کی طرفدار سے بھی خاموش نہ رہا گیا اور نہایت سخت الفاظ مین مذکورالصدر خرابیان بیان کین - اگر کوئی نوجوان یہی باتین کہتا تو وہ ملحد کے نام سے یاد کیا جاتا - افسوس تو یہ ہے کہ یہ کوئی نہین دیکھتا کہ نوجوان جو نفرت کرتے ہین تو اس لامذہبی سے جس کو کہ ہزارون لاکھون ہندو اپنا مذہب سمجھے ہوے ہین - اصل مذہب سے تو کئی سو برس ہوے جب ہم ہاتھ دھوئے بیٹھے تھے - اب بیسوین صدی کے آغاز مین اِس کے تازہ کرنے کی کوشش بیکار ہے - ؎

عمر ساری تو کٹی عشق بتان مین مومن　　　آخری وقت مین کیا خاک مسلمان ہونگے

اب صرف لامذہبی رہ گئی جو کہ ہندوون کا مذہب ہے اور جس کی آڑ مین سیکڑون اخلاقی جرائم کئے جاتے ہین اِس مذہب کی آڑ مین عورتین جبرًا اپنے خاوندون کی لاش کے ساتھ زندہ جلا دی جاتی تھین - اسی مذہب کی آڑ مین معصوم بچے گنگا مین بہائے جاتے تھے -

اسی مذہب کی آڑمین سیکڑون نوعمر لڑکیان اب تک جنوبی ہندوستان کے مندرون مین طوائفون کی شرمناک زندگی بسر کرتی ہین - اسی مذہب کی آڑمین ذات کے قوانین قائم کئے جاتے ہین اور اخراج مین اخلاقی جعلسازی سے کام لیا جاتا ہے - نوجوان ان ذلتون کو نہین برداشت کر سکتے اُن کو انگریزی تعلیم سے معلوم ہو گیا ہے کہ اصل ہندو مذہب کیا تھا اور اب کیا ہو گیا - وہ اس مذہب کے خلاف ہو سکتے ہین مگر اس سے نفرت نہین کر سکتے - خیر اب آثار زمانہ بتلا رہے ہین کہ لوگون کے خیالات مین تغیر شروع ہو گیا ہے - جو پُرانے خیالات کے ہندو ہین وہ چاہے اس امر پر راضی نہ ہون کہ ذات بالکل نیست و نابود کر دی جائے مگر اتنا سمجھ گئے ہین کہ ذات کے قوانین مین سخت ضرورت اصلاح کی ہے جس کی تائید کہ مسز بیسنٹ کے بیان سے ہوتی ہے - بہرحال مسز بیسنٹ بھی یہ مانتی ہین کہ چار ذاتون کے علاوہ جتنے فرقے پیدا ہو گئے ہین مذہباً ناجائز ہین - جیسا کہ اُن کے بنارس کے لکچر سے ظاہر ہے - شکر ہے کہ ذات کی پابندی کا سودا لوگون کے سر مین اب زور و شور سے باقی نہین رہا جیسا کہ پیشتر تھا - نئی روشنی والون کی نگاہون مین مذہباً اُسکی کوئی وقعت باقی نہین رہی ہے اور رفتہ رفتہ جمہوری اصولون کی ترقی کے ساتھ اس کی اخلاقی برتری کا خیال بھی جو لوگون کے دلون مین اب تک جاگزین ہے بالکل نیست و نابود ہو جائے گا - جس وقت کہ لوگ پولٹیکل امور مین ہمسری کا دعویٰ کرین گے اُس وقت سوشل معاملات مین وہ ذات کے قیود کے موافق ایک دوسرے سے ہرگز ہرگز دب کر نہین رہ سکتے - اور دماغی تربیت حاصل کرنے کے طریقے جو بالفعل

موجودہ سررشتہ تعلیم مین جاری ہین کبھی ذات کا فرق قائم نہین رکھ سکتے۔ کیونکہ جو شخص اعلیٰ تعلیم حاصل کرے گا اور اعلیٰ دماغی قابلیت کے زیور سے مزین ہوگا اُس کا وقار کسی حالت مین اُس سے اونچی ذات والے سے کم نہین ہو سکتا۔ جو کہ اتنا ہی لائق ہے۔ اور اس مین شک نہین کہ یہی ایسا طریقہ ہے جس سے ذات کی پابندی کی قسمت کا بہت جلد فیصلہ ہو جائے گا۔

لیکن باین ہمہ ذات کی تفریق کے مٹنے سے ایک سوشل اور اخلاقی تہلکہ مچ جائے گا کیونکہ انقلاب کا زمانہ ہمیشہ شورش و فساد کا ہوا کرتا ہے۔ بہت سی باتین ایسی پیش آتی ہین جو کہ طبائع کو جوش مین لاتی ہین۔ نوجوان کو ناتجربہ کاری جوش دلاتی ہے اصل اصول اصلاح اور سوسائٹی کی بہتری کا خیال دل سے بھلا کر ذاتی نخوت کا رنگ چوکھا کر دیتی ہے۔ یہی باتین اس انقلاب مین جس کی کہ بنیاد پڑ گئی ہے پیش آنی لازمی ہین اور کچھ کچھ اپنا رنگ دکھا رہی ہین۔ مگر یہ اخلاقی سراسیمگی عارضی ہوگی۔ اس کے بعد کوئی ایسا طریقہ وجود مین آئے گا جو موجودہ وقت کی ضرورتون کے لحاظ سے مناسب ہوگا اور امن و امان کی خبر دے گا۔

"کتبہ علی حسین۔ چکمنڈی۔ لکھنؤ۔"

CALL No. ٨٩١٤٩٣٥
ACC. No. ٣٣٧٦٣
AUTHOR چکبست برج نرائن
مضامین چکبست

Date | No. | Date | No.
7.5.11.89.

AT THE TIME

MAULANA AZAD LIBRARY
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

RULES:—
1. The book must be returned on the date stamped above.
2. A fine of Re. 1-00 per volume per day shall be charged for text-books and 10 Paise per volume per day for general books kept over-due.

U RESERVED BOOK